

جامع و مانع کتاب

تقابل ادیان و مذاہب

www.KitaboSunnat.com

ہندو ازم، بُدھ ازم، زرتشت ازم، کنفیوش ازم،
یہودیت، عیسائیت اور اسلام پر غیر جانبدارانہ اور منصفانہ
تقابل کی گفتگو

پروفیسر میاں منظور احمد

علی بک ہاؤس
چوک اردو بازار: لاہور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب

← عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

← مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload)

کی جاتی ہیں۔

← دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

← کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

← ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

← نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

سید کا مکتبہ
2018

جامع و مانع کتاب



تقابل ادیان و مذہب

ہندو ازم، جڈہ ازم، زرتشت ازم، کھنوش ازم، یہودیت

عیسائیت اور اسلام پر بغیر جانبدارانہ اور منصفانہ

تقابل گفتگو) www.KitaboSunnat.com

مؤلف

پروفیسر میاں منظور احمد؛ اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

علی بک ہاؤس

چوک اردو بازار لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر _____ محمد سعید اقبال
_____ علی بک ہاؤس

ایڈیشن _____ 2004

قیمت : _____ 30/-

منظور پر نٹنگ پریس لاہور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش کش

ادیان و مذاہب کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ اس سے ہمیں بڑی عبرتیں حاصل ہوتی ہیں، انسانی فطرت و نفسیات کی گہرائیوں کا کچھ حصہ کھلتا ہے اور دنیا کے عظیم انسانوں سے کتابی ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ زندگی کے دوسرے معاملات کی طرح عقائد و ایمانیات اور اعمال و رسوم بھی مختلف اہل مذاہب کے میل ملاپ سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس طرح مشرق کی جینوں مغرب میں اور مغرب کی مشرق میں جا پہنچتی ہیں۔ دنیا کے مختلف ادیان و مذاہب کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے نئی چیز نہیں ہے۔ ہمیں قرآن میں اس موضوع پر کافی مواد ملتا ہے۔ مشرکوں دہریوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے عقائد و اعمال اور اخلاق و کرمات اس کتاب عزیز میں جگہ جگہ ذکر موجود ہے۔ مخالفین اسلام کے اعتراضات اور شکوک و شبہات کا رد کیا گیا ہے۔

سابقہ انبیاء اور ان کی امتوں پر جا بجا تبصرے پائے جاتے ہیں۔ دین حق کی خاطر حق پرستوں نے کیا کیا تکالیف اٹھائیں؟ اسلام کا راستہ روکنے کے لئے کون کون سے ہتھکنڈے اختیار کئے گئے؟ اہل ایمان نے کس مہر و ثبات اور جان بازی و جان سپردگی کے مظاہرے کئے؟ قرآن نے ان سب مضامین کو کہیں تفصیل سے اور کہیں مجمل طور پر بیان کیا ہے۔ مقصد ان تمام واقعات کے بیان سے ہدایت و عبرت ہے۔

اسلام کو شروع سے ہی جن خطرناک حالات میں سے گزرنا پڑا اور ذرا آگے چل کر باطل جس طرح مختلف جھیس بدل بدل کر اس پر حملہ آور ہوا وہ بھی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ دین کا دفاع کرنے والوں نے ابتدا سے ہی جو کام کیے اور اب تک کئے جا رہے ہیں وہ بھی سب پر روشن ہے۔ دینی علوم کے مطالعہ میں جن لوگوں نے زندگی کا کچھ وقت گزارا ہے وہ جانتے ہیں کہ بے شمار اندرونی و بیرونی فتنے ہمیشہ مسلمانوں کو گھیرے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کے لئے جوئے اس آخری دین کی حفاظت کا خود ذمہ لے رکھا ہے۔ ہرگز وہ نہیں ایسے اسباب مہیا ہو جائے رہے کہ دین ہر آزمائش سے سرخرو ہو کر کامیاب نکلا۔ غرض اس داستان سرا کی یہ ہے کہ مختلف ادیان و مذاہب کا مطالعہ تو پہلے ہی رہا کرتا تھا۔ مگر ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا جس کے باعث اس سال ۱۹۸۱ء میں مجھے یونیورسٹی میں تقابل ادیان کا پرچہ بھی اپنے عزیز طلبہ و طالبات کو پڑھانا پڑا۔

ہو یا کہ ہمارے شعبہ میں جو استاد تقابلِ ادیان کا پرچہ پڑھاتے تھے وہ مزید تعلیم و تحقیق کے سلسلے میں ملک سے باہر چلے گئے اور یہ پرچہ — میرے اپنے مضمون حدیث کے علاوہ — میرے ذمہ کر دیا گیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اتنا اہم مضمون ہو اور اس کے لئے بازار میں کوئی مناسب کتاب نہ مل سکے! مجھے بیکچرز کی تیاری کے سلسلے میں اذیتوں بعض وہ کتابیں دیکھنی پڑیں جن کا مطالعہ کئے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ میں نے محض بیکچر دینے کی بجائے تعلیم کا ایک اچھوتا طریقہ اختیار کیا۔ اصل بیکچر سے قبل تختہ سیاہ پر اس کا خلاصہ اشارات کی شکل میں لکھ دیا جاتا۔ پھر اسی کی تشریح و تفصیل بیان کی جاتی۔ کچھ وقت کے بعد میں نے اس میں ایک اور اضافہ کیا۔ وہ یہ کہ گزشتہ بیکچرز کے جامع نوٹ مختصر صورت میں لکھ کر طلبہ و طالبات میں تقسیم کرنا شروع کئے۔ اس سے انہیں بہت فائدہ پہنچتا۔ نہ صرف گزشتہ اسباق کا اعادہ ہو جاتا بلکہ امتحان کے لئے یادداشتیں تیار ہوتی رہیں اس ”مختصر کتابچے“ کا شانِ نزول یہی قصہ ہے۔

اب اصل یادداشت میں کچھ ترمیم و اضافہ کر کے اسے طبع کرانے کے لئے تیار کر لیا گیا ہے۔ مارکیٹ میں جو کتابیں اس موضوع پر موجود ہیں وہ کتابی ترتیب و ربط سے کافی حد تک محروم ہیں۔ جو کتابیں اس سے پہلے چھپ کر نایاب یا کمیاب ہو چکی ہیں ان سے بھی طلبہ استفادہ نہیں کر پاتے۔ اس موضوع پر اصل مواد عربی میں ہے یا انگریزی میں، اور وہ بھی انشائیہ نگار یا قسم کی کتب میں ہے۔ ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جو حجم اور قیمت دونوں لحاظ سے عام طلبہ کی گرفت میں آ سکے۔ اگر اس کتاب کا کوئی اور ایڈیشن شائع ہونے کی نوبت آئی تو انشاء اللہ تعالیٰ اس میں مزید تھک و اضافہ کیا جائے گا۔ اس میں بعض چیزیں مجھے تصنیفی اعتبار سے کھٹکتی ہیں۔ یہ نقص انشاء اللہ دور کرنے کی سعی کی جائے گی۔

اس کتابچے کی ترتیب میں جو مواد میرے پیش نظر رہا ہے اس کا بیان مختصر اے:

۱۔ الفصل فی المِللِ وَالْاٰهْوَاِیَ وَالنَّحْلِ ۱۔ امام ابن خرم ظاہری

۲۔ الْمِللُ وَالنَّحْلُ ۲۔ علامہ ابو الفتح عبد الکریم شہرستانی

۳۔ الجواب الکصیح لمن دین المیسع ۳۔ امام ابن قیمیہ

۴۔ مقدمۃ ابن خلدون

۵۔ کتاب مقدس و بائبل نیا اور پرانا عہد نامہ

۶۔ فخر الاسلام، معنی الاسلام، نظم الاسلام — احمد امین المصری

- ۷۔ مہودیت و نصرانیت ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی
- ۸۔ اظہار الحق (اردو ترجمہ) مولانا رحمۃ اللہ مہاجر کی
- ۹۔ مقدمہ اظہار الحق اردو از مولانا محمد تقی عثمانی جج وفاقی شرعی عدالت پاکستان
- ۱۰۔ اسلام اور مذاہب عالم ۔ مظہر الدین صدیقی
- ۱۱۔ اسلام اور مذاہب عالم ۔ احمد عبد اللہ مسدوسی
- ۱۲۔ نگار پاکستان خدا مبر ۔ نیاز فتح پوری
- ۱۳۔ مقالات علوم اسلامیہ ۔ میاں منظور احمد
- ۱۴۔ تاریخ دعوت و عزیمت ۔ سید ابوالحسن علی ندوی
- ۱۵۔ تجدید و احیائے دین ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی

میاں منظور احمد

ایسوسی ایٹ پروفیسر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقابل ادیان

ادیان کا لفظ دین کی جمع ہے۔ دین و مذہب کے الفاظ عام طور پر ایک ہی معنی میں بولے جاتے ہیں۔ انگریزی زبان کا لفظ RELIGION ان دونوں کو حاوی خیال کیا جاتا ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے یہ تعبیر غلط ہے۔ ہمارے نزدیک دین سے مراد ہے نظام حیات اور مذہب کا لفظ ان نظریات حیات پر بولا جائے گا جو دین و دنیا کی تفریق پر مبنی ہیں۔ ان نظریات کی رو سے مذہب، عقیدہ، عبادت، اخلاقی نظریات وغیرہ انسان کا ذاتی PRIVATE معاملہ ہے۔ سیاست، معاشرت اور معیشت کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب اور دین کے دائرہ ہائے کار الگ الگ ہیں۔ مذہب چند عقائد و اعمال، عباداتی رسوم اور اخلاقی ضوابط کا نام ہے۔ اور بس۔

اسلامی نقطہ نگاہ کے مطابق دین ہماری پوری زندگی پر محیط ہے۔ اسے اس لئے بھیجا گیا تھا تاکہ لوگ دنیا میں اس پر عمل پیرا ہو کر بہتر اور پاکیزہ زندگی گزاریں۔ اللہ کے قنا نبی اور رسول دین اسلام کے داعی تھے۔ اسلام کی آخری، کامل و غیر متبدل صورت وہ ہے جسے آخری رسول محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔

تقابل ادیان سے یہ مراد ہے کہ دنیا کے مختلف مشہور مذاہب و ادیان کا غیر جانبدارانہ مقابلہ، ان کے اصول و عقائد اور عبادات و رسوم کا غیر متعصبانہ مطالعہ، تاکہ ہر ایک کی قدر و قیمت اور اس کے مسائل کا حسن و قبح معلوم کیا جاسکے۔ اگر کسی دین و مذہب میں کوئی خوبی ہے تو اس کا کھلا اعتراف کیا جائے۔ اگر کوئی نقص ہے تو اس کا مدلل رد کیا جائے۔ اسلام کی عقلی و نقلی فضیلت و دلائل سے ثابت کی جائے تاکہ نئی نسلیں اور پڑھے لکھے ذہن اس پر شعوری ایمان لائیں اور ان کی زندگیوں میں مطلوب تبدیلی واقع ہو۔

مذاہب کی تقسیم بحث کے وقت ہم دین اور مذہب کے لفظ کو بالعموم ایک ہی معنی میں بولیں گے۔ جہاں ضرورت پڑے گی ان کا اصطلاحی فرق و امتیاز بھی بیان کیا جائے گا۔ دین کی مذہبی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ادیان و مذاہب دو بڑی جموں میں بانٹے جاسکتے ہیں۔ ۱۔ آسمانی مذاہب ج۔ غیر آسمانی مذاہب۔

پہلی قسم سے مراد وہ ادیان ہیں جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ مثلاً، یہودیت، عیسائیت اور اسلام۔ دوسری قسم ان مذاہب کی ہے جن کی آسمانی حیثیت مشکوک یا غیر ثابت شدہ ہے مثلاً ہندو مذہب، بدھ مذہب، زرتشتیت اور کنفیوشسزم۔

مذہب کی ضرورت | اس ضمن میں اولین بحث یہ ہے کہ آیا دین و مذہب ضروری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں! ضروری ہے۔ اس کی ضرورت کو تاریخ، عقل اور نقلی دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کی ہر قوم و ملت کسی نہ کسی قاعدے، ضابطے اور نظم حیات کی پابند رہی ہے۔ مذہب کے بغیر زندگی میں نظم و ضبط اور ترتیب پیدا نہیں ہوتی۔ وحشی اقوام و قبائل بھی کسی نہ کسی صحیح یا غلط سلطو دین و مذہب کو ماننے لگے ہیں۔ مذہب کے بغیر انسان کی ذہنی، قلبی اور روحانی پیاس نہیں بجھ سکتی۔

دین و مذہب کے متعلق دو نظریات

ڈارون کا نظریہ ارتقاء اب ایک بھولا بسرا فلسفہ بن چکا ہے۔ اسلام نے انسان اور دین و مذہب کی ابتداء کا جو نظریہ پیش کیا ہے اب اسے قبول عام کی سند حاصل ہو رہی ہے۔ اس کی دوسری مذہب یا عقیدہ یا عبادت جنگلی، پہاڑی یا غاروں میں رہنے والے ننگ و صحرانگ انسانوں کے جذبات، خوف و مسرت کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان (آدم) کو اپنے نائب کے طور پر پیدا کیا۔ اس پر وحی نازل کی۔ اس کو رہنے پہنچے، کپڑے بنانے اور پہننے، تمدنی زندگی بسر کرنے، اناج اُگانے اور تمام ضروریات زندگی کو حاصل کرنے کا علم بخشا۔

اس نظریے کی رو سے توحید کا عقیدہ مذہب کی بنیاد و مہر تاج ہے۔ شرک اس وقت پیدا ہوا جب انسانی آبادی دنیا میں پھیل گئی۔ انسانی ضروریات بڑھ گئیں، آب و ہوا اور علاقوں کے اختلاف نے نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے اور نبیوں کی تعلیم و مصلحتی پروگئی۔ شرک کا رد کرنے اور صحیح دین سکھانے کے لئے ہر زمانے اور ہر قوم میں رسول بھیجے گئے، مگر دین و مذہب کے بارے میں انسانوں کو مجبور نہیں کیا گیا۔ اور یہ معاملہ ان کے حسن انتخاب پر چھوڑ دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دین حق۔

اسلام کے علاوہ اور کئی مذاہب و مذاہب وجود میں آ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی کتب میں انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے آدیں۔ آخری کامل و عالمگیر کتاب قرآن ہے جو آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آتری، وہ قریب چھ ہزار برس سے پوری طرح محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ اس میں زندگی کے تمام شعبوں اور پہلوؤں کے لئے ہدایات موجود ہیں۔ یہی باعث ہے کہ اسلام خدا کا آخری و آفاقی دین ہے۔

مذہب کا ایک نظریہ تو وہ ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا۔ اسے ہم دین و مذہب کا اسلامی و الہامی نظریہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر ایک دوسرا نظریہ بھی ہے جسے آزاد خیال اور باب تحقیق کا یا الفاظ دیگر زمانہ حال کے بعض مغربی مفکرین کا نظریہ کہنا موزوں ہوگا۔ اسے مذہب کا ارتقائی نظریہ بھی کہتے ہیں۔ جدید ماہرین کو چونکہ ہر چیز میں ارتقاء کی کار فرمائی نظر آتی ہے لہذا انہوں نے یہ تصور بڑی شد و مد سے پیش کیا، لیکن افسوس ہے کہ تحقیق و تفتیش کے بعض دوسرے میدانوں — مثلاً تاریخ و جغرافیہ — کی مانند ان اہل تحقیق کو یہاں بھی محض اندازوں اور تخمینوں سے کام لینا پڑا۔ اندازے صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ لیکن مخالفین مذہب اور ارباب الحاد نے اس نظریے کو چونکہ بڑا اچھا لائے اس لئے اس پر مختصر گفتگو کی ضرورت پیش آئی۔ اس نظریے کی رُو سے انسانی مذہبی ارتقاء کی کڑیاں حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ (پہلی انی منزم) PRE ANIMISM (۲) انی منزم ANIMISM
- (۳) ٹوٹائزم TOTANISM (۴) اجداد پرستی۔ (۵) فرضی دیوتاؤں کی پرستش۔ ۶۔ توحید الہی کا تصور اپنی مختلف منزلوں اور صورتوں سمیت۔

نمبر ایک سے مراد ہے مظاہر پرستی سے پہلے کا دور لا مذہبیت، **نمبر دو** سے مراد مظاہر پرستی ہے۔ **نمبر تین** جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ بعض جانوروں کے تقدس کا عقیدہ اور ان کی پرستش کا نام ہے۔ **نمبر چار** سے مراد بزرگان سلف کی روجوں کے خوف یا شدت محبت کے باعث ان کے لئے مراسم عبادت ادا کرنے کا نام ہے۔ **نمبر پانچ** سے مراد یہ ہے کہ مشرکوں کی عجایب پسند طبیعتوں نے فرضی دیوی دیوتا ایجاد کر کے ان کی پوجا شروع کر دی تھی۔ **نمبر ۶** اس سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ مگر بعض ماہرین کا اصرار ہے کہ اس کے بعد الحاد و کفر کا دور آتا ہے۔ جس میں خدا وغیرہ کے نظریات کو دھوکہ سلاتا یا جاتا ہے۔ گویا انسان پھر اسی دور لا مذہبیت کی طرف لوٹ جاتا ہے جہاں سے ہزار ہا برس

پہلے اس کا ارتقائی سفر شروع ہوا تھا۔

اب ہم ان چیزوں پر ذرا تفصیلی بات کریں گے۔ اس نظریے کی رُو سے ابتدائی انسان کو مذہب اور مراسم عبادت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے سوا اس کے سامنے اور کوئی مقصد نہ تھا۔ آہستہ آہستہ انسان کو نباتات، حیوانات، زمین، پہاڑ، برق و رعد، آندھی اور طوفان، سمندر اور دریا، آگ اور پانی، پرند و چرند اور درندے، ان سب چیزوں سے واسطہ پڑا۔ وہ ان چیزوں کے نفع و ضرر سے آشنا ہوا۔ بجلی کو ندی تودہ ڈر گیا، رعد کی گرج سے اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کے لئے پہاڑوں کی بلندی، آسمان کی رفعت، سورج کی روشنی اور تباہت، چاند کی مٹھنڈی مٹھنڈی چاندنی، ستاروں کی چمک، آگ کی گرمی اور اس کا نفع و ضرر، یہ سب کچھ ناقابلِ فہم تھا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر سہما جاتا تھا۔ پھر موسموں کے تغیر و تبدل، گرمی اور سردی، بارش اور ٹھنڈی گئی اسے اور بھی حیرت زدہ کیا۔ اسی اثناء میں اس کے عزیز و اقارب پر موت طاری ہونے لگی۔ لوگ وقفے وقفے سے مرنے لگے۔ انسان یہ سوچنے لگا کہ موت کیا چیز ہے؟ حیات کی کیا حقیقت ہے؟ جب اُس کی سمجھ میں یہ سب کچھ نہ آیا تو اس نے سوچا کہ شاید مرنے والوں کو موت کے بعد کسی اور جہان میں متاعِ حیات اور تزیین و آرائش کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ یہ سمجھ کر لوگوں نے مُردوں کے ساتھ اُن کی زندگی کی ضروریات کو بھی دفن کرنا شروع کر دیا۔ اس نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ مُردوں کی چیزوں کو اگر ہم نے استعمال کیا تو وہ شاید ناراض ہو کر ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔ پر خوف اور رشتہ داروں کی محبت اسلاف و اجداد پرستی کا سبب بنی اور انسان نے بزرگوں، بادشاہوں اور سرداروں کے لئے رسومِ عبادت اور انہیں خوش رکھنے کے لئے خود ساختہ مراسم کی پابندی شروع کر دی۔ یہاں پہنچ کر انسان نے سوچا کہ رُوح صرف ان کے بزرگوں میں ہی نہیں بقی بلکہ تمام مظاہرِ فطرت میں کسی نہ کسی درجے میں رُوح موجود ہے۔ اس فیصلے پر پہنچے بغیر وہ آسمانوں کی بلندی، سورج کی تمازت، ہوا کی تیزی، سمندر کے تلاطم، چاند ستاروں کی چمک، درختوں کی بلندی اور ثمرداری، زمین کی قوتِ نمو کی کوئی تعبیر نہ کر سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان نے پہلے مادرِ زمین کی پرستش شروع کی کیونکہ وہ ہمارے لئے ہر قسم کی سبزی و ترکاری اور پھل پھول کا انتظام کر کے ہماری زندگی کے قیام کا باعث ہے۔ اس کے بعد

مادرِ زمین کے مقابلے میں آسمانی باپ کا تصور ابھرا اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، آگ، پانی، مٹی، ہوا، انسان کے مردانہ و زنانہ اعضائے جنسی کو معبود بنایا گیا۔ سورج دیوتا کو بہت سی مشرک قوموں کا معبود رہا ہے۔ اور اب بھی ہے۔ ہندوستان میں سورج دیوتا، مصر میں ہورس، آشوریوں کا آشور، ایرانیوں کا ہمدیا خوریہ سب سورج دیوتا کے ہی نام تھے۔ ستارہ پرستی نے علم نجوم کی بنیاد ڈالی اور کائنات کے الٹ پھیر کو سیاروں کی گردش سے منسوب کرنے لگے۔ قسمت کو لوگ آج بھی ستارہ کہتے ہیں۔ مختلف اقوام نے پہاڑوں کو بھی پوجا ہے اور ان کی تقدیس کا راگ الاپا ہے۔

آگ کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ نامعلوم دور سے آتش پرستوں کا معبود رہی ہے، اور آج بھی ہے، ہندوستان میں دیگر دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ اگنی دیوتا بھی دیوتا کا معبود ہے۔ پانی کی پوجا کا تصور بھی قدیم ہے۔ مصر میں دریائے نیل کی پوجا ہوتی تھی۔ ہندوستان میں گنگا جمنی کی پوجا ہوتی ہے۔ اور دریائے سرستوتی کی دیوی کا نام ہی سرستوتی دیوی ہے۔ جو آرٹ کی سرپرست مہرانی گئی ہے۔ جوا کو دیدوں میں دایو دیوتا کا لقب دیا گیا اور ہندوؤں نے اس کی پوجا کی ہے۔ انسان کے جنسی اعضاء کی بھی پوجا کی گئی۔ ہندوؤں میں شونگ کی پرستش مشہور و معروف ہے۔ ہندوستان کے علاوہ مصر و عراق اور روم، دیونان بھی اس پوجا کے مرکز رہے ہیں۔ انسان نے بعض جانوروں کو بھی پوجا ہے مثلاً یونان میں سانڈ، ایران میں گھوڑے، مصر ہندوستان وغیرہ میں گائے بیل کو مقدس بلکہ معبود مانا گیا ہے۔ ہندوؤں نے تو ہر جانور کی پوجا کی ہے۔ حشرات الارض، بچھو، سانپ، نیولا، درندے، کھجورے، دھنوب کے کچھ اوتار، کنیش (ہاتھی) سب حیوان پرستی کی مثال ہیں۔ حیوان پرستی کو شمالی امریکہ میں ٹوٹم پرستی کہا جاتا ہے۔ امریکہ کے علاوہ افریقہ کے کچھ حصوں میں بھی ٹوٹم پرستی پائی جاتی ہے۔ چین اور جاپان کے لوگ بھی اس معاملے میں دوسرے مشرکوں سے پیچھے نہیں رہے۔

اس کے بعد خود ساختہ، غیر مرنی فرضی خداؤں اور مہوہم دیوتاؤں کا دور آتا ہے۔ عرب جاہلیت میں ایسے دیوتاؤں کی کمی نہ تھی۔ عراقی و فلسطینی اور ایران و مصر وغیرہ کے علاوہ یونان و روم میں بھی کئی فرضی اور مہوہم دیوتا تسلیم کئے گئے اور ان کی پوجا کی گئی۔ بعض و خدا ایک قوم کا معبود اس کے نزدیک تمام صفاتِ کمال سے متصف قرار پاتا تھا جب کہ دوسرے معبود ایسے نہ تھے۔ جدید ارتقائی نظریے میں اسے توحید ناقص کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بعد توحیدِ خالص کا دور آیا اور اسلام نے وحدتِ الہی کا کھرا لے لاگ اور صاف ستھرا تصور پیش کیا۔

وحدت الوجود کا نظریہ ہندوؤں میں بڑی شد و مد سے موجود تھا۔ بعض مسلم صوفی بھی اس کے قائل ہو گئے اور وجود ہی کہا گئے۔ کہا جاتا ہے کہ بدھ مذہب اور جین مت میں بے صفات خدا کا تصور تھا جو الحاد اور کفر کہلاتا ہے۔ اب دنیا سوشلزم کیونرم کی راہ سے پھر لاندہیت کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہے۔ تاریخ نے انسان کو ہر پھر کو آخر کار وہیں لاکھڑا کیا جہاں سے اس نے اپنا مذہبی سفر شروع کیا تھا۔

مذہب اور عقل جن لوگوں نے مذہب کو خلاف عقل کہا ہے وہ یا تو خود بے عقل ہیں یا تنصیب کا شکار ہیں۔ صحیح مذہب عقل سلیم کے خلاف نہیں بلکہ اس کے تقاضے کے مطابق ہے۔ کسی چیز کا عام ادنیٰ یا اوسط درجے کے لوگوں کی عقل میں نہ آنا اور چیز ہے اور حقیقتاً خلاف عقل ہونا دوسری چیز۔ مذہب اگر کچھ لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کا خلاف عقل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ دنیا کی بے شمار مادی اور مائوسی چیزیں عوام کی عقل میں نہیں آئیں حالانکہ وہ ثابت شدہ حقائق کے طور پر مستم ہو چکی ہیں۔ ان مسلمات کے لئے ہر شخص کی عقل کو معیار نہیں بنایا جاسکتا۔ اسی طرح دین و مذہب کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ عقل سلیم کے مطابق ہے لہذا خلاف عقل نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہر دور میں اور ہر ملک کے ارباب عقل و دانش مذہب کے قائل رہے ہیں۔ اور آج بھی ہیں۔ پس دین و مذہب خلاف عقل نہیں بلکہ تقاضائے فطرت کے مطابق ہے۔ اس کے بغیر نہ صرف یہ کہ زندگی میں نظم و ضبط قائم نہیں ہوتا بلکہ انسانی ذہن و قلب کو سکون و اطمینان بھی نہیں ملتا۔ یہ ضرور ہے کہ عقلی و نقلی دلائل سے صحیح دین و مذہب کی تلاش کرنا لازم ہے تاکہ زندگی میں نظم و ترتیب اور روحانی سکون و اطمینان مل سکے اور دونوں جہان کی فائدہ و فلاح حاصل ہو سکے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے تمام مادی تقاضے پورے کرنے کا سامان اس دنیا میں بہم پہنچایا ہے۔ کھانے، پینے، پہننے، مکان بنانے، سردی گرمی سے بچنے، مفید چیزوں کو حاصل کرنے اور مضر سے گریز کرنے کا فطری الہام ہمارے اندر رکھا ہے۔ شہد کی مکھی کو ایک نظم و ضبط کے تحت چھتر بنانے، شہد جمع کرنے اور آتش نسل کا شعور بخشنا ہے۔ چوٹیوں کو ایک منظم سلطنت کی صورت میں زندگی گزارنے کا ڈھنگ بتایا ہے۔ اسی طرح انسان کو۔ جو اشرف المخلوقات ہے۔ نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے اور راہِ مہایت پر گامزن ہونے کا حکم دیا ہے۔ یہ حکم انسانوں کے بہترین افراد۔ انبیاء و رسل کے ذریعے سے اتارا گیا ہے۔ اس ذریعہ علم کو

دجی کہا جاتا ہے۔ اس کی صداقت کو جانچنے کے لئے عقل انسانی کے ساتھ ساتھ تجربے اور انبیاء کے ذاتی علم و عمل اور اخلاقی فاضلہ کو معیار مقرر کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں خدا کے نبی اور رسول ایسے معجزات بھی پیش کرتے رہے ہیں جن سے ان کی صداقت و امانت کو پرکھا جاسکے۔ انبیاء کی تعلیم و ہدایت اسی دنیوی زندگی کے لئے ہے اور ہم نے جانچ پرکھ کر دیکھ لیا ہے کہ اس تعلیم کو اپنانے اور اس ہدایت پر عمل کرنے سے دنیوی فلاح و صلاح حاصل ہوتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر انبیاء کے ایک آئینہ ولی زندگی اور جزاء و سزا کا نظریہ بھی پیش کیا ہے جو عقل و فکر کے عین مطابق ہے اور اس سے موت و حیات اور مقصد تخلیق کائنات کی گتھیاں بھی سلجھ جاتی ہیں۔

تقابلِ ادیان کا فائدہ یہ ہے کہ نہ صرف اس سے ہماری دینی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ علم و استدلال کی راہ کھلتی ہے اور صحیح و سقیم کا فرق واضح ہوتا ہے۔ ہم مسلم ہیں اور ہمارا دین بفضلِ خدا عقل و فکر کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ اس مضمون سے غیر شعوری ایمان کو شعوری اور پختہ بنانے میں مدد ملتی ہے۔

ہندو مذہب

ہندو مذہب دنیا کے قدیم مذاہب میں سے ہے۔ کئی وجوہ کی بناء پر ہمارا اس سے بہت قریبی رابطہ ہے۔ اس کے پیروؤں کی ایک خاصی تعداد ہندوستان میں رہتی ہے۔ کچھ اقلیتیں مغربی ممالک اور افریقہ و امریکہ میں بھی مقیم ہیں۔ دنیا کی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ پر یہ مذہب کئی طرح سے اثر انداز ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہے، لہذا اس سے پہلے اسی پر گفتگو کی جانی مناسب ہے۔

یہ امر افسوس ناک ہے کہ دنیا کے اس عظیم و قدیم مذہب ہندو مذہب کی تاریخ کی کوئی تاریخ نہیں۔ خود ہندو فاضلوں نے اس امر کا کھلا اعتراف کیا ہے۔ اس کا بڑا باعث یہ ہے کہ یہ مذہب دوسرے ادیان کی مانند کسی ایک رہنما، نبی و رسول، کتاب اور متعین عقائد اور اعمال کی طرف قسب نہیں کیا جاسکتا۔ متضاد عقائد و اعمال، متضاد کتابوں، متضاد افسانوں اور متضاد رسوم و مظاہر کا ایک مجموعہ مرکب ہے۔ اس میں دہریہوں سے لے کر ایک خدا کو ماننے والوں، ہزاروں لاکھوں دیوی دیوتاؤں کے پجاریوں، کروڑوں بتوں کی عبادت کرنے والوں

کا ہم غیر نظر آتا ہے اور یہ سب "ہندو" ہیں۔ دراصل یہ لفظ کسی دین و مذہب کا نام نہ تھا، بلکہ شروع شروع میں غلاموں اور قابل نفرت لوگوں کے لئے بولا جاتا تھا۔ کثرت استعمال سے ایک ملک کے باشندوں اور مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک مذہب کے پیروں پر بولا جانے لگا۔ ہندو سیاست دانوں نے اس صورت احوال سے بہت سے فوائد بھی حاصل کئے ہیں۔ ایک یہ کہ برہمنوں کا اقتدار ہمیشہ محفوظ رہا۔ دوسرا یہ کہ غیر ہندوؤں مثلاً بدھوں، سکھوں اور جینیوں وغیرہ کو ساتھ ملا کر ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ دکھائی گئی۔ چنانچہ تقسیم ملک کے وقت ایسا ہی ہوا۔ یہ سب غیر ہندو تعداد کے لحاظ سے تو ہندوؤں کے کھاتے میں رہے مگر حقوق کے لحاظ سے آج ہندوستان میں سکھوں اور دوسری اقلیتوں کا جو حال ہے وہ ہندی مسلمانوں سے کسی حال میں بہتر نہیں۔

آریاؤں کا مذہب وسط ایشیا سے ہندوستان پر حملہ آور ہونے والی آریہ قوم کا مذہب نامعلوم ہے۔ اس پر تائید کی کارہ پڑا ہوا ہے۔ اتنا

بہر حال معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ وہم و خرافات کے پابند تھے اور فرضی دیوتاؤں کے عبادت گاہیں۔ یہی وہی رسوم و رواج کے ساتھ آگے چل کر داخل مذہب ہو گئیں پھر یہی لازم تھا کہ یہ بیرونی حملہ آور مقامی بت پرست یا لا مذہب لوگوں سے متاثر ہوں۔ مقامی لوگوں کا مذہب بالعموم بت پرستی تھا۔ جیسا کہ ہڑتہ اور موہنجودادو وغیرہ کی کھدائی سے ثابت ہوتا ہے۔ باہر سے درآئے ہوئے آریائی تہذیبی روایات کے ساتھ جب مقامی مذہب کا ملاپ ہوا تو ایک تیسرا وسیع و عریض مذہب وجود میں آیا۔ آگے چل کر ہزار ہا سال کی سماجی و معاشرتی رسوم، فلسفیانہ خیالات، فرضی قصے کہانیاں اس میں شامل ہوتی چلی گئیں اور ان سب کے مجموعے کا نام ہندو مذہب ہو گیا۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے، وید، پران، اپنشد، مہا بھارت، رامائن اور گیتا وغیرہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ وید متروں میں جس طرح انہی دیوتا، دیوتاؤں، سورج دیوتا وغیرہ سے مدد و نصرت کی استدعا کی گئی ہے اور دشمنوں کے خلاف جس شدید نفرت کا اظہار کیا گیا ہے، اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ فاتح آریہ قوم مقامی باشندوں کا قلع قمع کرنے کے لئے غیر محسوس اور غیر مرئی قوتوں سے مدد کی طالب ہوتی تھی اور توحید کی قائل نہ تھی۔

ہندو مذہب کا لٹریچر | ہندو مذہب کی کتابوں کے مصنفین پر بھی خود اس مذہب اور اس کی تاریخ کی مانند ماریجی کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کا زمانہ تصنیف بھی نامعلوم ہے۔ ان کی کتابوں کی حیثیت، تقدیس اور درجہ و مقام کے متعلق ہندو علماء و فضلاء میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کتابوں کی حیثیت ہمیشہ کم و بیش ہوتی رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ضروریات زمانہ کے مطابق جب جس کتاب کی حیثیت کو زیادہ اجاگر کرنا ضروری سمجھا گیا اسی کو مذہب کا مرکزی نقطہ بنا کر پیش کر دیا گیا۔ ان کتابوں میں الحاق اور ترمیم و اضافہ بھی ثابت شدہ حقیقت ہے۔

ہندو لٹریچر کی ایک بنیادی تقسیم یہ ہے کہ اس مذہب کی کتابیں دو حصوں میں منقسم ہے۔ ۱۔ سمرتی یعنی ہسموع (سنی ہوتی چیز)۔ ۲۔ سمرتی یعنی آباؤ اجداد کی روایات چاروں وید یعنی، یجور وید، اتھرو وید، سام وید اور رگ وید سمرتی کہلاتے ہیں جو عام ہندو عقیدے کے مطابق خود بخود بخود ریشیوں (اولیاء) کی زبان پر جاری ہو گئے اور لوگوں نے انہیں سنا، جمع کیا اور ان میں تغیر و تبدل بھی ہوتا رہا۔ راویا کرشنن سابق صدر ہندوستان اور جواہر لعل نہرو مشہور سیاسی ہندو لیڈر کے نزدیک وید انسانی تصنیف ہیں۔ امدان میں ہر قسم کے عقاید و خیالات موجود ہیں۔ ویدوں کے علاوہ دیگر ہندو کتب سمرتی کہلاتی ہیں۔ یہ واضح نہیں کہ پران جن کو ویدوں کی تفسیر کہا جاتا ہے آیا پہلی قسم میں داخل ہیں یا دوسری میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں سمرتی کا لفظ قانون کا ہم معنی رہا ہوگا۔ مثلاً منو سمرتی، یعنی مشہور ہندو متقن منو جی کا مرتب دارہ ہندو قانون۔

وید اور ان کی تعلیمات | وید کا لفظ وید سے نکلا ہے، ودوان عالم کو کہتے ہیں۔ وید یا کا معنی علم ہے۔ وید طبیب کو بھی کہا جاتا ہے، ویدیا ساگر ہندوؤں میں کئی لوگوں کا نام ہوتا ہے، یعنی علم کا سمندر۔ شاکر، پنڈت عالم اور برہمن کو بھی وید کہتے ہیں۔ بعض ہندوؤں کا خیال ہے کہ چاروں وید برہما (خالق کائنات) کے چار موبہوں سے نکلے ہیں، مشرقی منہ سے رگ وید، مغربی منہ سے سام وید، شمالی منہ سے اتھرو وید اور جنوبی منہ سے یجور وید۔ بعض اسے چار دیوتاؤں کی تصنیف بتاتے ہیں، اگنی دیوتا رگ وید کا ذالید، دیوتا یجور وید کا، اوسیت دیوتا سام وید کا اور چاند دیوتا اتھرو وید کا مصنف ہے۔ ہندو علماء کا خیال ہے کہ چاروں

ویدوراصل ۱۴۴ رشیوں کا کلام ہے۔ یہ طے شدہ نہیں کہ وید آیا وسط ایشیا میں لکھے گئے اور آریہ حملہ آور اور انہیں ساتھ لائے یا ہندوستان پہنچ کر لکھے گئے۔ اُپر دو ہندو لیڈروں کا — جن میں سے ایک ہندو مذہب کا عظیم فلسفی بھی تھا یعنی مہارادھا کرشن — یہ بیان درج ہو چکا کہ وید متضاد خیالات کا مجموعہ اور انسانی تصنیف ہیں، گو وہ یہ نہیں بتا سکے کہ مصنف کون تھے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اصل میں وید ایک تھا جس میں ایک لکھنتر — جھگ یا فقرے — تھے، کسی نامعلوم زمانے میں اسے تقسیم کر کے چار وید بنائے گئے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بجز وید سب سے قدیم وید تھا، دوسرے تینوں وید اسی سے بنائے گئے ہیں۔

۱۔ رگ وید۔ سب سے بڑا وید ہے۔ اس کے دس ہزار منتر ہیں۔ انکی دیوتا کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ پھر اندر دیوتا — مال و دولت کا دیوتا — کی تعریف و توصیف ہے اور دیوی دیوتاؤں سے دعائیں اور التجائیں ہیں۔

۲۔ یجر وید۔ یہ بالکل رگ وید کا چربہ معلوم ہوتا ہے اس میں ہون — جشن قربانی — کے گیت ہیں۔ اور قربانی کی اشیاء کو مخاطب کر کے دیوتاؤں کی ان سے خوشی اور رضا و بیان کی گئی ہے۔

۳۔ سام وید۔ یہ وید تاریخی طور پر زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، اس لئے بعض ہندو صرف تین ویدوں کے قائل ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد مشرقی پنجاب کا گورنر ترو ویدی (تین ویدوں کا عالم) تھا اس وید میں تقریباً پانچ ہزار منتر ہیں جو سویم یگیہ — جشن مرت — پر گائے جاتے ہیں۔

۴۔ اتھرو وید۔ اس وید میں وحدت الوجود کی تعلیم ہے۔ نصف نظم اور نصف نثر ہیں۔ زیادہ تر مضامین جاؤ و پر مشعل ہیں۔ کل چھ ہزار منتر ہیں۔

چھٹا حصہ رگ وید سے لیا گیا ہے۔

بمبشت مجموعی ہر وید تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے: ۱۔ منتر بھاگ (دعاؤں کا حصہ) (۲) براہمن بھاگ، منٹروں کی شرح و تفصیل۔ (۳) رنیک بھاگ — جنگلوں کا حصہ یعنی غالباً جنگلوں میں پڑھا جانے والا حصہ۔

ویدوں کی تعلیمات | ویدوں کی تعلیم کا وہ حصہ بڑا خوفناک ہے جس میں غیر ریاؤں کو زندہ جلاڑیوں سے، درندوں سے پھڑوانے، تہڑ پاتڑ پا کر بے رحمی سے مارنے، پانی میں غرق کرنے، ان کی آبادیوں کو پوند خاک کرنے کے

احکام ہیں۔ ان احکام میں عورت، مرد سچے بوڑھے، فرجی اور غیر فرجی میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔ اب تاریخ کے حقائق سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہندو پاکستان میں جو بے شمار میلے پائے جاتے ہیں اور جن کی کھدائی سے شہروں اور آبادیوں کے نشانات ملتے ہیں۔ یہ آریاؤں کے یہاں کی مقامی آبادی — جمیل، سنہال، دراوڑ اور سانسو وغیرہ کے دیہات اور شہروں کو جلا کر اور تباہ و برباد کر کے بنائے تھے۔ ویدوں میں آگ، ہوا، پانی کے دیوتاؤں اور آندروں پوتا سے انتہائیں کی گئی ہیں کہ وہ آریاؤں کے دشمنوں کو ملیا میٹ کریں۔ ویدوں میں عورت کو ایک ثانوی درجے کی انسانی مخلوق بتایا گیا ہے جو بیوفا، احمق اور منافق ہے۔ نکاح ثانی کی اجازت نہیں۔ عورت وراثت سے محروم ہے۔ شورو — غیر آریہ — کو برائے نام انسانی حقوق بھی حاصل نہیں۔ وہ ایک قابل نفرت مخلوق ہے۔ اس کا کام فقط دوسروں کی خدمت ہے، اسی میں اس کی نجات ہے ورنہ نہیں۔ وید ایک خدا کے قصور سے خالی ہیں۔ ان میں وحدت الوجود کی تعلیم ہے۔ کہیں 33 دیوتا بتائے گئے ہیں اور کہیں 334 -

ویدوں کی تعلیم کے مطابق ہندو پاکستان کی اصل آبادی کی تباہی و بربادی کا مفصل حال مسٹر عبدالعزیز ایٹو کیٹ کراچی نے اپنی کتاب DISCOVERY OF PAKISTAN میں کچھ تفصیل سے کیا ہے اور اپنے مختلف بیانات کو تصاویر اور نقشوں سے مزین کیا ہے۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غیر آریاؤں کے ساتھ ان ملکوں میں آریہ حملہ آوروں کے ہاتھوں کیا جیتی تھی۔

برہمن برہمن کی فضیلت و فوقیت اور اس کے مذہبی فرائض و اعمال — مثلاً قربانی کی تاثیر اور ضرورت و اہمیت پر جو کتابیں لکھی گئیں انہیں برہمن کا نام دیا گیا ہے۔ شاید آپ دھرم کے اثرات کے باعث یا برہمنیت اور اس کی بلا سبب اجارہ دہی کے عقیدہ کے سبب سے آریہ سوسائٹی میں کسی وقت اندر ہی اندر برہمن کے خلاف لاوا اُبل رہا ہو گا۔ آریہ فلاسفروں نے اس چیز کو مہانپ لیا۔ چونکہ ہندو معاشرے کی بنیاد ہی انسانی تقسیم پر تھی اور انہیں سوسائٹی کی بنیادوں میں ترولزل نظر آیا اور انہوں نے برہمن کی فوقیت و فضیلت کا از سبب اظہار کر کے اسے یہ کتابیں لکھیں۔ ان میں قربانی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ سبب یہ کہ قربانی کی سب رسوم برہمن کے ہاتھوں اور اسی کی زیر ہدایت انجام پاتی تھیں۔ نیز بتوں اور دیوتاؤں کے نام پر چڑھاے جانے والے چوہاؤں اور نذر و نیاز پر بھی اسی کا حق مسلم تھا۔ یہ حقیقت تو کسی دلیل کی

محتاج نہیں کہ ہندو مذہب کی کوئی تاریخ نہیں، غالباً ہوشیار قسم کے لوگوں نے بعض خفیہ اغراض کے تحت اس مذہب کو تاریخ سے بے نیاز رکھا ہے ورنہ شاید پہچانتا کا زمانہ وہی ہو جب ہندوؤں میں اصلاحی آوازیں اٹھ رہی تھیں مساوات کا علم بلند ہو چکا تھا۔ ذات پات کے انسانیت سوز عقیدے کو ترک کیا جا رہا تھا اور انسانی احترام و وقار کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ مبدھ مذہب اور جین مت کی اصلاحی تحریکوں سے گھرا کر نئے سرے سے برہمن کا تسلط قائم کرنا مد نظر تھا لہذا وہ لٹریچر وجود میں آیا جو تناسخ، قربانی اور برہمن کی فضیلت کے گرد گھومتا ہے۔ برہمن کی اجارہ داری نے جادو، ٹرنے ٹپکے، جھاڑ پھونک، وہم و خرافات، بھوت پریت جیسی خرافاتی چیزوں کو جنم دیا کیونکہ ان تمام چیزوں سے برہمن کی اہمیت بڑھتی اور اس کی ضرورت دو چند ہوتی ہے۔

اس لفظ کا لغوی معنی ہے: قریبی نشست۔ قاعدہ یہ تھا کہ گرو یا استاد اپنشد جنگل میں، کسی درخت کے نیچے یا کسی ندی نالے کے کنارے بیٹھ جاتا، شاگرد اس کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھتے اور اس کا وعظ یا لیکچر سنتے۔ کہا جاتا ہے کہ اپنشد ویدوں کی تفسیر ہے۔ یہ بھی ویدوں کی طرح نامعلوم اشخاص کی تصنیف ہیں۔ عام طور پر انہیں ہندو فلاسفی اور تصوف کی کتابیں مانا جاتا ہے۔ اندازاً ان کا زمانہ تصنیف ۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۵۰۰ قبل مسیح متعین کیا جاتا ہے۔ یہی دور ویدک تعلیم کے زوال کی ابتداء اور برہمنی تسلط سے چھٹکارا پانے کی تدابیر سوچنے اور بعض اصلاحی آوازوں کے بلند ہونے کا تھا۔ یہ کل ۱۵ لیکچر ہیں۔ بعض ہندوؤں نے انہیں قدامت میں ویدوں سے بھی زیادہ اہم بتایا ہے۔ خود بعض اپنشد بھی اسی کے مدعی ہیں۔ تعلیم ان کی بھی وید کی مانند متضاد اور چوں چوں کا مرتبہ نظر آتی ہے۔ ہر قسم کے خیالات ان میں موجود ہیں۔ ان کی تعلیم میں وحدت الوجود، مراقبہ، گیان دھیان، تناسخ، سجات حاصل کرنے کے طریقے، برہمن کی فضیلت، آتما (روح یا روح الارواح) اور برہمن کا اتحاد نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اپنشد کی رو سے اعلیٰ مرتبہ ان لوگوں کا ہے جو آتما (یا برہمن) میں جلد ہونے کی یافت پیدا کر لیں عشرت قطر سے دریا میں فنا ہو جائے۔ یہی ہندو وحدت الوجود کا نظریہ ہے جو عقیدہ توحید کے منافی اور رسول کی تعلیم کے بالکل برعکس ہے۔

پیران جو بدھ مت اور جین مت وغیرہ کی طاقتور اور عوامی آوازوں سے قدرے دب چکی تھی۔ گو بعض لوگوں نے ازراہ سازش پیران کو اپنشد اور وید سے بھی قدیم تر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر جدید نظریہ یہ ہے کہ ان کی تصنیف گہرت خاندان کے دور میں 5۵۰ عیسوی میں ہوئی ہے۔ یہ زمانہ بدھ مذہب کے عروج اور برہمنیت کے زوال کا تھا۔ لیکن جلدی ہی معاملہ برعکس ہو گیا اور متحدہ ہندوستان پھر برہمنیت کی گرفت میں آ گیا۔ پیران کل ۱8 ہیں۔ ان کی زبان عام فہم ہے۔ ان میں تادیبی قصے، دیوی دیوتاؤں کی دیومالائی MYTHOLOGICAL حکایات، ادھم و خرافات، سمیت پریت اور کچھ مذہبی احکام بھی ہیں۔ دنیا کی عمر کے بارے میں بعض مضحکہ نواز اندازے عجیب فلسفیانہ اور پیچیدہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ کائنات کی تخلیق کا کوئی مقصد نہیں بتایا گیا مگر طریقہ اس کا یہ بیان ہوا ہے کہ برہما — خالق کائنات نے ایک اندازاً ۱۰ اس میں سے ایک بچہ نکالا جو کائنات ہے۔ دنیا کے کئی دور ہیں۔ ہر دور ایک ہزار مہاجگ کا ہے۔ ہر مہاجگ ۳۰ لاکھ برس ہزار برس کا ہے۔ ہر مہاجگ میں 4 جگ ہوتے ہیں۔ اس وقت آخری مہاجگ چل رہا ہے۔ جس کے تین جگ ختم ہو چکے اور چوتھا جاری ہے۔ اس جگ کے چار لاکھ 6۰ ہزار ۹65 برس ابھی باقی ہیں۔ اب کون عقلمند نہیں جانتا کہ یہ سارا حساب محض رسمی و خرافاتی ہے جس کی کوئی عقلی و نقلی اور سائنسی دلیل موجود نہیں! آریہ قوم جیسی عظیم قوم جس نے ہزاروں سال ہندو پاکستان **ہندو قانونی لٹریچر** جیسے عظیم خطے پر حکومت کی تھی، ظاہر ہے کہ کسی قاعدے ضابطے یا قانون کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ قانون تو ہر انسانی معاشرے کی ایک ابتدائی اور اہم ضرورت ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں بھی قانونی لٹریچر موجود ہے۔ جسے دھرم شاستر اور دھرم شاستر کہتے ہیں۔ دھرم شاستر انفرادی و اجتماعی زندگی کے صرف مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی حصے سے بحث کرتا ہے جب کہ دھرم شاستر جراثم اور ان کی سزاؤں کا ذکر کرتا ہے۔ پس دوسری قسم خالص قانونی ہے۔ جب کہ پہلی قسم قانونی ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرتی و اخلاقی اور سیاسی و مذہبی اہمیت کی حامل بھی ہے۔ قانونی کتابوں میں منوسمترتی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ منو خود کوشل خاندان کا ایک حکمران تھا۔ اس کا بنایا ہوا اور نافذ کردہ قانون ہندو مذہب

کی جان ہے۔ منو کے ذات پات کی منظم اور سائنٹفک درجہ بندی کی ہے اور برہمن، کشتری، ویشی اور شودر کے حقوق و فرائض قانونی نقطہ نگاہ سے پیش کئے ہیں۔ برہمن برہماجی کے منہ سے پیدا ہوا ہے لہذا مقدس اور لائق احترام ہے۔ اور اکثر و بیشتر قانونی گرفت سے بالاتر ہے۔ خاص طور پر اُس وقت کسی قانونی گرفت کا مستوجب نہیں جب وہ کسی شودر (اچھوت) پر ظلم و ستم کرے، بلکہ اسے قتل تک کر دے۔ برہمن سارے جہان کا مالک ہے۔ اُسے آسمانی و خدائی حقوق حاصل ہیں۔ وہ وید مقدس کو پڑھتا اور اُس کی شرح و تفسیر کرتا ہے۔ کشتری کا فرض ہے کہ برہمن کے مشورے سے کاروبار حکومت انجام دے۔ حکومت و سلطنت کا کاروبار چلانا، حرب و ضرب کے محرکے اور نظم و ضبط کا قیام کشتری کا فرض ہے۔ وہ برہمن کی تھلیس و احترام قائم کرے گا۔ اور اس کے خلاف کی جانے والی مہربات کا سخت فوش لے گا۔ ویشی برہماجی کے پیٹھ سے پیدا ہوا ہے جیسا کہ کشتری بازوؤں سے لکلا ہے جو قوت و شجاعت کی علامت ہیں۔ تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کرنا اور معاشی سرگرمیوں کو جاری رکھنا ویش کا فریضہ ہے۔ یہ تینوں ذاتیں آریہ قوم سے تھیں۔ جو قمی ذات جو غیر آریوں کے ظلم و تشدد سے بزورِ شمشیر غلام بنائی گئی وہ شودر ہے جس کے کوئی انسانی حقوق نہیں۔ اس کا کام فقط غلامی اور خدمت ہے۔ اُس کی جان و مال اور عزت و ناموس کا مالک برہمن ہے۔ کوئی نیکی یا اخلاق شودر کی ذلت کو گھٹایا یا بڑھا نہیں سکتا جیسا کہ کوئی برائی یا جرم برہمن کی عظمت و احترام کے منافی نہیں۔ شودر کی پیدائش برہمن کے پاؤں کے نیچے سے ہوئی ہے لہذا وہ ہمیشہ ہمیشہ ذلیل و پست رہے گا۔

منو کے قانون نے برہمنیت کا قسقط قائم کر دیا۔ ہمیشہ کے لئے ذات پات کا ایسا چکر چلایا جس سے لکل کر ایک قوم کا فرد دوسری قوم میں داخل ہونے کا مستحق نہیں رہتا۔ شادی بیاہ اور تمام معاشرتی معاملات میں یہ امتیاز ضروری محض غلامی کی آٹھ اقسام قائم کی گئیں۔ جو سب ہر چھر کر غیر آریوں کے گرد گھومتی ہیں۔ منو کے نزدیک یہ لوگ غلام ہیں۔

۱۔ آریاؤں کے مفتوح لوگ۔

۲۔ خوراک کی شرط پر غلامی قبول کرنے والا۔

۳۔ کسی جرم کی سزا کے عوض غلامی قبول کرنے والا۔

۴۔ گھر کی خدمت گار داسی کی اولاد (خواہ اُس کے خاوند سے ہوئی ہو یا مالک سے)

۵۔ خرید یا ہوا غلام۔

۶۔ موروثی غلام، جو باپ و دادا کی طرف سے وراثت میں ملے۔

۷۔ ہر قسم کے غلاموں کی اولاد۔

۸۔ جھگت (غالباً یہ اوسنچی ذات کے ہندوؤں کا خدمت گزار ہے)۔

منوسمرتی وراثت کے حق سے عورت کو محروم سمجھاتی ہے۔ باپ کی وراثت

صرف بڑا بیٹا لے گا۔ وہ نہ ہو تو منیت کا باپ اور بھائی حقدار ہے۔ جو پہلے اولاد مرے

اس کی وراثت صرف ناں کا حق ہے۔ متو کے قانون میں مختلف جراثم کی سزائیں یہ ہیں

عضو تناسل کا ٹپا، پیٹ کا ٹپا، دونوں ہاتھ کا ٹپا، دونوں پاؤں کا ٹپا، دونوں کان

کا ٹپا، دونوں آنکھیں پھوٹنا، ناک کا ٹپا، قتل کرنا، جائداد و املاک کی ضبطی۔ برہمن

اور ویدو آت (عالم ہر اکثر دہیشتر برہمن ہی ہوتا تھا) قتل کی سزا سے بری ہے۔

سخت ضرورت کے وقت معمولی سزا دی جائے یا علاقہ بدر کر دیا جائے۔ شودر اگر

اوسنچی ذات میں زنا کرے تو اسے قتل کر دیا جائے یا بعض حالات میں جائداد بھین

کر آ کر تناسل کاٹ دیا جائے۔ اعلیٰ ذات کے ہندو اپنے ہی ذر (ذات) میں

باہمی رضامندی سے زنا کریں تو معمولی سزا دی جائے یا جرمانہ کیا جائے۔ ویش

اگر برہمن سے زنا کرے تو اس کی جائداد ضبط اور ایک سال قید۔ کشتی کو اسی

جرم میں ایک ہزار روپیہ جرمانہ اور گدھے کے پیشاب سے چار ابرو کا صفایا کیا جائے

ذات پات کے غیر انسانی چکر، برہمنیت

ہندو مذہب کی دو اصلاح و ترمیم کے تسلط اور ہندو معاشرے کی عدم

مساوات نے اندر ہی اندر ایک نفرت کا طوفان بپا کر دیا۔ شودر پر جو مظالم کئے

جاتے تھے اور اسے حیوانیت سے بھی کم تر دیکھے پر جس طرح پہنچا دیا گیا تھا اس

کے رد عمل کے طور پر ہندو مذہب میں کچھ اصلاحی تحریکیں بھی اٹھیں۔ ان میں جینیت

اور جڈھ مت قابل ذکر ہیں، ان دونوں نے ذات پات کی نفی کی اور انسانی مساوات

کا نعرہ بلند کیا۔ گویا یہ غیر انسانی تقسیم کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی۔ کچھ

دیر تک تو ہندو مذہب اور سماج کا اس بھرپور جھیللا ہو کر رہ گیا۔ مگر ہندو ذہنیت

اور برہمنیت کو داد دیتے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ اُس نے اصلاح کا رخ کسی اور

طرف موڑ کر ان نئی تحریکوں کو ہٹپ کر لیا۔ اور اپنے اندر ایسی کشتن پیدا کر لی کہ

یہ تحریکات ہندو مت کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں بلکہ اٹا خود اسی کا ایک حصہ بن کر رہ گئیں۔ آج ہندوستان کا ہر غیر مسلم مع دو دے چند عیسائیوں کے سوا ہندو کہلاتا ہے، چاہے وہ بدھ ہو یا جینی یا شورو یا کچھ اور۔ خلاصہ گفتگو یہ کہ برہمنیت کا اثر دبا پھر از سر نو چھکارنے لگا اور اُس نے تمام اصلاحی آوازوں کا عملاً خاتمہ کر ڈالا۔

اس دور میں ویدانت کا فلسفہ ایجاد کیا گیا جس کی غرض وید مقدس اور برہمن کا احترام از سر نو قائم کرنا تھا۔ اس فلسفے نے لوگوں کی توجہ مجسمہ سازی، بھت پرستی، اہنسا یعنی عدم تشدد کی طرف موڑ دی۔ اہنسا کا اصول جینوں اور بھوں کی خوشنودی کے لئے وضع کیا گیا تھا جو جاندار کو ستلنے اور گوشت خوری کے خلاف تھے۔ ہزار ہا سال تک ہندوؤں میں گوشت خوری اور جانداروں کی قربانی کا رواج رہا مگر جدید ہندو مذہب نے نئی احتجاجی آوازوں سے متاثر ہو کر اور انہیں خاموش کرنے کے لئے اسے بطور اصول داخل مذہب کر لیا۔ قربانی یعنی جاندار کی قربانی۔ موتوف کی گئی اور اس کی بجائے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے پھل پھول، غلہ، شہید اور شراب وغیرہ کی نذر دنیا زکا طریقہ جاری ہوا۔ لگنے کی تقدیس کا تصور پرانا ہے اور بعض قدیم تہذیبوں مثلاً یونانی، مصری اور ایرانی میں اس کا ثبوت ملتا ہے، مگر ہندوؤں نے اسے جو مجہود کا درجہ دیا ہے یہ جدید ہندو مت کی ترمیم ہے، ویدوں کے دور میں اس کا وجود نہیں ملتا۔

ہندو تشلیٹ جدید ہندو مذہب نے دیوتاؤں اور مجہودوں کی ایک تشلیٹ پیش کی ہے جس کا وجود قدیم ہندوؤں میں نہیں تھا۔ یہ تشلیٹ برہما، وشنو اور شیو پر مبنی ہے۔ اس تشلیٹ — یا سنگٹم — کی کچھ تشریح یہ ہے :-

۱۔ برہماجی بقول ان کے خالق عالم ہے مگر پیدائش کے بعد کائنات کا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اب دنیا میں وشنو اور شیو جی کا عمل دخل ہے۔ بعض ہندو فلسفوں کی رُود سے برہما روح الارواح بھی ہے اور اُسی میں جذب ہو جانا معراج انسانیت ہے۔ اعلیٰ درجے کی ارواح اُس میں جذب ہو کر اُسی کا حصہ بن جاتی ہیں اور باقی جوئی چکر دتساخ آواگون میں چپن کرنا معلوم عرصے تک تکلیف اٹھاتی ہیں، تب کہیں جا کر انہیں از سر نو نیک اعمال کے باعث

برہما میں جذب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اس کا مجسمہ بڑا عجیب و غریب اور ہندو
صنمیت MYTHOLOGY کا شاہکار دکھائی دیتا ہے، اس کے چار سر اور
چار ہاتھ ہیں۔ ایک ہاتھ میں چیمہ، دوسرے میں لوٹا اور قربانی کا سامان، تیسرے
میں تلیخ اور چرتھے میں وید ہے۔ وہ راج ہنس پر سوار دکھایا جاتا ہے۔ اس کی
رہائش کا مقام میر و پہاڑ ہے۔ اس کی بیوی سرسوتکی دیوی ہے جو فنون لطیفہ کی دیوی
ہے۔ ہندوؤں میں برہما کی پوجا بہت کم ہوتی ہے۔ اور اُس کے نام کے مندر (معبد)
بھی بہت کم ہیں۔ ہندو چونکہ فطری مادہ پرست اور بزدل ہیں۔ اور ان کے عقیدے
میں حقیقی کائنات کے بعد اُس کی نیکی بدی دوسرے دیوتاؤں کے سپرد ہو چکی ہے۔
لہذا برہما کی پوجا کا فائدہ بھی کیا ہے؟ کیوں نہ وشنو کی پوجا سے مال و دولت حاصل
کیا جائے اور شیو کی کرپڑج کر ان کے غیظ و غضب سے بچا جائے؟

2۔ وشنو: رجم و مسرت اور خوشحالی کا دیوتا ہے۔ اس کی پوجا سب سے زیادہ ہوتی
ہے۔ ہندو عقیدے میں سارے ہندو عظیم ہیر و مثلاً رام چندر
اور کرشن وغیرہ اسی کے اوتار (مظہر) تھے۔ وشنو انسانوں کے علاوہ کبھی نباتات
حیوانات تک میں ظہور کرتا ہے۔ کبھی چھل کی شکل میں، کبھی کچھوے کی شکل میں، کبھی
سود کی شکل میں، کبھی نرسنگھ کی صورت میں جو شیر اور انسان کی شکل سے مرکب ہے،
کبھی آم کے درخت میں، کبھی رام چندر جی کی صورت میں، کبھی کرشن جی کی شکل میں،
کبھی مہاتما بڑھ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اچھی کا لگی اوتار باقی ہے جو سوا چار لاکھ
برس میں آئے گا۔ اس عقیدے کی رومے مہاتما بدھ کو ہندو مذہب میں سمو دیا گیا
اور بدھوں کی حمد دیاں حاصل کی گئیں۔ وشنو مہاراج کی صورت یہ ہے کہ چار
ہاتھ ہیں، ایک میں سنگھ، دوسرے میں گوز، تیسرے میں چکر اور چوتھے میں کنول
کا پھول اس کی سواری کا جانور انسان اور پرندے کی مرکب صورت میں ہے۔ اس
کی بیوی لکشی ہے جو حسن و جمال اور مال و دولت کی دیوی ہے۔

وشنو مت ہندوؤں کا ایک خاص فرقہ ہے جس کا بانی راما پنج سوامی جنوبی
ہند کا باشندہ تھا۔ اس فرقے کا دوسرا حصہ بنگال میں اٹھا جس کا بانی کیشینا
نامی شخص تھا۔ اس نے رقص و سرود کو مراقبہ کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ لوگ اسے
بھی وشنو کا اوتار کہ کر کرشن اور رادہ کی طرح پوجتے ہیں۔ اس فرقے میں ذات پات
کی قید نہیں، سنسکرت کی بجائے مقامی زبانوں میں عبادت کرتے ہیں۔ جو

ہندو مانتے پرتز شول کی شکل میں دھو سے بنا کر اوپر مسٹھا چھڑکے وہ دشمنیت کا پیرو ہوتا ہے۔ ان دونوں دشمنو فرقوں کے افراد کے علاوہ بھی بے شمار ہندو دشمنوں کے پیجاری ہیں۔ دشمنوں مندروں کی تعداد کافی ہے۔

۳۔ شیوجی | ہندو تثلیث میں یہ تباہی، بربادی، جنگ اور طوفانوں کا دیوتا ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک تیسری آنکھ ہوتی ہے جسے ترلوچن کہا جاتا ہے۔

اس سے غیظ و غضب کے شعلے نکلنے میں کہتے ہیں، عشق کا دیوتا کام دیو اس کے غیظ و غضب کا شکار ہو کر ایک مرتبہ جل گیا تھا اور پھر بڑی ہی مشکلات سے عالم وجود میں آسکا۔ شیوجی کی علامت شیو لنگ ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے۔ اسے تنہی پوجا (طاعت کی پوجا) کہا جاتا ہے۔ بعض مقامات سے پرانی عمارتوں یا کھنڈروں کی کھدائی کے وقت لنگ برآمد ہوا ہے۔ اس کی بیوی کالی دیوی ہے جو پادہ پتی، آوا اور دگ کہا جاتی ہے۔ تینوں نام تین صفات کی بنا پر ہیں۔ اسے زندگی اور موت کی دیوی کہا جاتا ہے۔ اس کی تصویر اور مجسمہ بڑا خوفناک ہے۔ زبان باہر کھلی ہوئی، رنگ کالا سیاہ، منہ کھلا ہوا، گلے میں سانپوں اور کھوپڑیوں کا ہار، انسانی لاشوں پر ناچتی ہوئی دکھائی جاتی ہے۔ چھائیاں اور چہرہ خون آلود ہے۔ آوا کی حیثیت میں وہ ایک جھل ماں ہے۔ جس نے دونوں ہاتھ آگے کر پھیلا رکھے ہیں۔ درگا ایک غضب ناک حسین عورت ہے جو شیر پر سوار ہے۔ شیو کے نام پر بھی کئی فرتے وجود میں آئے مثلاً پربتیار شیو سدھانت، لنگائی اور نثارا۔ تیسرا جنوبی ہند میں اور چوتھا بنگال میں پایاجا تاجہ شیوجی کی اولاد بھی بتائی جاتی ہے۔ ایک بیٹے کا نام کارشک ہے جو دیوتاؤں کے لشکر کا سپہ سالار ہے۔ دوسرا گنیش ہے جو ہاتھی اور انسان کا مرکب ہے۔

جدید ہندو مذہب — جو مقبول عام مذہب کہلاتا ہے اس میں ان تین دیوتاؤں کی تثلیث کے علاوہ کچھ اور دیوتاؤں کی پوجا بھی ہوتی ہے، انہیں آپ مائو دیوتا کا نام دے لیں مثلاً (۱) آپسرایس، جنت کی رقصہ عورتیں (۲) انسان اور پرندے کا مجموعہ کتر دیوتا جسے آسمانی موسیقار کہتے ہیں۔ (۳) ناگالینی سانپ (۴) وکرش دیوتا، درختوں کے محافظ (۵) یگجن اور یکش، دولت کے دیوتا (۶) راکشس یعنی رنجرن اور بد معاش مثلاً راون۔ علاوہ ازیں گھر، گھیت، تالاب، باغ، درخت، آبادی اور جنگل میں بکھرے ہوئے بے شمار دیوتا ہیں جن کی کل تعداد ۱۱ کروڑ ہے!

گائے کی پوجا | ویدوں کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی ہزاروں سال تک گائے پرستی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اتنا ضرور ہے کہ بعض لوگ جو یونانی اور مصری تہذیب و روایات یا لٹریچر سے روشناس ہوئے انہوں نے اس جانور کو مفید اور جھولا مچالا سمجھ کر اس کی حفاظت کی۔ جدید ہندو مذہب میں گائے پرستی کی شدت پائی جاتی ہے، اس سوال پر ہزاروں فسادات ہو چکے ہیں اور شاید لاکھوں جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ گائندھی جیسا پٹھانکھا ہندو لیڈر بھی گائے کا عظیم پجاری تھا۔ ہندو گائے کے پیشاب اور گوبر تک کو مقدس سمجھتے ہیں۔ بعض اس کا پیشاب پی جاتے ہیں۔ بہر صورت بے شمار دیوتاؤں کی صف میں گائے کا بھی اضافہ کر لیا گیا ہے۔ گائے پرستی ہو یا کسی اور حیوان، درخت، پتھر یا فرضی دیوتا کی پوجا، اسلامی نقطہ نظر سے انسانی شرف و احترام کے خلاف ہے۔

ہندو مذہب کا ورن سسٹم یا ذات پات کی تقسیم | انسانوں کی مختلف طبقات میں دوسری تہذیبوں میں بھی ملے گی مگر یہ تقسیم جن قواعد و ضوابط اور جن مقاصد کی مرہون منت ہے، وہ ہندو سوسائٹی کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ آریاؤں کے اس ملک میں فاتحانہ داخلے پر مقامی آبادی کی طرف سے جس شدید مزاحمت کا سامنا ہوا اس نے فاتحین کے دلوں میں مفتوحوں کے خلاف نفرت و حقارت اور عداوت کے شدید جذبات پیدا کر دیے۔ حکومت و سلطنت کی ذمہ داریاں نبھانے، اپنی صفوں میں اتحاد قائم رکھنے اور پیش آمدہ معاشرتی مسائل کے حل کی ضرورت کے پیش نظر بھی کچھ قواعد و ضوابط درکار تھے۔ ساہا سال کے تجزیوں کے بعد ہندو عالموں نے وہ فارمولا ایجاد کیا جسے عرف عام میں (VARN SYSTEM) کہا گیا ہے۔ اس سسٹم کی قانونی تشریح منو سمرتی میں ملتی ہے۔ آریاؤں کو تین طبقات میں تقسیم کیا گیا: برہمن، کشتری اور ویش۔ ان تینوں کے حقوق و فرائض مقرر کئے گئے اور انہیں مذہبی سند سے سرفراز کرنے کے لئے برہمن کو برہماجی کے منہ سے، کشتری کو بازوؤں سے اور ویش کو پیٹ سے پیدا شدہ بتایا گیا۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی برہمن کے سپرد ہوئی۔ حکومت و سلطنت اور حرب و ضرب کے معاملات کشتری کو سونپے گئے اور تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کے کاروبار کی ذمہ داری ویش پر ڈالی گئی۔ ظاہر ہے کہ تینوں طبقات کو جو کام دیئے گئے

تھے وہ معزز و محترم تھے اور ان کی خواہش و پسند کے مطابق۔ اب خدمت و چاکری اور غلامی کا معاملہ باقی تھا جو غیر آریاؤں۔ شورو، اچھوت۔ کے پھر و ہوا۔ شورو کا لفظ ہی نفرت انگیز ہے جس سے حقارت ٹپکتی ہے۔ متوجہ کے مطابق شورو ہر حاجی کے پاؤں کے نیچے سے پیدا ہوا ہے لہذا ہر قسم کے حقرو ذلیل کام کرے گا۔ خدمت بجا لائے گا، غلامت اٹھائے گا، اور آریاؤں کی مسرت و راحت کے سامنے جھٹک کرے گا۔ یہی اس کی خدمت ہے جس پر اسے مشا کر رہنا چاہیے۔ اس کے سوا وہ کسی اور قسم کی زندگی کی آرزو کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کے لئے سخت سے سخت سزائیں مقرر کی گئیں، اس کی خودی کو مردہ کر دیا گیا تاکہ وہ کچھ اور سوچ ہی نہ سکے۔ شاید یہ انتہا تھی اس سے اس گناہ کا لیا گیا کہ اس نے آریہ حملہ آوروں کی مزاحمت کیوں کی تھی؟

ذات بات کی تقسیم کا بندھن ہندوؤں میں نہایت شدید ہے۔ بہت سے ہندو مکملج سرخٹج کر رہ گئے ہیں مگر اس بندھن کو توڑ نہیں سکے۔ ہندو قوم مصلحین کی پوجا تو بخوشی کرتی ہے، انہیں مہتا تما بھی بھڑاتی ہے اور خدائی کا درجہ دے کر ان کے بت بھی بناتی ہے۔ مگر مساوات کے سلسلے میں ان کی بات سننے کو ہرگز تیار نہیں ہوتی۔ ماضی قریب میں گاندھی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس شخص نے ہندو قوم کو پستی کے گڑھے سے نکال کر تخت حکومت پر لا بٹھایا، قوم نے اسے مہاتما، بابا اور خدا جانے کیا کیا القاب دیئے لیکن اس کی بات نہیں مانی اور آخر کار وہ ایک متعصب ہندو نامتھو رام کی گولی کا شکار ہو گیا۔

ہندو مذہب کے فلسفیانہ نظام | فلسفہ بڑا وسیع مضمون ہے جس کا موضوع ہر چیز کو بنایا جاسکتا ہے، لیکن ہندو مذہب کے حوالے سے جب ہم فلسفے کی بات کرتے ہیں تو تین چیزیں خاص طور پر مد نظر ہوتی ہیں، ۱۔ معاشرت، ۲۔ تصرف، ۳۔ خالص مذہبی مباحث۔ ہندوؤں میں فلسفے کی بھرمار ہے، اور اس کے بہت سے نظام وضع کئے گئے ہیں، سبب اس کا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس مذہب کا کوئی متعین عقیدہ، نظام حیات، متعین مذہبی عبادات و رسوم نہیں ہیں۔ لہذا بار بار تہذیبی و معاشرتی خلا پیدا ہوتا رہا اور بار بار عوام کو کسی اور طرف لگانے، انہیں بہلانے، ان کی توجہ اصل مسائل سے پھیرنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان فلسفیانہ نظاموں میں معروف معنوں میں اہلیات کا عنصر برا کئے نام ہے۔ دیو مالا فی خرافات بہت ہیں

اور پیچیدگی بے حد و حساب پائی جاتی ہے۔ ان فلسفوں میں سے بعض میں مکمل اور بعض میں جزوی مماثلت بھی موجود ہے، مگر کوئی مرکزی عقیدہ اور مرکزی شخصیت نہ ہونے کے باعث جس کسی کو بھی موقع ملا اس نے ایک فلسفہ گھڑ لیا اور اس کی اشاعت شروع کر دی۔ مندرجہ ذیل فلسفے زیادہ معروف ہیں۔

۱۔ نیائے کا فلسفہ۔ نیائے (بے انشائی) ہے۔ اس فلسفے کا بانی گوتم نامی ایک شخص تھا۔ گوتم بدھ کے علاوہ۔ جس نے نیائے سوتر نامی کتاب میں اس فلسفے کی شرح و تفصیل لکھی ہے۔ اس کی بنیاد بالعموم منطق و استدلال پر ہوتی ہے۔ نہ بحث لائی جانے والی چیزوں میں عقل، نفس، جان، رنج و راحت کو اہمیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں اس کے مباحث یہ ہیں: مادہ، مابعد الطبیعیات، تنازع اور زمان و مکان۔ یہ فلسفہ خدا کو خالق نہیں مانتا لیکن زندہ اور زندگی دیے والا اور پھر موت لانے والا ضرور مانتا ہے۔

۲۔ ویشیسا۔ اس فلسفے کا بانی کتاڈ نامی کوئی شخص ہے۔ اس فلسفے میں مادہ اور روح پر بحث ہوتی ہے، مادیات کو زیادہ تر بیان کیا جاتا ہے اور مابعد الطبیعیات کو کم۔ روح اور مادہ دونوں کو حقیقت مانتا ہے، دونوں الگ الگ ہیں مگر ان میں تعاون نہیں۔ زیادہ مباحث نفس، جان، آسمان، ہوا، پانی، مٹی، روشنی اور زمان و مکان کے پائے جاتے ہیں۔

۳۔ سائیکھیا۔ اس فلسفے کا مبلغ اعظم کپیل یا کپلا گرو تھا۔ اس کے نزدیک روح اور مادہ دونوں موجود تو ہیں مگر دونوں میں تضاد ہے۔ جب تک دونوں میں سمجھوتہ ہے حیات ہے، جب دونوں جدا ہو جائیں تو موت اور فنا ہے۔ مادے کا جوہر یکا کرتی یا پر کرتی ہے جو تین حصوں میں بٹ کر اجسام کو زندگی دیتی ہے، ستوہ جو نور و مسرت کا منبع ہے۔ راجس حرکت کا مرکز ہے اور تمس جمود و قتل کا۔ یہ فلسفہ عملی نہیں محض خیالی و نظری ہے۔ اس میں خدا کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ روح اور مادہ ہر دو قدیم ہیں اور کائنات میں انہی کی فرمانروائی ہے۔

۴۔ لوگ کا فلسفہ۔ یہ فلسفہ عملی ہے جس میں اصول صحت، طریقہ ہائے ریاضت، صفا، نظہ جانے کے، مشق، سانس روکنے اور پھر تنفس محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

چلانے کی مشق، دماغی و ذہنی ریاضت، سماجی لگانا، برہم چاریہ (عفت و پاکدامنی) کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ مشق و ریاضت سے جوگی اور راہب لوگ بعض عجیب و غریب شجہدوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اس فلسفے میں خدا کا تصور موجود ہے، علاوہ ازیں سچ بولنا (سٹیڈ) اور اہنسا (عدم تشدد) پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اس کی رُو سے سماجی لگا کر دنیا و مافیہا سے غافل ہو جانا اور خدائیں مکن ہو جانا ہی بڑا کمال ہے۔ جس سے آخر کار انسان کو بہت اونچا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ یوں کہیے کہ یہ فلسفہ رہبانیت و ریاضت کی (SYSTEMATIC) تعلیم دیتا ہے۔ پتھنچی نامی کسی ماہر ہندو فلاسفر نے پتھنچی سوترا نامی کتاب میں اس فلسفے کے مبادیات و مباحث بیان کئے ہیں۔

۵۔ مہمسا کا فلسفہ | کسی دور میں غالباً ویدوں کی گرفت ہندو معاشرے پر سے کڑھیلی پڑتی نظر آئی ہوگی جو اس مستقل فلسفے کے قیام کا باعث بنی۔ اس میں ویدوں کی عظمت و تقدیس پر بحث کی گئی ہے۔ ویداز خود مقدس ریشوں کی زبان سے ادا ہونے تھے۔ ان کے اوامر و نواہی کا ماننا ہی مسرت و نجات کا سبب ہے۔ اس فلسفے کی رُو سے: ۱۔ خدا کوئی چیز نہیں۔ ۲۔ کائنات ایک زندہ حقیقت ہے۔ ۳۔ ارواح قدیم ہیں۔ ۴۔ ویدوں کی تعلیم برحق ہے اور اس سے ازلی وابدی حیات حاصل ہوتی ہے۔ اس فلسفے کا بانی جے متی نامی کوئی ہندو فلاسفر تھا۔

۶۔ کریم کا فلسفہ | کریم کا معنی عمل ہے اور مراد اس سے قربانی ہے۔ اس فلسفے کی رُو سے جب تک اچھے عمل نہ کئے جائیں جوئی چکر (تنازع) کے عمل سے نجات ممکن نہیں۔ نیک اعمال کے ساتھ ساتھ گیان و عصیان کی ضرورت ہے۔ صرف اسی طرح کوئی رُوح برہما (روح الارواح) میں جذب ہونے کی قابلیت پیدا کر سکتی ہے۔

۷۔ ویدانت کا فلسفہ | اسے آپ ہندو تصوف کا نام دے سکتے ہیں۔ پتھد ویدوں کی تفسیر و تشریح ہے اور یہ فلسفہ اسی پر مبنی ہے۔ اس میں وحدت الوجود پر زور دیا گیا ہے۔ ”ہر چیز میں خدا ہے لہذا جس کو بھی پُوجو دراصل تم خدا کے پجاری ہو“ ویدانت کا فلسفہ دوسرے سب ہندو فلسفوں پر غالب آ گیا ہے۔ اور اس سے ہندو سوسائٹی کو جو فائدہ ملا وہ اُن کا باہمی اتحاد ہے۔

ہندو مذہب کے بعض خاص امتیازی مسائل | ۱۔ تناسخ ارواح - ۲۔ روح
(۳) بت پرستی - ۵۔ مخلوق پرستی - ۶۔ وہم و خرافات کی کثرت - ۷۔ فرضی دیوتاؤں
اور جعلی خداؤں کی کثرت - ۸۔ برہمن کی تقدیس و فضیلت - ۹۔ ذات پات کا شدید
بندھن - ۱۰۔ غیر آریاؤں سے شدید نفرت و عداوت - ۱۱۔ کوئی متعین عقیدہ نہیں -
۱۲۔ کوئی متعین رہنما نہیں - ۱۳۔ کوئی متعین عمل نہیں - ۱۴۔ جھوٹ پریت، جادو اور
ٹوٹے ٹوٹے پراعتقاد - ۱۵۔ فرضی حکایات اور دیوالائی افسانوں کا مجموعہ ہے - ۱۶۔ وحش
محبود اور توحید کا کوئی تصور نہیں - ۱۷۔ کوئی متعین کتاب نہیں - ۱۸۔ جزاء و سزا کے
اعمال کا کوئی واضح اور متعین عقیدہ نہیں - ۱۹۔ آریہ قوم اور ہندو مذہب کی کوئی تاریخ
نہیں -

ہندو مذہب میں اصلاحی تحریکات | ہندو مذہب میں برہمنیت اور ذات
پات کے ظالمانہ بندھن کے جو غیر
فطری اور متشددانہ اصول پائے جاتے ہیں ان کے خلاف ویسے تو کئی بار احتجاجی
تحریکات اٹھیں مگر اس سخت جان سوسائٹی کی داو دینی چاہیے کہ یا تو اس نے ان
تحریکوں کو سرے سے مٹا ڈالا اور یا پھر انہیں اپنا کر اپنے اندر جذب کر لیا۔ پہلی قسم
کی تحریک کی مثال بڑھ مذہب ہے۔ ایک زمانے میں متحدہ ہندوستان پر اس کی
حکومت بھی رہ چکی ہے۔ لیکن آج ہندوستان میں بڑھوں کی تعداد بہت کم ہے اور
بڑھ مت اپنے اصلی وطن نیپال اور بھوٹان وغیرہ میں سمیٹے ہوئے ہیں۔
دوسری قسم کی تحریکیں دراصل متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے اور اسلام
کی تیزی سے اشاعت کے بعد اٹھیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض تحریکیں واقعی ہندو
سوسائٹی کی اصلاح چاہتی ہوں مگر بعض کا قطع نظر صرف یہ رہا ہے کہ ہندو مذہب
کو اسلام کی زد سے بچایا جائے۔ اسلام ایک عام فہم اور سادہ دین کا نام ہے
جو ہر شخص کی سمجھ میں فوراً آ جاتا ہے۔ اس کی توحید و مساوات کی تعلیم پر کشش
ہے۔ ظلم و ستم کے تحت پسے ہوئے طبقے اس میں اپنی سبابت تصور کرتے ہیں۔ آج
پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ۴۰ کروڑ سے کسی طرح
کم نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ باہر سے تو نہیں آئے تھے، یہیں کے باشندے
نے اسلام کی فطری تعلیم کو بخوشی قبول کیا اور یہ ملک ایک مشرک ملک کے بجائے

مسلم علاقہ کہلانے لگا۔ اسلام کی تیزی سے اشاعت کو دیکھ کر ہندوؤں کے پڑھے لکھے طبقے — بالخصوص برہمن اور کشتری — بڑھکھلا گئے۔ انہوں نے ہندو مذہب میں اصلاح و ترمیم کو ناگزیر سمجھا۔ بالخصوص نسلی تعصب اور ذات پات کے غیر انسانی انقیاد کو مٹانا یا کم از کم ہلکا کرنا ضروری خیال کیا گیا۔ اگر یہ تدابیر اختیار نہ کی جاتیں تو آج تاریخ یقیناً مختلف ہوتی۔ خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ یہ اصلاحی تحریکات اسلام کے سبجانی یا سلبی اثر کے پیش نظر برپا ہوئیں۔ ذیل میں ان تحریکات کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

شکرا چاریہ کی تحریک یہ ذات کا برہمن تھا۔ مالابار کے ساحلی علاقے میں اُس وقت عرب تاجروں کی کثرت آمد و رفت اور ساحلی علاقوں میں ان کی بعض حکومتیں قائم ہو جانے کے باعث اسلام سے پوری طرح آشنا ہو چکے تھے۔ شکرا چاریہ ذہین برہمن تھا۔ اس کے سامنے دو راہیں کھلی تھیں۔ ایک یہ کہ اسلام کی پرکشتی اور سادہ تعلیم کو قبول کرے اور دوسری یہ کہ اس تعلیم کے اثرات جو تیزی سے ہندوؤں اور مبدھوں میں پھیل رہے تھے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کمر بستہ ہو جائے۔ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور ہندو دھرم کو اسلام کی یلغار سے بچانے کے لئے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ وہ سارے ملک میں گھوما پھرا، وسیع علم و تجربہ حاصل کیا، ہندو مذہب کی کتابوں پر حاشیے اور تفسیر لکھیں۔ پھر ہند کے چاروں اطراف میں چار خانقاہیں — مٹھ — قائم کیں۔ گویا یہ چار مورچے تھے جو اُس نے ہندو دھرم کی حفاظت کے لئے بنائے تھے۔ اس کی تعلیم میں توحید کا عنصر نمایاں تھا جو واضح طور پر اسلامی اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیا کو مایا — حرص و دولت — کہتا تھا اور اُس کی حقیقت کا نام برہما رکھتا تھا۔ اس کے ہاں سب انسان اس حقیقت کے اجزاء ہیں۔ گویا اس طرح وہ ہندو وحدت الوجود کا بھی قائل تھا۔ اُس نے ہندوؤں کو ایک ویدک دھرم میں جمع ہونے کی دعوت دی اور ترک دنیا کا درس دیا۔

سوامی رامانج یہ جنوبی ہند کا دوسرا ہندو مصلح تھا۔ مدراس کے علاقے میں پیدا ہوا۔ شکرا چاریہ کے شاگردوں سے علم حاصل کیا مگر اُن سے اختلاف رائے کی بنا پر الگ ہو گیا۔ وہ مایا کے نظریے کا مخالف تھا۔

توحید الہی کا شدت۔ سے قائل تھا اور خدا کو سب ابھی صفات کا حامل بتاتا تھا، روح و مادہ کو مخلوق سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کے آثار کے عقیدے کا بھی قائل تھا اور ذات بات کے نظریے کو ماننا تھا مگر شوروں کے کچھ حقوق مثلاً حق عبادت کا بھی داعی تھا۔ اُس نے توحید کے ساتھ رواداری، مساوات اور بت پرستی کی شدید مخالفت کو اپنا مذہب قرار دیا۔ نجات کے لئے عبادت و ریاضت کو لازم سمجھایا۔ اس کی تعلیمات میں تنازع و غیرہ ہندو عقائد کا ذکر نہیں ملتا۔

ذات کا برہمن اور بہت تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اس نے **رامانند کی تحریک** شکر چاریہ اور رامنج کی تحریکوں کا گہرا مطالعہ کیا اور انہی کی طرز پر ذات بات کے خلاف تحریک چلائی۔ اہل آباد کا رہنے والا تھا اس کا زمانہ ۱۶۹۹ء ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کے مشہور و معروف شاگردوں نے اس کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ ان کے نام یہ ہیں، سور داس، شنگی داس، مہنگت کیر داس، جے دلہ اور ناواجی۔ یہ لوگ شلی تعصب کے علاوہ بت پرستی کے بھی خلاف تھے اور توحید کا درس دیتے تھے۔

بابا گرو نانک صلح لاہور میں تلونڈی نامی گاؤں کے کالو کھتری کے ہاں پیدا ہوا۔ شروع سے صلح کلی اور سادھو منش تھا۔ اس کے استادوں میں مسلمان بھی شامل تھے۔ تعلیم یافتہ نہ تھا مگر فلاسفر قسم کا درویش آدمی تھا۔ عمر بھر سیر و سیاحت اور مختلف ادیان و مذاہب کے بزرگوں کی ملاقات میں لگا رہا اس کا عارفانہ کلام بہت پر مغز اور جامع ہے۔ اسی زمانے میں سید علی ہجویری، بابا فرید، سید جلال الدین بخاری جیسے مشہور صوفی بزرگ اس سرزمین پر موجود تھے۔ نانک نے ان سے ملاقاتیں کیں اور ان کی تاثیر سے ان کے خیالات اور کلام میں اسلامی اثر پھیلنے لگا۔ گرو نانک نے مسلم اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت کی اور کعبۃ اللہ کا حج بھی کیا۔ ان کی زندگی ہی میں ہندو مسلمان ہر دو اقوام بابا نانک کا پناہ اپنا حق جتانے لگی تھیں۔ مگر تجھ جو سکھ مذہب کی مقدس ترین کتاب ہے اس میں مسلمان بزرگوں مثلاً بابا فرید، حضرت میاں میر وغیرہما کے ملفوظات بھی درج ہیں۔ بابا نانک نے ارکان اسلام کی تعریف و توصیف اور عقائد اسلام کی تصدیق میں بہت کچھ کہا ہے۔ بابا نانک اگر مسلمان نہیں تو کم از کم اسلامی عقائد و اعمال کے رنگ میں رنگے ہوئے ایک صلح کلی درویش ضرور تھے اور ان کی تعلیم پر اسلام کی گہری چھاپ بالکل واضح ہے۔

سرت نامی فرقا | پنجاب میں ۱۳۳۵ھ میں پیدا ہوا۔ یہ ایک موحد شخص تھا اور اسلامی تعلیمات سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ سرت نامی غیر متعصب اور ذات پات کے جکڑ سے آزاد ہیں۔ ان کی اصولی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان (۲) خوش اخلاقی اور زہد و پرہیزگاری (۳) بد اخلاقیوں مثلاً جھوٹ، چوری، بد نظری اور بڑی سوچ سے گریز کرنا (۴) زبان کو لغو کلام سے اور کان کو فضول باتوں کے سننے سے بچانا (۵) حرص سے پرہیز کرنا (۶) ذات پات کے تعصب سے گریز کرنا (۷) ہمیشہ سفید لباس پہننا (۸) نشہ آور چیزوں سے مکمل پرہیز کرنا (۹) قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ سے پرہیز کرنا۔ (۱۰) شادی کرنا مگر صرف ایک بیوی پر اکتفا کرنا اور یہ کمر و عورت سے افضل ہے۔ (۱۱) سادہ زندگی بسر کرنا اور خود دشمنی، عز و اور دیگر سے پرہیز (۱۲) جادو، ٹونے ٹونکے، بد تشنگنی اور دھم و خرافات سے گریز کرنا۔

موہن داس کرم چند گاندھی | متحدہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں گاندھی کا نام ہمیشہ مشہور رہے گا۔ اس شخص نے ہندو قوم کو بام ترقی پر پہنچانے اور اسے آزادی دلانے میں بے پناہ جدوجہد کی۔ گاندھی گجرات کا ٹھیکہ دار ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ قانون میں باریٹ لار کرنے کے بعد نیم مذہبی نیم سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ ہمیشہ ایک لنگوٹی نمادھرتی باندھتے رہے۔ عدم تشدد اور سیتھ ان کے مشہور اصول تھے۔ جنہیں انہوں نے سیاست میں بھی داخل کیا۔ ہندو قوم کی سر بلندی کے ساتھ ساتھ وہ آزادی وطن کے لئے ہندو و مسلم اتحاد کے بھی حامی تھے۔ ذات پات کے شدید مخالف تھے۔ ہندو قوم نے انہیں تہمتا کہا، ان کی مورد کی پوجا کی، انہیں باپو کا نام دیا مگر آخر کار ایک ہندو نامہ تو رام گاڈ سے انہیں ہی انہیں ”مسلم دوستی“ کے جرم میں گولی کا نشانہ بنا ڈالا۔ آج ہندو قوم کو جو اقتدار اور حکومت کا تخت حاصل ہے اس میں گاندھی کی کوششوں کا بڑا حصہ رہا ہے۔

برہم سہاج | اس فرقے کا بانی رام موہن رائے بہت بڑا عالم و فاضل تھا۔ اس نے ہندی و سنسکرت کے علاوہ عربی و فارسی کی تعلیم بھی پائی تھی۔ ہندوستان کے صوبہ بہار میں ایک معزز برہمن خاندان میں پیدا ہوا۔

وہ شروع سے بت پرستی کا مخالف تھا اور لوگوں سے ہی اس کا رد کرتا رہا تھا۔ مقامی زبانوں کے علاوہ انگریزی، فرنچ، لاطینی اور عبرانی کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ سن پیدائش ۱۶۶۲ء اور سن وفات ۱۷۳۵ء رہے۔ وہ مورخ، پوجا کا شدید مخالف اور توحید الہی کا قائل تھا۔ ذات پات کا شدید دشمن تھا۔ برہمن ہونے کے باوجود مساوات انسانی کا علمبردار تھا۔ اسی کی کوششوں سے سنی جیسی نظامانہ اور عورت کے حقوق کی نفی کرنے والی رسم بند ہوئی۔ پڑھے لکھے ہندو رام موہن رائے کے خیالات و نظریات سے بہت متاثر تھے۔ وہ کثرت ازواج اور بچپن کی شادی کا بھی مخالف تھا۔ رام موہن رائے کی موت کے بعد دیوندر ناتھ ٹیگور برہمہ سماج کا سربراہ ہوا۔ اس کے نزدیک بت پرستی خلاف عقل و فہم تھی۔ وہ ویدوں کو بھی خالی از نقص نہیں جانتا تھا۔ برہمہ سماج والوں کو کعبادت کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے کی آزادی تھی۔ بشرطیکہ عبادت فقط اللہ کی ہو۔ ٹیگور کے ساتھ ہی برہمہ سماج کی قیادت میں کیشب چندر سیکھ کا بھی بڑا حصہ تھا۔ ستین سماج کے دوسرے معروف نظریات کی اشاعت کے علاوہ بیواؤں کی شادی پر زور دیتا تھا۔ بت پرستی کا مخالف اور توحید خداوندی کا حامی تھا۔ اس نے مختلف ذلولہ بلکہ فرقوں کے درمیان شادی بیاہ کا اصول قائم کیا۔ بعد میں ٹیگور کے ساتھ اس کے کچھ اختلافات ہو گئے اور سماج دو حصوں میں بٹ گئی۔ ستین نے سماج کے نظام اور عقائد کو مزید وسعت دی۔ اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں پر اس کے دروازے کھول دیئے۔ مشرقی ممالک کے علاوہ بعض مغربی ممالک بلکہ امریکہ میں بھی برہمہ سماج کی تبلیغ ہوئی اور ستین نے خود مغربی ممالک کے دورے کئے۔ برہمہ سماج کی تحریک ایک آزاد خیال فلسفیانہ قسم کی تحریک تھی۔ اس میں توحید الہی پر زور دیا جاتا تھا۔

آریہ سماج | اس فرقے کا بانی سوامی دیانند سرسوتی ۱۸۶۴ء تا ۱۹۵۵ء انگریزوں کے آریہ سماج ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن میں گھر سے نکل جھاگا اور مذہبی تعلیم حاصل کی۔ کافی مطالعہ اور غور و فکر کے بعد "بت پرستی کے خلاف اور اصلی دیک دھرم کو زندہ کرنے کے ارادے سے" آریہ سماج نامی تحریک جاری کی۔ سوامی دیانند کی سرگرمیوں، خیالات اور کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب بالخصوص اسلام کے شدید مخالف تھے۔ انہوں نے مذاہب عالم کا رد نہایت دلآزادانہ انداز میں کیا ہے۔ ان کے زمانے میں متحدہ ہندوستان کی ہر آبادی میں فرقہ وارانہ اور متعصبانہ مذہبی مناظرے شروع ہوئے۔ ان کی تحریک کا انداز جارحانہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو غلیظ گالیاں دی جانے لگیں مسلمانوں میں شدید اشتعال پیدا ہوا۔ اور بعض جوشیلے نوجوانوں نے آریہ سماج کے بعض سرگرم اوبے لگام لیڈروں مثلاً شر دبانند، لیکرام اور راجپال کو دون دیاڑے ملک کے مختلف مقامات

پر مٹھکانے لگا دیا۔ یہ انگریزی حکومت کا دور استحکام تھا۔ مقامی آبادی کی باہمی کشمکش حکومت کے
 سستی میں جاتی تھی۔ اس لئے حکومت نے ہوشیاری اور سیاست دانی کے تقاضوں کے پیش نظر اس
 مناقشت کی درپردہ سماعت بلکہ سرپرستی کی۔ دانشمندوں کا خیال ہے کہ سوامی دیانند سرسوتی اور مرزا
 غلام احمد قادیانی ہر دو کو حکومت وقت کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل تھی۔ تاکہ وہ مذہبی کھٹ
 پٹ جاری رکھیں اور غیر ملکی حکومت کی غیروں میں مضبوط ہوں۔ سوامی دیانند نے ویدوں کی شرح
 لکھی اور ایک مشہور کتاب تیار تھہ پر کاش میں تمام مذاہب کا کھنڈن درو کیا۔ اس کتاب کے
 چودھویں باب میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر بڑے رکیک اور ناروا جملے کے متعلق سختے علمائے
 اس کتاب کا مدقل اور متوازن جواب لکھا۔ آریہ سماج صرف چار ویدوں کو مانتی ہے۔ اور
 سوامی دیانند نے ویدوں کی من مانی شرح و تفسیر کی ہے۔ جس پر انہیں بڑا اصرار بھی تھا۔ ذات
 بات کی قیصر سماج کے نزدیک غلط تھی۔ علم کے دروازے ہر شخص پر کھولے گئے۔ بت پرستی ادوی
 دیتا، اوتار وغیرہ خاص منہد و مسائل کا رد کیا۔ اور توحید کا اعلان کیا۔ مگر خدا کو ایک ماننے کے
 ساتھ ساتھ وہ روح اور مادہ کی قدامت بھی قائل تھی۔ پس اگر روح اور مادہ ہر دو قدیم ہیں تو مخلوق
 نہ ہوئے۔ اس طرح ایک خدا کی توحید قائم نہ رہی۔ اور کم و بیش تین خدا ثابت ہوئے۔ علاوہ ازیں
 سماج تنازع جیسے غیر عقلی نظریے کو بھی مانتی ہے۔

جین مت جین مت آج کل ہندو مذہب کا حقہ شمار ہوتا ہے۔ جینیوں کو بالعموم ہندو
 ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور مردم شماری میں وہ ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ گنے گئے ہیں
 اس میں شک نہیں کہ مذہب ہونے کے لحاظ سے یہ ایک الگ مذہب تھا۔ مگر ہندو سوسائٹی
 کا اثر دہا جس طرح مختلف ادوار میں کئی مذاہب کو مٹ پ کر جاتا رہا ہے۔ اور اب وہ اپنی انفرادیت
 مٹا کر ہندوؤں کا ایک جزو بن چکے ہیں۔ اسی طرح جینی بھی اس اثر و کاشکا رہوئے۔ اب ان کی
 انفرادیت اور امتیاز کو پہچاننا مشکل ہے۔ جین مت ہندوستان کے قدیم مذاہب میں سے ہے۔
 اس کے پیروؤں کے بقول اس مذہب میں ۲۴ مہر متفکر رہنما ہوئے ہیں۔ جن کی عروں
 قدسیت اور قیامت کے متعلق کئی مبالغہ آمیز دیومالائی حکایات مشہور ہیں۔ آخری دور رہنما پرستونا تھا
 اور مہادیو بہت معروف ہیں۔ ان سے پہلے کے رہنماؤں کے حالات پر ظلمت و گناہی کے وہیز
 پردے پڑے ہوئے ہیں۔ پرستونا تھا کہ زمانہ ۸ ویں صدی قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ وہ بنارس
 کے ایک کشتی راجہ کا بیٹا تھا۔ عیش و عشرت کی زندگی سے منہ مو کر اُس نے رہبانیت اختیار
 کی۔ کافی عرصہ ریاضت اور سیاحت کے بعد ہروان پایا اور پھر عدم تشدد، صداقت اور خوش
 اخلاق کا متبع بن کر ظاہر ہوا۔

جینیوں کا ۲۴ واں رہنما مہا ویر تھا۔ وہ سن ۵۴۵ قبل مسیح میں ہندوستان کے شہر پٹنر کے قریب ایک کشتی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک بڑے قبیلے کا سردار تھا۔ اور ماں کا تعلق بھی گندھ دیش کے شاہی کشتی خاندان سے تھا۔ مہا ویر نے تیس سال کی عمر میں رسیانیت اختیار کی اور بارہ سال تک بالکل عریاں رہا۔ پھر ایک دریا کے کنارے ۴۲ سال کی عمر میں اسے معرفت اور گیان حاصل ہو گیا۔ اس نے خواہشات دنیوی پر فتح حاصل کی تھی۔ اس نے جینی (فانچ) کہا گیا اور یہی نام اس کے پیروکاروں نے اپنا لیا۔ مہا ویر کے فلسفے میں نرپان دو طرح سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک طریقہ منفی ہے اور دوسرا مثبت ہے۔ منفی یہ کہ دکھ کا منبع خواہشات ہیں۔ جب خواہشات کو مٹا دیں تو دکھ مٹ جائے گا۔ اور دل مسرت سے لبریز ہو جائے گا۔ مثبت طریقہ یہ ہے کہ عقیدے، علم اور عمل کو درست کیا جائے۔ عمل کی درستی پانچ باتوں سے ہوگی۔

۱۔ اہمسیا یا اہنسہ عدم تشدد کسی جاندار کو تکلیف نہ دینا، بلکہ نباتات تک کو تکلیف دینے سے گریز کرنا۔

۲۔ ستیام یعنی راست بازی، قول و فعل میں صدق و راستی اختیار کرنا۔

۳۔ کسب حلال، رزق حاصل کرنے کے ناجائز طریقوں سے پرہیز کرنا۔

۴۔ برہمچاریام، یعنی پاکیزہ زندگی گزارنا۔

۵۔ اپری گراہر، مادی لذتوں پر غلبہ پانا اور حواسِ خمسہ کو کنٹرول میں رکھنا۔

جین مت کا اثر پھر بارہ کتاہوں پر مشتمل ہے جنہیں انکس کہتے ہیں۔ پہلے پہل یہ مت بڑا سادہ تھا۔ اس کی بنیاد عبادت و ریاضت پر نہیں بلکہ تزکیہ نفس پر تھی۔ کوئی عبادت گاہ نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ مندر اور مجید تعمیر ہوئے۔ جس میں اپنے بزرگوں اور رہنماؤں کے مجسمے رکھے گئے۔ پھر ان کی پوجا شروع ہو گئی۔ اور یہ مذہب بھی ہندو دھرم کی مانند مورتی پوجا کے چکر میں چپس کر رہ گیا۔ جینیوں کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک تارک الدنیا سادھو اور دوسرے دنیا دار کاروباری لوگ۔ ہندوؤں کی مانند وہ آداگوں کے بھی قائل ہیں۔ لگتی آشنائی اور ترویج کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی آداگوں کے چکر سے چھوٹ جائے۔ یہ صرف اچھے اعمال سے ہو سکتا ہے۔

جین مت کا گہرا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں ایک طرف تو ہندو مذہب سے کافی مشابہت پائی جاتی ہے مثلاً مندروں میں مورتی پوجا کرنا، آداگوں پر یقین رکھنا اور دوسری طرف اس میں جگہ مت سے کافی مشابہت ملتی ہے۔ مثلاً عدم تشدد، سیتہ خواہشات

کوٹھا کر یا ان پر غلبہ حاصل کر کے زردوان - سنجات - پانا - بدھ مت اور جین مت کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہے۔ دونوں میں ذات پات کی تفریق کی نفی پائی جاتی ہے۔ گویا دونوں برہمنیت سے سنجات کے خواہاں تھے۔

بدھ مذہب

برہمنیت کے بت کو توڑنے اور ذات پات کی ظالمانہ تفریق کے خلاف **بدھ مذہب** سب سے زیادہ طاقتور اور بلند آواز مہاتا بدھ کی تھی۔ ہندو سوسائٹی کے خلاف فطرت اصول اور ہندو مذہب کے بیچ در پیچ فلسفوں کے خلاف بدھ سے پہلے بھی کئی آوازیں بلند ہوئیں مگر وہ وسیع و عریض ہندو غلبے کے گنبد میں گونج کر خاموش ہو گئیں۔ بقول جواہر لعل نہرو ہندو مذہب کا ناپیدائنی کارور یا سب اصلاحی آواروں کو اپنے اندر جذب کر لیتا رہا۔ مگر بدھ کی آواز نے کافی عرصے تک ہندو سوسائٹی کے وسیع جنگل میں تھلکے چمکائے رکھا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ متحدہ ہندوستان میں سہر طرف بدھ ہی بدھ نظر آتے تھے۔ بدھوں کی حکومتیں قائم ہوئیں اور کچھ عرصے تک دنیائے برہمنیت کے ظلم و ستم سے سنجات پائے رکھی۔ مگر آہستہ آہستہ یہ اثر دبا پھر نیم بدھوشی کی کیفیت سے ہوشیار ہوا اور بدھ مذہب کو نکل گیا۔ اب ہندوستان میں چند لاکھ بدھوں کے سوا اس مذہب کا نشان تک نہیں ملتا اور یہ مذہب دور دراز کے ممالک میں پناہ گزین ہونے پر مجبور ہو گیا۔

بدھ مت کے ظہور سے قبل ہندوستان کے احوال موجودہ ہندو معاشرہ کا اگر ذرا تفصیل سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ بدھ مت کے ظہور سے پہلے ہندو سوسائٹی کا کیا رنگ ہو گا۔ اس سوسائٹی میں کثیر التعداد فرضی دیوی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی۔ ایک مقدس مذہبی گروہ برہمن معاشرے کو پوری طرح گرفت میں لے چکا تھا۔ اسے تقدس و طہارت کی سند مذہبی کتابوں سے بہم پہنچ گئی تھی۔ وہ خدا کے منہ سے پیدا ہوا تھا لہذا کوئی گناہ یا کوئی ظلم و ستم اسے ناپاک نہیں کر سکتا تھا۔ اسے قانون اور حکومت کی پوری مادی قوت کی مدد کے علاوہ آریہ نسل کی اخلاقی و عملی تائید بھی حاصل تھی۔ پاکیزگی کے اس غیر انسانی اور غیر فطری تصور نے اسے بدکاری، قتل و غارت اور بد اخلاقی کا جھنڈہ بنا رکھا تھا۔ اس کے ظلم و ستم کے خلاف کسی کو چوں کر نے کی جہت نہ تھی۔ غیر آریائی نسلیں نیم حیوانی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔ انہیں خدا نے پیدا ہی ذات امتحانے اور

اعلیٰ ذات کے بندہؤں کی خدمت کرنے کے لئے کیا تھا۔ ان کے کوئی انسانی حقوق نہ تھے۔ برہمن خدائی کے مقام پر فائز تھا۔ ساری دنیا اور اس کی تمام مادی و روحانی لذتیں اُس کی ملکیت میں تھیں۔ عورت کو عزت و احترام اور برابر ہی کا مقام حاصل نہ تھا۔ ویدک تعلیم اسے اسحق، ہونفا اور منافی قرار دے چکی تھی۔ نجات کی اجارہ داری مذہبوں ٹھیکے داروں کے قبضے میں تھی۔ مذہب پیچیدہ رسم و رواج کا ایک خفیہ نظام بن چکا تھا۔ جب تک لاکھوں کروڑوں دیوبی دیوتاؤں کو خوش نہ رکھا جائے ونبوی زندگی کی راحت و مسرت محال تھی۔ اور انہیں خوش کرنے کی کبھی برہمن کے قبضے میں تھی۔ معاشرے کو ایک بندھن میں جکڑے رکھنے کے لئے عجیب و غریب بیج دریغ ناقابل فہم فلسفے ایجاد کئے گئے تھے۔ عام آدمی کو یہ پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ ہندو مذہب دراصل ہے کیا، اور اس کے اصول و ہدای کون کون سے ہیں۔ شراب خوری اور جوئے بازی کو مذہبی سند حاصل تھی۔ فرضی قصے کہانیاں اور فرضی معبود انسانی ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ بہت سے ذہین لوگ اس صورتِ احوال سے برگشتہ خاطر تھے۔ مگر بولنے کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ انسانی فطری جذبات اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتے تھے۔ ننگے سادھوؤں اور بیکار مذہبی اجارہ داروں کی فرج نظر مروج بیمار سے عنیت کش طبقوں اور غلاموں کی خون پینے کی کمانی کو مہر پ کر جاتی تھی، کمانے والے بھوکے رہتے تھے، وہ قہر آلود نظروں سے اس صورتِ حالات کو دیکھتے مگر خون کے آنسو پی کر خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ ہمارے نزدیک مہاتما بدھ کا عظیم ترین کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے مظلوم اور دکھی لوگوں کی مظلومیت کو ایک زبان بخشی۔ ہم بدھ مت کو مذہب سے زیادہ برہمنیت کی انسانیت سوز (DOMINATION) کے خلاف ایک مؤثر صدارتے احتجاج سمجھتے ہیں۔

مہاتما بدھ کی اخلاقی تعلیمات اور مساوات انسانی کے نظریے نے ایک طویل عرصے کے لئے برہمنیت کے ظالمِ بُت کو پاش پاش کر دیا۔ اُن کی اصل تعلیمات کو — بعد کی آمیزشوں سے جدا کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے شرک اور بُت پرستی پر چوٹ لگائی ہے شمار فرضی دیوتاؤں کے تصور کو باطل کیا، ذات پات اور جونی چکڑ سے انسانوں کو آزاد کیا۔ بے شمار لالینی اور پیچیدہ مذہبی و معاشرتی رسوم و خرافات کا ابطال کیا، نجات کے لئے ناقابل فہم مذہب و دنیا دار قوانین کا عقیدہ توڑا، عورت کا احترام بحال کیا اور انسان کو نیکی، خوش اخلاقی، محبت اور مساوات کا ماہر درس دیا۔ اس بروقت اور بر محل تعلیم نے ہندوستان کی مذہبی کا یا بلٹ دی اور بہت جلد ہندو اقتدار کے بجائے بدھ مذہب کو سیاسی بالادستی حاصل ہو گئی۔

اس زمانے کا ہندوستان مذہبی انتشار، مظاہر پرستی، اخلاقی بے راہ روی، شراب خوری

جنسی آزادی، فواحش و عریانی کی کثرت، معاشرتی اور منہج اور معاشی بے انصافی کے گہرے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ مہاتما بدھ کی بے لوث اور طاقتور آواز نے اسے جھنجھوڑا اور خوش خلقی، عدل و انصاف اور احترام انسانیت کا پیغام دیا۔ انہوں نے ظالمانہ ہندو قوانین کے نائے بانے کوتار کر دیا اور معاشرے کی بنیاد عدل و احسان پر استوار کرنے کی جدوجہد کی۔ بغرض ہندوستان کی تاریخ گوتم بدھ کی فکر کے کسی اور مصلح، فلاسفر اور اخلاقی و مذہبی رہنما کو پیش کرنے سے عاجز رہے۔

مختصر حالات زندگی | **گوتم بدھ** کا اصل نام سدھارتھ تھا۔ ساکھیائی، گوتم بدھ جیسے القاب بعد میں ملے۔ باپ کا نام شدھو دھن تھا۔ پیتال کی راجدھالی کپل و ستوں میں جہاں ان کی خاندانی حکومت تھی، مہاتما بدھ ۵۶۳ قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ وہ باپ کے ولی عہد بھی تھے۔ لہذا ان کی تربیت شاہانہ انداز میں ہوئی۔ وہ ابتداء سے بہت حساس، ذہین اور عجز و فکر کے عادی تھے۔ گزرو پیش کے حالات نے ان کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا۔ گوان کی شادی بوجوانی میں ہو چکی تھی۔ اور وہ ایک بچے کے باپ بھی بن چکے تھے۔ مگر اندر سے طبیعت بے چین رہتی تھی۔ کہتے ہیں کہ سیر و سیاحت میں ان کے سامنے چار ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے ان کی زندگی کا دھارا ایک سر بدل دیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک بوڑھا دیکھا، کمر جھکی ہوئی، چہرے پر جھڑپاں، ہاتھوں میں ریشہ، لامٹی کے سہارے لوکھڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ خادم نے بتایا کہ یہ بوڑھا آدمی ہے اور زیادہ بڑی عمر میں آدمی کا یہی حال ہو جاتا ہے۔ گوتم بدھ پر بڑا اثر ہوا کہ حسن و جمال اور طاقت و جوانی کا یہ انجام ہے؟ پھر ایک دفعہ ایک بیمار آدمی کو دیکھا جو مرض کی شدت سے نڈھال تھا۔ اور کرب و بے چینی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ گوتم نے سوچا کہ آہ! صحت کا یہ مال ہے۔ پھر ایک دن ایک لاش دیکھی جسے جلاسنے یا دفنانے کے لئے لے جایا جا رہا تھا۔ اور پیچھے پیچھے عورتیں بین کر رہی تھیں۔ گوتم بدھ کو ایک دھکسا لگا۔ اس نے سوچا کہ زندگی کا یہ انجام ہے۔ وہ کھو یا کھو یا سا پریشان حال رہنے لگا۔ ایک دن اُس نے ایک سادھو کو دیکھا جو گوڑی چیمنے، کشکول لگائی ہاتھ میں لئے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر لباشادیت و اطمینان کے آثار تھے۔ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ گوتم بدھ اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ سکون و اطمینان پانے کے لئے تاج و تخت چھوڑ کر جنگل کی راہ لوں گا۔ اور نروان حاصل کروں گا۔ وہ ایک دن چپکے سے رات کو دسے پاؤں پہنچے کو سکون کی نیند میں چھوڑ کر محل سے نکل گیا۔ اور رخصتیت اختیار کر لی۔ بعض علماء مثلاً سرادھاکرشن سابق صدر جمہوریہ بھارت کے خیال کے مطابق یہ گوتم بدھ کا حقیقی دنیا سے

فرار تھا۔ وہ مایوسی کے عالم میں راحت و سکون حاصل کرنے کو گھر بار چھوڑ کر نکل گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خیال کسی حد تک درست ہو مگر گوتم بدھ کی آئندہ زندگی اس خیال کی پوری تائید نہیں کرتی۔ وہ حصولِ نردان کے بعد پھر دوبارہ دنیا میں داخل ہوا۔ دیکھی انسانیت کے دکھ درد میں شریک ہوا۔ اور انہیں راحت و مسرت کا پیغام دیتا رہا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دھرمی والہام کا کوئی متوازن پیغام سامنے نہ ہونے کے باعث گوتم کو یہ پرمشقت طویل راستہ اختیار کرنا پڑا۔ مگر اس کی عظمت و رفعت سے انکار کرنا بہت مشکل ہے۔

گوتم بدھ اندرونی سکون و اطمینان کی تلاش میں پھرتا پھرتا مگدھ ویش میں جا داخل ہوا۔ وہاں اس کی ملاقات چند غار نشین سادھوؤں سے ہوئی۔ اس نے ان کی گفتگو سن کر ریاضت اور نفس کشی شروع کر دی۔ چھ سال یہی حال رہا۔ وہ شوک کو بڑیوں کا ڈھا پنجرہ رہ گیا۔ مگر اس کا مطلب برسرِ آ یا۔ اس پر بیہوشی کے دورے پڑتے رہے۔ مگر دل کی دولت بیکسر نہ آئی۔ اس نے از سر نو غذا کا استعمال شروع کر دیا۔ سادھو اور مرید ساتھ چھوڑ گئے مگر وہ اپنی دھن میں مست رہا۔ یہ وقت بڑا نازک تھا۔ آخر کار تفکر و تدبیر کے عالم بن گیا۔ نامی شہر کے باہر ایک بڑے درخت کے نیچے اس کا دل روشن ہو گیا۔ اور اس پر موت و حیات، مسرت و مسرت اور نفع و ضرر کا راز کھل گیا۔ اب اسے نردان حاصل ہو چکا تھا۔

وہ واپس بنارس آیا اور جن سادھوؤں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا ان سے بحث و مناظرہ کر کے انہیں قائل کر لیا کہ دکھ درد کا راز کیا ہے۔ اور اس سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ گوتم بدھ کا یہ پہلا وعظ تھا جس کا نام رکھا گیا ہے: راست بازی کا جہنم متحرک کرنا۔ غالباً یہیں سے پہلی بدھ مذہب کا شعار بنا اور آگے چل کر اس مذہب کے فرقوں کے نام میں بھی پہنچا داخل ہو گیا۔ اس کا دوسرا وعظ دو آنشیں وعظ، کے نام سے موسوم ہے جو ایک جنگل میں سادھوؤں کو مخاطب کر کے دیا گیا تھا۔ اس میں اس نے بتایا کہ حرص و ہوا غیظ و غضب اور فریب و نفرت جلتی آگ کی چٹا ہے اس آگ کو بجھا دیں تو نردان حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر گوتم اپنے سادھو مریدوں سمیت مگدھ ویش میں داخل ہوا۔ یہاں کے حاکم نے اس کا بڑا احترام کیا اور اس کا مرید بن گیا۔ جب شہر ت کپل و ستو میں پہنچی تو گوتم بدھ کو اس کے باپ کا دعوت نامہ ملا کہ وطن آؤ۔ گوتم کپل و ستو پہنچا تو باپ نے اس کی فیضانِ زندگی کو پسند نہیں کیا، نہ اس کی آؤ مہکت کی اور نہ کھانا پوچھا۔ گوتم بدھ سادھوؤں کو لے کر شہر میں گھر گھر جھیک مانتے کو نکلا تو باپ کو بڑا دکھ ہوا۔ وہ اسے شاہی عمل میں لے گیا۔ اور بہت عزت کی۔ وہ اپنی بیوی سے بھی ملنے کو بخود گیا۔ وہ اس کی مرید ہو گئی اور سنگھ (خالقِ ہی سلسلہ)

کی نسوانی شاخ کا انتظام سنبھال لیا۔ اسی طرح اس کا اکھڑتا بیڑا رھل اور کئی رشتہ دار اس کے حلقہٴ ارادت میں داخل ہو گئے۔

کپہل دستوں سے گوتم بدھ واپس گندھ دیش کی راجدھانی کوروانہ ہو گیا۔ راستے میں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا۔ اور اس کا حلقہٴ ارادت وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ ایک بار وہ پھر وطن لوٹا۔ اس دفعہ اس کا باپ مر گیا جس کی آخری رسوم سے فارغ ہو کر وہ پھر سباحت کو نکل گیا۔ جنگلوں، بیابانوں اور آبادیوں میں پھرتا اور اپنا پیغام سنا تا رہا۔ اس کا وعظ بڑا سادہ اور انسانی نفسیات سے قریب تر ہوتا تھا۔ آخر کار کم و بیش 5۰ سال کی تبلیغی زندگی کے بعد لیمر ۵۵ سال گرہ کو پور کے قریب کسی جنگل میں گوتم بدھ کی وفات واقع ہو گئی۔

مہاتما بدھ کی تعلیمات | مہاتما بدھ کی زندگی تک ان کے فلسفیانہ سادہ اخلاقی مشن نے کوئی کتاب پیش کی، نہ عبادت گاہ بنوائی، نہ عبادت و ریاضت کا کوئی خاص طریقہ بتایا۔ یہ چیزیں ان کی موت کے کافی عرصہ بعد وجود میں آئیں۔ اب تو بدھ کی صاف اور سادہ تعلیم میں ہر ملک و ملت کی رسوم و روایات کا انبار نظر آتا ہے۔ بدھ مذہب جہاں بھی گیا اس پر وہیں کی چھاپ لگ گئی۔ یہی سبب ہے کہ اس مذہب کے دو بڑے گروہوں میں بڑے بڑے اصولی اختلافات موجود ہیں۔ اور بت پرستی، دیوی دیوتاؤں کا تصور، تصویر کشی، مجسمہ سازی، تپاس، جاودامتری وغیرہ، اس مذہب کے پیروؤں میں عام ہے۔ مندر بھی بنائے گئے۔ اور ان میں ہندو، ٹاؤمٹ، شنتو مذہب اور کنفیوشس کے مذہب کی اکثر چیزیں اختیار کر لی گئی ہیں۔

بدھ کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے: (۱) سب سے زیادہ زور نرواؤں۔ نجات پانے پر دبا گیا ہے۔ اور اس کے لئے ایک سادہ اور صاف طریقہ بتایا گیا ہے۔ اسے شہت پہلو طریقہ کہتے ہیں عقیدے کی سچائی، الادے کی سچائی، اقوال کی سچائی، افعال کی سچائی، حلال ذرائع سے کھانا، پختہ یقین تو جہ کی سچائی اور تصور کی سچائی۔ (۲) شہوت و خواہشات کو ترک کر دینا۔ (۳) اس تعلیم میں نفیاً یا اثباتاً خدا کا کوئی ذکر نہیں آتا، اسی لئے محققین بدھ مت کو ایک اخلاقی خانقاہی نظام سمجھتے ہیں جس کا مقصد طہارتِ باطن اور تزکیہٴ نفس کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ مشہور فروغِ مشرقی ہو سکتا ہے۔ بان کا یہی خیال ہے۔ اور وہ اسے اپنے بدھ مت کے طویل اور دقیق مطالعہ کا بخور بتاتا ہے۔ (۴) مذہبی عقائد، رسوم عبادت اور قربانی وغیرہ کے ذکر سے بھی یہ تعلیم خالی نظر آتی ہے۔ (۵) اس میں جنت و دوزخ، آخرت کی زندگی اور عذاب و ثواب نیز تناسخ کا بھی کوئی ذکر نہیں ملتا۔ (۶) اس تعلیم نے زندگی کے معاشی و معاشرتی اور سیاسی پہلو پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ ان شعبوں

کے نظم و ضبط سے یہ تعلیم خالی ہے۔ اگر کہیں ان کا ذکر آیا ہے تو اخلاقیات کے ضمن میں آیا ہے۔ (۶) بنیادی طور پر یہ نفس کشی اور اخلاقی تربیت کی تعلیم ہے۔ اسی کے نتیجے میں نروان سکون و اطمینان اور راحت و مسرت کا حصول بتایا گیا ہے۔ (۵) نروان کا نام تو ضرور ہے مگر فائدے کا مکمل کا نہیں۔ بلکہ فنار و برق کی درمیانی حالت کا نام ہے۔ (۹) بدھ کی تعلیم حصول نروان کے لئے کسی بیرونی سہارے مثلاً مذہبی عقائد و اعمال، عبادات، قربانی، توبہ و کفارہ کی قائل نہیں، بلکہ نجات کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ اخلاقی رفعت اور تزکیہ باطن کے ذریعے سے ہی نجات ملتی ہے۔ نجات کے لفظ سے غلط فہمی نہ ہو۔ اس سے مراد عذاب اخروی سے نجات نہیں بلکہ شہوات و خواہشات کے بکھڑوں سے نجات ہے۔ (۱۵) نسلی امتیازات کی مکمل نفی اور انسانی مساوات کا اعلان (۱۱) عورت ذات کا احترام، جسے ویدک تعلیم نے منافی، اسحق اور یوفا کے خطاب دینے تھے۔ اور ہندو اُسے مردہ خاوند کے ساتھ جلا دیا کرتے تھے۔ (۱۲) مہاتما بدھ نے رُوح، آتما اور دیوی ویتاؤں میں لوگوں کو نہیں الجھایا، نہ وحدت الوجود کا پیچیدہ اور ناقابل فہم فلسفہ پیش کیا۔ ہندو فلاسفہ کی تمام موشگافیوں سے انہوں نے قطعی گریز کیا اور ایک سادہ، واضح اور عوامی ضابطہ اخلاق پیش کرنے پر اکتفا کیا۔

بدھ مت کی مقبولیت عامہ کارا آگے بڑھنے اور بدھ مت کی اشاعت اور اس کے فرقوں وغیرہ کے ذکر سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں پر اس کی عام اشاعت اور مقبولیت پر مختصر بحث کرنی جائے۔ یہ مت بہت تیزی سے پھیلنا اور ہندوستان، پاکستان، لنگا، سیام، نپال، کشمیر، وسط ایشیا، تبت، ملائیشیا، اندونیشیا، چین، فلپائن، برما، بھوٹان اور جاپان وغیرہ تک جا پہنچا۔ مہاراجہ اشوک اور کنگشک جیسے فرمانرواؤں نے اس کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ اس مت کی مقبولیت کے اسباب یہ تھے۔

۱۔ گوتم بدھ کے ذاتی احوال، ان کی شہزادگی اور ولی عہدی کے باوجود رعبانیت کو اختیار کرنا اور سخت ترین ریاضتوں کے بعد حصول نروان کا دعویٰ۔ شاہی سے گداؤ، خدمتِ خلق کا جذبہ، انسانیت سے محبت یہ سب چیزیں خاص و عام کے لئے باعث کشش تھیں۔ بانی مذہب اور داعی کا ذاتی کردار اس کے پیش کردہ مشن اور دعوت کو مقبول عام بنا دیتا ہے۔

ج۔ برہمنیت کے خلاف عوامی جذبات میں ایک گھٹن تھی۔ وہ اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا کر رہ جاتے تھے۔ مگر برہمن کے آہنی پنجے کی مضبوط گرفت سے آزادی نہایت مشکل

سمجھتے تھے۔ بدھ نے ایک سادہ سی آواز بلند کر کے ان دلے ہوئے جذبات کو زبان بخش دی۔
۳۔ عورت کا احترام اور اس کے مقام کی بلندی مہاتما بدھ کے پیغام کا ایک عملی حصہ تھی۔
عورت صدیوں سے ذلیل و حقیر اور مجبور و مقہور چلی آتی تھی، اس نئی آواز نے اسے
برابر کا درجہ دیا اور یہ چیز بھی بدھ کے پیغام کی کامیابی کا باعث بنی۔

۴۔ مہاتما بدھ کا پیغام چند سادہ اور فطری باتوں پر مشتمل تھا۔ لوگ پیچیدہ فلسفوں، لالچنی
والے انداز الطبیعیات، بحثوں، بیکار رسوم و منظر، ہیچ در ہیچ عبادات، دیو مالائی فرضی
کہانیوں سے الگ چکے تھے۔ یہ چیزیں ان کی روزمرہ کی زندگی سے غیر متعلق تھیں۔ لوگوں
کے ذہن و دماغ سننے فلسفوں کے الجھاؤ سے بیزار تھے۔ مہاتما بدھ کی سادہ تعلیم
ان کی زندگی کے حالات و واقعات سے متعلق تھی لہذا وہ اس آواز کو سننے ہی اس کی طرف
لپکے اور سکون کا سانس لیا۔

۵۔ مہاتما بدھ کا پیغام پیچیدہ عبادات، ہزاروں لاکھوں دیوتاؤں کی پوجا اور ان کی
خدمت میں قربانیاں پیش کرنے سے قطعاً خالی تھا۔ اس کے برخلاف انہوں نے سادہ
خوش اخلاقی اور تزکیہ نفس پر زور دیا۔ یہ تبدیلی لوگوں کے لئے باعث اطمینان اور فرین
عقل و فہم تھی۔

۶۔ وقت کے حکمرانوں نے بھی مہاتما بدھ کے ذاتی کردار اور شاہی سے گدائی کی عملی مثال
کے باعث اس پیغام کو قبول کیا۔ عوام میں اس مسلک کی تائید کا فطری رجحان ہوتا ہے۔
جس کے ساتھ سیاسی طاقت اور حکومت کا زور ہو۔ انشوک اور کشمیک جیسے عظیم راجاؤں
نے بدھ مذہب کی اشاعت کو زندگی کا مشن بنائے رکھا۔ اس سبب سے بھی بدھ
مذہب بڑی تیزی سے کئی ملکوں کا مذہب بنا۔

بدھ مذہب کی کتابوں کی تدوین | بدھ مذہب کا انحصار ابتداء میں زبانی و ملفوظ تعلیق
پر تھا۔ مہاتما بدھ نے کوئی لکھی ہوئی چیز پیش نہیں
کی تھی۔ ان کی تعلیمات کی اشاعت زبانی روایات پر مبنی تھی۔ بدھ کی وفات کے بعد کتابوں
اور مذہبی نظام کی تنظیم کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس مقصد کے لئے وقتاً فوقتاً کم و بیش
چار مجالس شروع کیے گئے۔ پہلی مجلس مہاتما بدھ کے فوراً بعد منعقد ہوئی۔ جس میں مہاتما
بدھ کے خیالات و مواظبات کی تدوین کا کام ان کے تین شاگردوں کے سپرد کیا گیا۔ بدھ مت کی
رسوم و اخلاقیات کی تدوین کا بڑا بدھ کے ایک خاص شاگرد اپاتی نے سنبھالا۔ عقائد کے
بارے میں بدھ کے خیالات کو مرتب کرنا دوسرے خاص شاگرد انجند کے سپرد ہوا۔ ایک

تیسرے شاگرد نے بدھ مذہب کے لئے اس کے ماننے والوں کا مذاہن زندگی مرتب کرنے کا
 ذمہ لیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کام کتنے عرصے میں انجام پایا اور مرتب شدہ مواد کس کی تحویل
 میں رہا۔ لیکن یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ بدھ کے پیروکاروں میں اس کے اصل
 خیالات و ملحوظات کی جمع و ترتیب اور ان کی شرح و تفسیر میں خاصا اختلاف پیدا ہو گیا اور
 مختلف انجیال لوگ اپنے اپنے طریقے سے بدھ کے پیغام کی اشاعت اور شرح و تفسیر کرتے
 رہے۔ جب اختلاف اور تضاد حد سے گزرنے لگا تو مہاتما بدھ کے تقریباً سو سال بعد ایک
 دوسری مجلس منعقد ہوئی۔ مگر بحث و تہمید کے نتیجے میں اختلاف اور بڑھ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ
 اس مجلس میں تضاد کو رفع کرنے کے لئے دس متفقہ نکات بھی طے پائے تھے۔ مگر اختلاف
 پھر بھی دور نہ ہوا۔ مہاراجہ اشوک کے دور حکومت میں ۲۲۵ ق م ایک تیسری مجلس شاہی
 انتظام اور سرپرستی میں منعقد ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اس مجلس نے ۶۵ ہزار سادھوؤں —
 بھکشوؤں — کو خارج از مذہب قرار دیا۔ اور اس کے بعد تبلیغی کوششیں تیز تر کر دی گئیں۔
 بیرونی ہندوستان بھی مبلغ روانہ کئے گئے۔ اب بظاہر اختلافات دب گئے تھے۔ —
 مٹے نہیں۔ پھر پہلی صدی میں پنجاب، کابل اور کشمیر کے مہاراجہ کنشک کی زیر سرپرستی ایک
 چوتھی مجلس منعقد ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں متنازعہ فیہ مسائل کا تصفیہ کیا گیا۔ اشوک اور کنشک
 کا کردار بدھ مذہب کے لئے اسی قسم کا مددگار سہارا بننا جس طرح شاہ دوم قسطنطین اعظم
 کے قبولی عیسائیت کے بعد اس کی تبلیغی سرگرمیاں اور حکومتی سرپرستی عیسائیت کے فروغ و
 ارتقاء کا سبب بنی تھی۔

بدھ مذہب کی کتابیں | آج کل جو بدھ مذہب کے حامی ہیں اس کی کتابیں فرقوں
 بدھ مذہب کے دو فرقوں ہنایانہ اور مہایانہ کا کامل اتفاق پایا جاتا ہو۔
 بالخصوص اگر کوئی کتاب اس نوع کی مل بھی جائے تو اس کی شرح و تفسیر اور توضیح مطالب میں
 شدید اختلاف ہو گا۔ مناسب تو یہ ہے کہ دونوں فرقوں کی کتابوں کا ذکر ان کے عقائد و
 اعمال کے ضمن میں کیا جائے۔ ہنایانہ کا معنی ہے چھوٹا پہنچہ، یہ سادھوؤں راہبوں اور
 تارک الدنیا و ریشیوں کا فرقہ ہے۔ گویا یہ ایک چھوٹی گاڑی ہے جس پر سوار ہو کر کافی دیر
 کے بعد صرف خواص ہی نروان حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ فرقہ مہاتما بدھ کی ابتدائی تعلیمات سے
 قریب تر ہے۔ اور لنگا، برما اور سیام میں پایا جاتا ہے۔ مہایانہ کا معنی ہے بڑا پہنچہ،
 گویا یہ ایک بڑی گاڑی ہے جس میں سوار ہو کر عوام اور ہمہ شما بھی جلدی منزل مقصود تک

ہنچ سکتے ہیں۔ یہ فرقہ وسط ایشیا، تبت، منگولیا، کوریا، چین، جاپان، نیپال، بھوٹان اور انڈونیشیا میں پایا جاتا ہے۔ ہندو پاکستان میں بھی اسی دوسرے فرقے کے لوگ ہیں جن کی تعداد چند لاکھ سے زائد نہیں۔ بدھ مذہب کے پیروؤں کے بارے میں مبالغہ آمیز اعداد و شمار مشہور کئے گئے ہیں جو محققین کے نزدیک اس مذہب کے پیروکاروں کی تعداد آج سے سترہ برس پہلے سو کروڑ سے زیادہ نہ تھی۔ اگر آبادی میں اضافہ کی رفتار کو ملحوظ رکھا جائے تو آج کل یہ تعداد بیس کروڑ تک بشکل ہی پہنچی ہوگی۔

مہایانا بدھ مذہب اور اُس کے عقائد و کتب | اس فرقے میں جو بدعات لائے جاتے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ فرقہ مہاتما بدھ کی تعلیمات کے قریب تر ہے۔ اس فرقے کے نزدیک بدھ کو الوہیت کا مقام حاصل ہے۔ تاہم وہ ہے انسان ہی۔ یہ لوگ اب بے شمار دیوی دیوتاؤں کو مانتے ہیں مگر امتیاز کی خاطر اُن کے نزدیک دیگر تمام دیوتاؤں کا نفس سے پاک نہیں مگر مہاتما بدھ مکر دیوتوں اور ان کا نفس سے ممتاز اور پاک ہے۔ دیگر تمام دیوی دیوتاؤں کا نفس سے پُر ہیں۔ بدھ عارفِ کامل اور نور ہے۔ سب دیوتاؤں اُس کے عقیدت مند اور باجگزار ہیں کیونکہ اس نے بڑی رحمت و شفقت سے دکھ اٹھا کر نروان حاصل کیا اور تسکین و اطمینان کی راہ دریافت کی تھی۔ اس فرقے کے نزدیک خدا، وحی، الہام، آخرت اور روح وغیرہ کوئی چیز نہیں۔ مستقل تھی کوئی چیز نہیں۔ زندگی عارضی اور قریب نظر ہے۔ نروان کا مطلب یہ ہے کہ خواہشات کو مٹا کر سکون و اطمینان حاصل کیا جائے۔ نروان کے حصول کی خاطر خود اعتمادی اور رحمت کی ضرورت ہے۔ کسی خارجی سہارے مثلاً عبادت، توبہ و استغفار، کفارہ یا قربانی کی ضرورت نہیں۔ اس فرقے کے لوگ بدھ کے تبرکات و آثار کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اور بدھ کے طویل و عریض بُت بناتے ہیں۔

اس فرقے کی کتابیں تریپتا کا (تین ٹوکریں) کہلاتی ہیں۔ ۱۔ وینیہ پتا کا یعنی بدھ کے جکتوں کے لئے بدھ کے بنائے ہوئے اصول و قواعد۔ ۲۔ جٹا پتا کا یعنی مہاتما بدھ کے مواعظ و خطبات۔ ۳۔ ابھی دھمپا کا یعنی بدھ کا فلسفہ اور نفسیات۔ یہ کتابیں پالی زبان میں ہیں۔ اس لئے قابلِ فہم اور نسبتاً آسان ہیں۔

مہایانا بدھ مذہب اور اُس کے عقائد و کتب | مہایانا کا معنی ہے بڑی گاڑی یا عظیم پہیہ، یعنی اس میں سوار ہو کر بہت سے لوگ بیک وقت جلدی نروان کے حصول کی منزل تک جا پہنچتے ہیں۔ اس فرقے کے نزدیک

بدھ خود خدائی کا مقام رکھتا ہے۔ وہ انسان کی شکل میں آیا تھا تاکہ نروان کے حصول کا طریقہ بتائے۔ وہ ازل وابد ہی تھا جو بدھی اور علم کے نور سے ظاہر ہوا تھا۔ وہ انسان سے بالاتر تھا۔ بدھی تین صدیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ (۱) دھرم کا یا یعنی فانی و عارضی دنیا کے پیچھے ایک دائمی حقیقت ہے۔ جو کسی وقت کسی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ (ج) دس نرمان کا یا (ج) سمجھ کر کا یا یعنی مجسمہ رحمت جو بدھ کے ذریعے اس کے پیروؤں پر سایہ لگن ہے۔ ظہور کی یہ صورتیں بدھی سیتوا ہیں۔ یعنی ایک شخص خود کامل اور نہات یافتہ ہے۔ مگر دوسروں کی خاطر اسے قبول نہ کرے اور ان کی رہنمائی کرنے کو دیکھ اٹھائے۔ بدھی سیتوا بار بار ظہور کرتا ہے۔ کبھی بدھ مین اور کبھی کسی اور طرح۔ بدھ سے قبل بھی بدھی سیتوا ہوئے ہیں۔ اور بعد میں بھی ہوں گے۔ یہ عقیدہ ہندوؤں کے عقیدہ اوتار مذہب یا ہونے کی بنا پر ہندوؤں کے لئے باعث کشش تھا۔ اس کی وجہ سے بے شمار دیوی دیوتا اور اوتار بدھ مذہب میں داخل ہوئے۔ اور وہ بھی ہندو مذہب سے متاثر ہو کر ایک جیتنا بن گیا۔ اس عقیدے کے باعث بدھ مذہب کی افرادیت و امتیاز جلد ہی زوال پذیر ہو گیا۔ مہایانہ فرقہ کے لوگ تین بدھی سیتوا پوجتے ہیں۔ (۱) میریا یعنی رحم کا بدھی سیتوا (ج) مجھوسری یعنی عقل و تدبیر کا مجسمہ (ج) اولو کسٹ سواراھما سب سے بچانے والا۔ بدھوں میں اس کی پوجا سب سے زیادہ ہے۔ جیسے ہندوؤں میں شیو کی پوجا۔ کہتے ہیں کہ تبت میں اسے دلائی لامہ کا نام دیا گیا ہے۔

اس فرقے کی کتابیں کم ہیں۔ جو سنسکرت میں ہیں۔ اور ان کا ترجمہ چینی، جاپانی اور تبتی زبانوں میں کیا گیا ہے۔ نام یہ ہیں۔ دی مندرسترا، لنگا و تراشتر، قانون کامل کا پدم، سورنگماشتر، سوکھا وائی یوگا شتر، بیداری ایمان کا شتر۔

بدھ مذہب کی تبلیغ و اشاعت | بدھ مذہب ابتداء سے ہی ایک راہبانہ اور خانقاہی نظام تھا۔ مہاتما بدھ نے خود اس نظام کی ابتداء کی تھی۔ مرید بنتے اور خانقاہی سلسلے میں داخل ہوتے وقت سب سے پہلے یہ حلف لیا جاتا تھا: میں بدھ میں پناہ لیتا ہوں، میں دھرم میں پناہ لیتا ہوں میں خانقاہی سلسلے میں پناہ لیتا ہوں۔ ان اشخاص کو داخلہ نہیں ملتا تھا: فوجی، مقروض، غلام، تپ دتی، مرگی، کوڑھ، برص جیسے امراض کا مریض، بیس سال سے کم عمر کا شخص، ماں باپ کی اجازت کے بغیر آنے والا۔ سلسلے میں داخل ہو جانے کے بعد اس پر دس اخلاقی احکام کی پابندی لازم تھی۔ قتل، چوری، شہوت پرستی، دغا فریب اور گھٹی اشیا سے پرہیز، دن چروے کھانا کھانا، ذینت و آرائش سے گریز، زمین پر چٹائی ڈال کر سونا، ناج رنگ سے پرہیز، سونے چاندی کے استعمال اور انہیں پاس رکھنے

سے پرہیز۔

سطح میں داخل ہونے کے بعد درویشوں کو چتر و ہنر پڑھاتا تھا۔ وہ زرد لباس پہنتے اور گھر گھر جا کر جھیک مانگتے تھے۔ جس کا طریقہ یہ تھا کہ کشکول گدائی لے کر یا جھولی پھیل کر گھر کے آگے کھڑے رہتے تھے۔ اگر کوئی چیز ڈال دی جاتی تو بہتر ورنہ یونہی آگے بڑھ جاتے۔ یہ لوگ اپنی زندگی مراجعہ و مطالعہ میں گزارتے تھے۔ خانقاہ کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ انہیں شب و روز کے پروگرام پر عمل پیرا ہونا پڑتا تھا۔ پہلے عورتیں سنگھ میں داخل نہ تھیں۔ سوتیل ماں کے اصرار پر گوتم نے داخلے کی اجازت دے دی۔ اور ان کا انتظام اپنی بیوی جسودھرا کے سپرد کر دیا۔

گوتم بدھ کے بعد ساتویں صدی عیسوی تک بدھ مت کا عروج رہا مگر پھر زوال شروع ہو گیا۔ اس میں جادو منتر، ٹوٹے ٹوٹکے، وہم و خرافات، دیو مالا فی وہم و خرافات، ریت سازی اور ریت پرستی، دیوی و دیوتاؤں پر عقیدہ اور دوسری بدعتی رسوم داخل ہو گئیں۔ وہ ہر علاقے اور ہر قوم کے الگ الگ سانچوں میں ڈھل گیا۔ مہاراجہ اشوک اس مذہب کا پر جوش حامی و مبلغ تھا۔ اس کی حیثیت بدھ مت میں ایسی ہی ہے جیسی کہ شاہ دوم قسطنطین کی عیسائیت کے باب میں۔ اس زمانے کی کامیابی کو ہم ہنایا نہ بدھ مت کی کامیابی کہہ سکتے ہیں۔ گو یہ مذہب مہاتما بدھ کے زمانے والا نہ تھا مگر اس کے قریب ضرور تھا۔

مہاتما نہ فرقہ کر اس وجہ سے تیزی سے پھیلنے اور عروج پانے کا موقع ملا کہ اس میں ہندو عقاید و اعمال اور فلسفے کی بہت کچھ آمیزش ہو گئی تھی۔ اس طرح یہ کامیابی خالص بدھ مذہب کی نہیں بلکہ ملاوٹی بدھ مت کی تھی۔ جلد ہی اس کی صورت مسخ ہو گئی اور مندر جبریل ہندوانہ خیالات اس میں داخل ہو گئے۔ ظہور عالم کی ملت ایک اعلیٰ اور بلند تر حقیقت مٹھرائی گئی۔ گوتم بدھ کو اس اعلیٰ حقیقت کا دیوی اور عارضی مظہر مٹھرایا گیا۔ بعض نے اسے بشریت سے ماوراء قرار دیا۔ عرفان کامل یا نردان کا حصول بہت لوگوں کے لئے ضروری نہ رہا بلکہ جو اس مقام پر فائز نہ ہو سکیں وہ خدمت خلق، رحمدلی اور جانداروں کو اذیت نہ دینے کو ہی اپنا مقصد و حیات بنالیں تو ان کے لئے یہی کافی ہے۔ اسی دور میں جنت و دوزخ، عذاب و ثواب اور دوسری زندگی کا تصور قائم کیا گیا۔ اب بدھ کے پیروؤں کے لئے رعبانیت، دنیا سے فرار اور مالوسی ضروری نہ رہی بلکہ گوتم بدھ پر ایمان لانا ہی نردان کے لئے کافی طاقتور وسیلہ مٹھرا۔ اب ریت گری، مجسمہ سازی، تصویر کشی اور پیکر محسوس کی پوجا عام ہو گئی۔ یوں یہ سادہ سا اخلاقی ضابطہ اور شرک کی آمیزش سے پاک مذہب شرک و ریت پرستی کا اکھاڑا بن گیا۔

بعض بدعوتوں نے ایک فرضی ”رحم کی دیوی“ کو وہی معبودانہ حیثیت دے دی جو عیسائیوں میں مریم عذراء حاصل ہے۔

مہایانہ بدھ مت کے دلی فرقے | مہایانہ فرقہ کچھ اور ذیلی و صنفی فرقوں میں بھی تقسیم ہوا۔ ان فرقوں کے عقائد و اعمال میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔

(۱) ایک فرقہ صرف فکر و مراقبہ کو اصل مذہب جانتا ہے۔ ان کے نزدیک معرفت علم و مطالعہ اور مشاہدہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ جن کسی کے مقتدر میں ہو اسے کسی وقت اچانک مل جاتی ہے۔ دوسرے فرقے کے نزدیک معرفت — نروان — کا حصول دشوار بلکہ عساکر تقریباً ناممکن ہے۔ لہذا صرف بدھ کی بڑی و عظمت پر ایمان لانا کافی ہے۔ (ج) ان میں ایک باطنی فرقہ بھی ہے جو اپنے تمام مذہبی امور کو پردہ اخفاء میں رکھتا ہے۔ یہ تبت اور منگولیا کے لاماؤں کا مذہب ہے۔ ان کے اوراد و وظائف میں ڈرامائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک نروان حاصل کرنے کے لئے صرف ایمان اور فکر و مراقبہ کافی نہیں بلکہ مذہبی اعمال کی بجا آوری بھی ضروری ہے۔

بدھ مت کے چار اصولی حقائق | بعض محققین کا خیال ہے کہ بدھ مت کا سارا فکر و عمل گمراہ گوشتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حقائق خود گوتم بدھ کے قول سے ماخوذ ہیں۔ (۱) دنیوی مصیبت۔ (۲) دنیوی مصیبت کی جڑ (۳) دنیوی مصیبت کا علم ہونا (۴) اس مصیبت کے علم کا طریقہ + بھارت کے ایک سابق صدر اور ہندو مذہب کے عظیم مفکر ڈاکٹر رادھا کرشنن کا قول ہے کہ گوتم میں انتہائی مایوسی پائی جاتی تھی۔ اور وہ انسانی تقدیر یقین کے زوال سے شدید متاثر ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترک دنیا کی مسودگی میں راحت و اطمینان — نروان — کی تلاش کرتا پھر پیر و ان بدھ مت کی تقسیم | — سلگہ — قائم کیا تھا اور دوسرے دنیا دار لوگوں کو جس طرح کام کاج میں مصروفیت کی ہلاکت دی تھی۔ اس کے پیش نظر بالیقین کہا جاسکتا ہے کہ بدھ مت کے پیرو دو حصوں میں منقسم تھے۔ (۱) تارک الدنیا راجب و درویش۔ ۲۔ بدھ مت کے عام پیروکار۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے ترک دنیا اور رعبانیت اختیار کرنا لازم تھا۔ ان کے قواعد و ضوابط اور بیان ہو چکے ہیں۔ دوسری قسم والوں کے لئے آشنائی کافی تھا کہ: (۱) نیکی کی زندگی اختیار کریں (۲) راجوں کو دان دیں (۳) اپنے اسلاف کی پرستش کریں۔ (۴) ہر ماہ میں چار روزے رکھیں (۵) عمر بھر مذہبی احکام کی پابندی کریں اور یہ عہد کریں کہ

بکسی جاندار کی جان نہ لیں گے، جو خود بخوشی دے اس سے کچھ نہ لیں گے، جھوٹ نہ بولیں گے، زنا نہ کریں گے، منشیات سے مکمل پرہیز کریں گے۔

بدھ مت کا زوال | اتنی سرعت سے پھیلنے والا مذہب جب شاہی سرپرستی سے محروم ہوا تو بہت جلد ہی زوال کا شکار ہو گیا۔ اس کے زوال کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اسلام جیسے محسوس، متوازن اور جامع دین کے ساتھ اس کی ٹکری ہو گئی۔ یہ تصادم محمد بنی قلم کے حلقے سے شروع ہوا اور فتح کے ساتھ ساتھ اس کی شدت و وسعت میں ترقی ہوتی گئی۔ اسلام کی سادہ، متعین، محسوس اور فطری تعلیم میں بہت کشش پائی جاتی تھی۔ اس وقت بدھ مت میں ہندو بدعات کی کافی ملاوٹ ہو چکی تھی۔ اسلام کا ریل اس ملاوٹی زوال پذیر مذہب کو ہبا لے گیا۔ مسلم فاتحین کے ذاتی اخلاق اور عدل و مساوات کے عظیم تصور نے تبلیغ اسلام کا راستہ کھول دیا۔ زوال کا قیصر اس سبب یہ تھا کہ بدھ مذہب ایک ڈھیلے ڈھالا اخلاقی تربیت کا نظام تھا، معروف معنوں میں دین و مذہب نہ تھا۔ چنانچہ یہ جہاں بھی گیا وہاں کے مقامی مذاہب سے صلح کر لی اور انہی میں مخلوط ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ چینی میں ماؤ مت اور کنفیو شزم کے ساتھ، جاپان میں شنتو مذہب کے ساتھ اور لنکا و برما میں برہمنیت کے ساتھ گڈھ مڈھ ہو گیا۔ اس میں شرک و بت پرستی کی آمیزش ہو گئی۔ جلد ہی مہاتما بدھ کی مورثی اور بہت سے اور بت پوجے جانے لگے۔ بے شمار دیوی دیوتاؤں کو شامل عقیدہ کر لیا گیا۔ ہندو علم الامنام اس ساڑ سے اخلاقی ضابطے کو چاروں طرف سے گھیر کر بڑپ کر گیا۔ اب یہ مذہب ہر ملک کی رسوم و روایات کا ملغوبہ بن گیا اور ہر جگہ کا بدھ مذہب دوسری جگہ کے مذہب سے جدا ہو گیا۔ زوال کا چوتھا سبب یہ تھا کہ بدھوں کے دو بڑے فرقوں ہنایا نہ اور مہایا نہ میں خود بدھ کی شخصیت اور ان کا مقام متنازعہ فیہ مسئلہ بن گیا۔ یہ اختلاف کبھی رفع نہیں ہو سکا۔ پھر فرقہ و در فرقہ کی نوبت آئی۔ یہ لوگ ہر وقت ان مسائل میں بحث و مناظرہ کرتے رہتے جو بدھ نے کبھی نہ پھیرے تھے، بلکہ ان میں غور و غوض کو ناپسند کیا تھا۔ پانچواں سبب یہ ہوا کہ ہندو مذہب نے بدھ مت کی یلغار سے متاثر ہو کر اپنے اندر ریچک پیدا کر لی، بدھوں کو خوش کرنے کی خاطر یانیک یتیتی سے دیکونکرت پرست کے لئے ایک سوبایا ایک ہزار بت پوجنے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، بلکہ کھوٹو دیوتا کا اوتار زمان لیا اور یوں بدھ مت کو اپنے اندر ضم کرنے کی راہ نکال کر اس پر فتح پائی۔ ذات بات کی شدت میں بھی کچھ کمی آگئی اور ہندو ایک حد تک روادار بن گئے۔ دنیا بھر میں بدھوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۱۸ اورہ کر ڈر کے درمیان ہے۔ اس سلسلے میں جو مبالغہ آمیز بیان دیئے جاتے ہیں وہ غالباً سیاسی مقاصد کے حامل ہیں۔ واللہ اعلم

زرتشت کا مذہب

دین زرتشت کو الہامی مذاہب کی فہرست میں جگہ نہیں دی جاسکتی کیونکہ اس کے منطقی کتاب و سنت کی واضح ہدایت یا صراحت مفقود ہے تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے دوسرے غیر الہامی مذاہب سے یہ مذہب اپنی ابتدائی تعلیمات کی گروہ سے بالکل ممتاز ہے۔ بعد کے دین زرتشت — موجودہ پارسیوں کا مذہب — کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو اس میں خالص توحید، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، وحی و الہام، آخرت کی زندگی ملائکہ اور دیگر برحق دینی عقاید — جو ہمیشہ انبیاءِ کرام نے پیش کئے تھے — صاف نظر آتے ہیں۔ پس اس مذہب کو ہم بدھ مت، ہندو مت، جین مت، مانوا آرم اور کنفیوٹسزم کے زمرے میں شمار نہیں کر سکتے۔ بلکہ مقامِ افسر ہے کہ آج جناب زرتشت کی صحیح تعلیمات بھی دھندلا چکی ہیں۔ اور ان کے نام پر مشہور ہونیوالا مذہب آتش پرستی اور جوہریت بن کر رہ گیا ہے۔

زرتشت کی شخصیت، نام، علاقے اور کام میں شدید اختلاف ہوا ہے۔ اسی بنا پر بعض ماہرین مذاہب اسے ایک انسانوی وجود قرار دیتے ہیں۔ لیکن تاریخ کی قوی شہادتوں کے پیش نظر یہ خیال غلط ہے۔ ان کا نام زرتشت بازو وشت یا زرتشت یا زردشت تھا۔ مردہ زمانہ سے اشخاص کی شخصیت یا نام وغیرہ میں اختلاف کا پیدا ہونا قرین قیاس ہے۔ بعض مؤرخین نے انہیں جادوگر قرار دیا ہے۔ جس کا سبب یہ ہوا کہ وہ مجوسی قوم میں پیدا ہوئے تھے جو جادوگری، منتر جتر، فال گیری، مستقبل کی پیش گوئی اور ٹونے ٹوکے کے ماہر تصور کئے جاتے تھے۔ قدیم ایران میں یہ طبقہ وہی حیثیت اختیار کر چکا تھا جو ہندوستان میں برہمن کو حاصل تھا۔ لفظ مجوسی کی تحقیق میں بعض لوگوں نے MAGIC لکھ کر بھی کیا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زرتشت بھی جادوگر ہوگا۔ زرتشت کی شخصیت ایک تاریخی وجود رکھتی ہے۔ اس کا تعلق آریائی نسل سے تھا، یعنی آریاؤں کا وہ طبقہ جو ایران میں متوطن ہو چکا تھا، اسی طبقے کے ایک خاص گروہ مجوسی میں زرتشت کی پیدائش ہوئی۔ آریائی پیشے کے لحاظ سے وہ زمیندار اور کاشت کار تھا۔ شخصیت کی طرح اس کے وطن اور زمانے میں بھی کافی اختلاف ہے۔ بعض نے چھٹی صدی قبل مسیح اور بعض نے ایک ہزار بلکہ دو ہزار برس قبل مسیح تک کہا ہے۔ وطن مغربی ایران یا فلسطین بتایا جاتا ہے۔ ان میں سے پہلا قرین قیاس ہے۔ جہاں تک اس کے زمانے کا تعلق ہے وہ غالباً نویں صدی قبل مسیح ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ زرتشت نام اصل

ایرانی نغز زراشتی ہے جس کا معنی ہے پادری۔ ان کے خیال کے مطابق وہ اپنے خاندان اور برادری کے آبائی پیشے کے باعث اس نام سے موسوم ہوا اور بعد میں یہی نام مشہور ہو گیا اصل نام دب کر رہ گیا۔ خاندانی پیشہ وہی مذہبی رسوم کی ادائیگی۔ مجوسیت۔ متقا۔ مجوسی طبقہ کسی زمانے میں سیاسی اقتدار کا مالک بھی رہ چکا تھا۔ مگر بعد میں ان کے پاس صرف مذہبی پیشوائی (ہرمینیت) رہ گئی۔ مگر وہ اس پیشے کی بدولت بہت محترم و معزز تھے۔ عوام کے علاوہ بادشاہ بھی ان کے علم و فضل، جنت مرتر اور ڈوٹے لڑکے وغیرہ کے باعث اکثر ان کے دست نگر رہتے تھے حکام اور بادشاہ غیر معلوم زمانے سے نجوم و سحر پر عقیدہ رکھتے چلے آئے ہیں۔ شاہی درباروں میں نجومیوں اور فال گیروں کا بڑا اثر و رسوخ چلا آیا ہے۔ بعض حکام تو ان سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ انجام ہی نہیں دیتے تھے۔ شناہے کہ بھارت میں اب تک برہمنوں سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ اس سبب سے جو کس کو شاہی درباروں میں عمل و دخل حاصل تھا۔ بادشاہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ انہی دعاؤں اور بعض عملیات سے بلاؤں کو دفع کرتے ہیں، مجوسی قدیم آریاؤں کا مانند سورج اور آگ کی پوجا کرتے تھے۔ وہ تجر خواب اور لہجہ شناسی کے بھی ماہر خیال کئے جاتے تھے۔ ویسے تو سورج پرستی اور آتش پرستی وغیرہ دنیا کی کئی مشرک قوموں میں بطور قدر مشرک جاری رہی ہے، لیکن ممکن ہے کہ یہ معیشت ایران اور ہندوستان میں آریاؤں کے اصل وطن وسط ایشیا سے ان کے ساتھ آئی ہو۔

ایران قبل از زرتشت | سورج، چاند، آگ، پانی ہوا اور زمین کی پوجا ہوتی تھی۔ کئی جگہ درختوں کو بھی پوجا جاتا تھا۔ درخت اور پہل کے درخت کا تقدس بلکہ مجوسیت ہندو مذہب میں بھی رہی ہے، بلکہ اب تک موجود ہے، اسی طرح اسلاف پرستی بھی عام تھی۔ بزرگوں کی ارواح کو خوش کرنے اور انہیں راحت پہنچانے کے لئے کئی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ ان کے نام کے بت بنائے جاتے۔ انہیں عبادت گاہوں میں سجاایا جاتا اور ان کے سامنے رسوم پرستش بجالائی جاتی تھیں۔ مرد ریام کے ساتھ یہ کام ایک خاص طبقہ انجام دینے لگا۔ غالباً یہی مذہبی طبقہ آگے چل کر مجوس کہلایا۔ پھر اس لفظ کے معنی اور استعمال میں وسعت پیدا ہوئی۔ اور مجوسی ایک مذہب کہلا گیا۔ ایرانیوں کے معبودوں میں کسی فرضی دیوتا بھی شامل تھے۔ ان کے لئے قربانیاں دی جاتی ہیں ان کے پہل اور مجید تیار کئے جاتے تھے۔ بعض دیوتا خاندانی ہوتے تھے۔ اور بعض عوامی۔ مثلاً متقا ایک عوامی دیوتا تھا۔ متقا کی پوجا کا وجود ہندوستان میں بھی ملتا ہے۔ اور متقا نامی شہر غالباً اسی کے نام پر موسوم ہوا ہے۔ ہندوستانی اور ایرانی آریاؤں کے معبود اور دیوتاؤں میں

بہت کچھ مشابہت بھی پائی جاتی تھی۔ سبب یہ تھا کہ یہ دونوں طبقے اپنے اصل وطن وسط ایشیا میں ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ وہیں سے دیونا پورستی ان کے ساتھ آئی اور جہاں جہاں یہ لوگ پہنچے ان فرضی خداؤں کو بھی ساتھ لے گئے۔ ایران میں سائنڈوں اور بعض مڑٹ دیویوں کی پوجا بھی ہوتی تھی۔ زرتشت نے اس صورت احوال کے خلاف سخت احتجاج کیا اور کافی جدوجہد کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے نبیوں عاموس اور یسعیاہ کا ہم عصر تھا۔ جو اپنی قوم کو شرک و خرافات کی دلدل سے نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ عین ممکن ہے کہ زرتشت پر انہی انبیاء کی تعلیم توحید کا اثر پڑا ہو اور انہی کی مانند اس نے ایران میں توحید الہی کا پرچم بلند کیا ہو۔ واللہ اعلم

حالات زندگی ۵۵۳ قبل مسیح میں واقع ہوئی۔ مولفہ و منشاء مغربی ایران کا شہر ہے تھا۔ والد کا نام پورا شاسپ تھا۔ پارسیوں (موجودہ زرتشتیوں) کی روایت کے مطابق مجوسیوں کو اپنے علم نجوم کے حساب سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بچہ اگر زندہ رہ گیا تو مستقبل میں ان کے مذہب کی بربادی کا باعث ہوگا۔ اس بناء پر انہوں نے اسے آگ میں ڈال دیا مگر وہ نہ جلا اور صحیح و سلامت الاؤسے باہر آ گیا۔ اس بناء پر اسے شہید ابراہیم بھی کہا گیا ہے۔ اہل ایمان کو آگ میں جلانے کے واقعات تو متعدد بار پیش آئے ہیں۔ مگر الاؤسے زندہ و سلامت باہر نکل آنے کا ذکر قرآن میں حضرت ابراہیم کے سوا کسی اور کے متعلق نہیں آیا۔ تاریخ نے ایک عظیم یمنی تابعی ابو حازم دقین بن سعد ہکے متعلق بھی بتایا ہے کہ اسے جھوٹے بنی اسود غسی نے اپنے اوپر ایمان نہ لانے کے جرم میں سپرد آتش کیا تھا۔ مگر وہ معجزانہ طور پر بچ نکلے اور اسود نے انہیں مین کی حدود سے نکلوا دیا تھا۔ ابو حازم مدینہ میں ایسے تھے اور صحاح کی کئی روایات ان سے مروی ہیں۔ وہ بالعموم سہل بن سنان انصاری سے روایت کرتے ہیں۔ امام ابن کثیر نے البدایہ میں ابو حازم کے واقعات درج کئے ہیں۔ یہ امر حیرت ناک ہے کہ بعض دیگر اقوام میں بھی اس سے ملتے جلتے واقعات کا چرچا موجود ہے۔ مثلاً ہندوؤں میں سنت پر جلد کا اور پارسیوں میں زرتشت کا۔ زرتشت کی زندگی کے حالات بالعموم پرودہ خفا میں ہیں، بالخصوص ابتدائی حالات۔ بعض روایات کے مطابق اس نے اپنے وقت کے ایک عظیم فلاسفر استاد بزرگذا سے مذہب اور طب وغیرہ کی تعلیم پائی۔ وہ شروع سے ہی سوچ بچار کا عادی اور خادم خلق تھا۔ بیس سال کی عمر میں پہاڑوں پر گوشہ نشینی اختیار کر لی اور وہیں پچھڑے عرفان یا الہام حاصل ہوا تھا۔ اب وہ توحید الہی کی منادی میں مصروف ہو گیا۔ قوم بت پرست، وہم و خرافات پرستی اور دیونا پرستی

کی عادی تھی۔ لہذا ایک چچا زاد بھائی کے سوا کسی نے اس کا پیغام قبول نہ کیا۔ زرتشت غیر مرنے موجود کی دعوت دیتا تھا۔ جب کہ لوگ پیکر محسوس کے غور کر رہے تھے۔ عوام سے مایوس ہو کر آخر وہ شاہ بلخ گشت سب سے ملا۔ اس کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ شاہ نے پہلے تو خود اس سے بحث و مناظرہ کیا اور پھر درباری علماء اور مملکت کے فضلاء سے اس کی گفتگو کرائی۔ اس بحث و مذاکرہ میں زرتشت کی فتح ہوئی۔ درباریوں نے جب دیکھا کہ بادشاہ زرتشت کا مذہب قبول کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا تو انہیں خدشہ پیدا ہوا کہ اس صورت میں ہمیں یہ نیا مذہب قبول کرنا پڑے گا۔ درباریوں نے اسی اور امارت و وزارت سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ بھرے دربار میں مذہبی علماء کے ۵۰ سوالات کے جواب زرتشت پہلے ہی دے چکا تھا۔ اب سازش کر کے بادشاہ کے کان بھرے گئے۔ کہ یہ شخص جاوید اور شجہ ہاڑ ہے۔ درباری سلفہ نشین اور عداوتی اکھاڑ بھڑاڑ بڑی خوفناک چھیڑ ہے۔ بادشاہ نے زرتشت کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ اتفاق سے اپنی دلوں میں بادشاہ کا نہایت محبوب گھوڑا شدید بیمار ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی حیات مال گلیں سلوک کر پیت کے ساتھ چٹ گئیں۔ بادشاہ بہت پریشان ہوا۔ کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہوا۔ زرتشت نے شاہ کو پیغام بھجوایا کہ اگر وہ میری چار شرطیں قبول کرے تو میں گھوڑے کا روحانی علاج کر کے اسے تندرست کر دوں گا۔ بادشاہ کو وہ شرطیں قبول کرنی پڑیں۔ وہ شرائط یہ تھیں۔ پہلی ٹانگ کی درستی پر بادشاہ مجھ پر ایمان لے آئے، دوسری کی درستی پر اس کا بیٹا اسفندیار بھی ایمان لائے۔ اور اس کے مذہب کی حاکمیت کا وعدہ کرے۔ تیسری ٹانگ کے سیدھا ہونے پر ملکہ بھی ایمان لائے۔ اور چوتھی ٹانگ کی درستی پر ان سازشیوں کے تمام ظاہر کئے جائیں جو اس کی گرفتاری میں ملوث تھے۔ زرتشت نامہ — پارسیوں کی کتاب — کا بیان ہے کہ گھوڑا تو زرتشت کی دعا سے تندرست ہو گیا مگر بادشاہ نے بھی اس سے چار مطالبے کئے: پہلا یہ کہ شاہ کے انجام کا حال بتایا جائے۔ دوسرا یہ کہ آخرت میں اس کا مقام اسے دکھایا جائے۔ تیسرا یہ کہ اسے حاضر و غائب کا علم دلایا جائے۔ اور چوتھا یہ کہ قیامت سے قبل اس کی جان نہ نکلے۔ نگاہیہ گرفتار اپنے نورانی چمک دمک کے ساتھ شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔ انہیں دیکھ کر شاہ اور درباری ڈر گئے مگر قریب سے آواز آئی کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف تجھے یہ حکم دینے آئے ہیں کہ زرتشت کا دین قبول کر لو کیونکہ وہ سچا ہے۔ اس پر شاہ گشت سب اور درباریوں نے زرتشت مذہب کی قبولیت کا اعلان کر دیا۔ جہاں تک اس افسانے کی حقیقت کا سوال ہے اس کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ مگر تاریخ یہ منور بتاتی ہے کہ شاہ بلخ زرتشت کا پروردگار اور حامی بن گیا تھا۔ شاہی سرپرستی میں دین زرتشت نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ بادشاہ نے

اس مذہب کی اشاعت میں ذاتی دلچسپی لی اور حکومت کے ذرائع و وسائل اس مقصد میں لگا دیئے۔ شوقی تبلیغ میں شاہ نے نوردان میں بھی یہی مذہب پھیلانا چاہا۔ — معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایران اور توران دو الگ الگ مملکتیں تھیں، شاہ توران کے انکار پر جنگ ہو گئی۔ یہ جنگ زرتشت کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ ایک تورانی فوجی نے — جو کسی طرح قتل کی نیت سے اس کے پاس آ پہنچا تھا، خنجر سے اسے ہلاک کر ڈالا۔

زرتشت کی تعلیمات ہمارے پاس جس قدر تاریخی دلائل و وسائل موجود ہیں، بعد میں پیدا ہونے والی بدعات و اختراعات کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو ان کی روشنی میں

یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زرتشت کی تعلیم توحید خداوندی کی بنیاد پر قائم تھی۔ اس نے مظاہر فطرت کی پرستش، بت پرستی، ارواح و اشجار کی پوجا، دیوی دیتاؤں پر عقیدہ، آگ کی پرستش حیوان پرستی اور تمام مراسم شرک کی سختی سے تردید کی تھی۔ ثنویت — دو خداؤں کا اعتقاد — بھی اس کی تعلیم کا حصہ نہ تھی۔ بلکہ ہمیں اسے دین زرتشت میں آتش پرست جمہوریوں نے داخل کر دیا۔ اسی طرح آج پارسیوں کو آتش پرست مانا جاتا ہے۔ اور اسلامی لٹریچر اور تاریخ میں بھی ان لوگوں کو مجوس ہی کا نام دیا گیا ہے۔ مگر یہ لوگ زرتشت کے بعد ہی اس مجوسی — قدیم مجوسی — شرک کو دین زرتشت کا حصہ بنانے میں کامیاب ہو سکے۔ زرتشت کے ہاں اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی ذات و صفات کا واضح تصور، آخرت کی زندگی، جنت و دوزخ، فرشتوں پر ایمان غرض تمام وہ بنیادی عقاید جو شروع سے انبیاء کی تعلیم کی بنیاد رہے ہیں، یہیں صراحت سے ملے ہیں۔ وہ خیر کی قوت کے ساتھ شر کی قوت اور شیطان کا قائل تو ضرور ہے مگر شر کی الوہیت و معبودیت کا قائل نہیں۔ قوت خیر کا قوت شر پر بالآخر غالب آنے کا تصور خود بتاتا ہے کہ پہلی قوت الہی ہے۔ اور دوسری شیطانی، لہذا معبود پرستی صرف ایک ہے۔ شیطانی قوت اپنے اندر کوئی خدائی یا معبودیت نہیں رکھتی۔ یہ انسان کی کوتاہی علم و نظر ہے کہ وہ اسے بھی معبودیت کا مقام دے دے۔

یہ بات واقعی افسوسناک ہے کہ دنیا کی بعض دوسری تعلیم شعیتوں کی طرح زرتشت کے گرد بھی دیومالائی حکایات اور وہم و خرافات کے انبار لگا دیئے گئے جن کی وجہ سے اس کی شخصیت اور تعلیمات کی اصلیت کو پہچاننا دشوار ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب و سنت کی مراحت و وضاحت کی عدم موجودگی کے باعث ہم دین زرتشت کو الہامی مذاہب و ادیان کے زمرے میں شمار کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن یہ کہنا سراسر بے انصافی اور کوتاہی علم پر مبنی ہو گا کہ دین زرتشت ثنویت یا آتش پرستی کا مذہب تھا۔ اس کے برخلاف اس کی تعلیمات کا بخور مطالعہ کیا جائے

توصاف نظر کرتا ہے کہ یہ دعوت خالص توحید اور اسلامی تعلیمات کی دعوت تھی۔ زرتشت کے نام و نسب اور قبیلہ و وطن کی مانند اس کی تعلیمات میں اختلاف کا باعث ہمارے خیال میں یہ ہوا کہ ثنویت دوسرے تمام ایرانی مذاہب مثلاً مجوسی مذہب، مانوی مذہب اور قدیم آریائی مذہب میں ایک قدر مشترک کے طور پر جاری و ساری رہی ہے۔ دین زرتشت میں داخل ہونے والوں نے اسے اس مذہب کا بھی جزو بنا ڈالا اور اب یہ مذہب بھی ثنویت سے ہی پہچانا جائے گا۔ دوسرے سبب وہ انقلابی فطیبت و فرائض جن سے زرتشت کے مذہب کو گزرنی پڑا۔ کبھی شاہی پرستی حاصل ہو گئی اور اسے سلطنت کا سرکاری مذہب بنایا گیا۔ کبھی اس کے مخالفوں کا غلبہ ہوا تو انہوں نے بزرگ پشیر اس کے پیروں اور تعلیمات و علامہ کو مٹانے کی پوری کوشش کی نتیجہ یہ نکلا کہ اصل تعلیمات یا تو غیت رہو ہو گئیں یا ان میں تحریف اور تغیر و تبدل واقع ہو گیا۔ یہ سبب یہ ہوا کہ اس مذہب کے فرشتوں اور کتب و صحیفہ میں تعلیم و عقائد اور اعمال و عبادت کے باب میں تضاد پایا جاتا ہے۔ انہیں پڑھ کر تشویش ہوتی ہے اور بعض لوگ اس مذہب کو شرک و کفر اور آتش پرستی کا دین ٹھہرا دیتے ہیں۔

ان اسباب میں سے جہاں تک پہلے کا تعلق ہے، ایرانی مذاہب میں ثنویت کا وجود اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ دین زرتشت کو بھی انہی کی صف میں کھرا کر دیا جائے۔ عقلی و فطری دلائل اس کے خلاف موجود ہیں تاہم صحیح یہی بتاتا ہے کہ زرتشت کے زمانے میں مجوسی اس کے خلاف رہے تھے۔ بلکہ انہوں نے تو ایک روایت کے مطابق زرتشت کو آگ میں جلا دینے کی بھی کوشش کی تھی۔ اگر زرتشت عقیدہ ثنویت میں ان کا سم نہ ہوتا تو وہ کاسے کو ایسا کرتے؟ بعض اہل تحقیق کا خیال ہے کہ مجوسی ثنویت اور زرتشت کی ثنویت میں ایک واضح فرق پایا جاتا ہے۔ مجوسی اور مانوی مذاہب تو صرف خداؤں کے قائل ہیں۔ خالق خیر اور خالق شر۔ بیروان و دہرین کہ ان کی قوانین مساوی ہیں۔ اور دونوں متوازی لائنوں پر کائنات کے نظام میں کار فرما ہیں۔ لیکن زرتشت جس ثنویت کا قائل ہے وہ صرف اس حد تک ہے کہ خالق خیر اور ہے اور خالق شر اور۔ آمیزہ مزد اور انگریز۔ اب وہ دونوں کائنات میں اپنا اپنا کام کر رہے ہیں مگر چونکہ خیر بالآخر شر پر غالب آئے گی لہذا عبادت کے لائق صرف خالق خیر۔ بیروان و دہرین مزد ہے۔ نہ کہ خالق شر۔ آہیں، انگریز۔ لیکن اگر ہم ان حضرات کی تحقیق کو مان لیں تو ہر مزد قادر و مطلق نہ رہا، صرف عبادت کی حد تک تو وہ خدا ہے مگر خلق کی حد تک اسی کا ملکہ کا ایک دوسرا خدا بھی موجود ہو گا۔ یہ بات زرتشت کی توحیدی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ عقیدہ ثنویت (چاہے وہ کسی شکل میں ہو اور کسی حد تک ہو) زرتشت

کی تعلیم کا حصہ نہ تھا بلکہ بعد کا اضافہ ہے۔

اب رہا دوسرا سبب توبہ واقعی ایک مغفول سبب ہے مگر اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ ثنویت تعلیمات زرتشت کا حصہ یا بنیاد رہی ہے۔ انقلابات دہرے تو یہ ہودیت و نصرانیت جی کا اصل نام اندو ستھو ان صرف اسلام تھا۔ یہ نام بھی بعد کی پیداوار ہیں۔ — علیحدہ الہامی مذاہب میں تحریف اور ترمیم و اضافہ کر کے شرک و تخلیف اور الوہیت و اہلیت انبیاء کے عقائد ان میں داخل کر دیئے تھے۔ مذہب زرتشت جی اگر انقلابات دہر کا شکار ہو کر بدل گیا ہو تو لائق تعجب نہیں۔ اور دیشوریا بکان کے دور حکومت میں زرتشتی مصائف و کتب کا جلا دیا جانا اور اس مذہب کے پیروؤں پر مصائب و شکنجہ کا نزول ایک تاریخی حقیقت ہے جو عین ساسانی عہد میں جب پھر سرکاری سرپرستی اس مذہب کو حاصل ہوئی تو از سر نو ان دساتیر و کتب کو مدون کیا گیا۔ اب زرتشت کا زمانہ کچھ بعید ہو چکا تھا۔ مجوسی خود اس مذہب میں داخل ہوئے اور اس پر جو سیت کی چھاپ لگادی۔ ان کتابوں میں جو تضاد پایا جاتا ہے اس کا باعث بھی گردشِ دواں اور مجوسی سازش کو ہی قرار دیا جانا قریب قیاس ہے۔ تحریف و تغیر تو الہامی کتابوں — تو رات و زبور اور انجیل — میں بھی راہ پا چکی ہے اور خود یہودی و نصرانی اہل علم اس کا کھلا اعتراف کر چکے ہیں۔ پھر ایک ایسا مذہب جس میں توحید کی تعلیم ہونے کے باوجود ہم اسے بدیں سبب الہامی نہیں ٹھہرا سکتے کہ اس کا کوئی معنوس اور یقینی ثبوت نہیں ہے، اس میں اگر تحریف اور ترمیم و اضافہ راہ پائی ہو تو لائق تعجب نہیں۔

بہر حال ہم مبنی غالب کی بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ زرتشت کا مذہب اصل میں توحید کا دین تھا۔ ثنویت اور آتش پرستی، بلکہ دیوی و دیوتاؤں تک کی پرستش اس میں بعد میں داخل ہو گئی۔ خیر و شر کی قوتوں کا بالمقابل ہونا اور ابتداء سے ان کا مقابلہ کرنا نہیں مانتا؛ فقط اتنا مانتے سے ثنویت لائ نہیں آئی۔ زرتشت کی موجودہ تعلیمات کی کتابوں مثلاً وکسائیر، گاتھا اور زنداوستا وغیرہ سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ خیر کے غلبہ پانے کی اٹھید رکھتا ہے اور شر کو بحیثیت مجبور کے نہیں بلکہ ایک قوت کے طور پر مانتا ہے۔ اسلام نے بھی، نیز ہودیت نے، شر کو شیطان — ابلیس — کی طرف منسوب کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اسلام شیطان کی شخصیت کا قائل ہے۔ جو منبع شرارت و خساد ہے۔ خاتمی شر نہیں۔ اور زرتشت اسے ایک قوت ٹھہراتا ہے۔ لیکن صرف اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا جس کی بنا پر اسے ثنویت کا معتقد قرار دیا جائے۔ پس زرتشت کا موجد ہونا اور خدا کی ذات و صفات کا قائل ہونا ایک ایسا امر ہے جو اس کی تعلیم سے ظاہر ہے۔ زرتشت نے خدا کو آہور مزدا کہا ہے جس کا معنی ہے: خداوند نور۔ قرآن کہتا ہے:

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ زرتشت نے خدا کی جو صفات بیان کی ہیں وہ

یہ ہیں: (۱) خالق کائنات (۲) ازل وابدی (۳) سب سے اعلیٰ و برتر (۴) غیر متغیر (۵) رحیم (۶) پاکیزہ ترین (۷) شہسوار طہارت و نفاست (۸) خود مختار (۹) مالک کل (۱۰) عاقل ترین، عقل کل (۱۱) ہر چیز کو جاننے والا (۱۲) سب کچھ دیکھنے والا (۱۳) رازوں کا جاننے والا (۱۴) واحد ذاتی نہ کہ عدوی (۱۵) اس کا ہم سرومیتا نہیں (۱۶) بے مثل و بے نظیر (۱۷) حواس کی گرفت سے باہر (۱۸) ہم سے ہماری ذات سے بھی قریب تر (۱۹) مہربان و بخشنده (۲۰) غیر فانی (۲۱) منصف و عادل (۲۲) حافظ و نگہبان (۲۳) ہر چیز سے قوی تر۔

ان صفات کو پڑھ کر اندازہ کیجئے کہ کیا یہ وہی صفات نہیں جنہیں انبیاء نے اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا ہے؟ اور ان صفات کا ماننے والا کیا حقیت کا قائل ہو سکتا ہے؟
زرتشت کے مذہبی نوشتے و ساتیریں فرشتوں کے لئے سرود اور فرشتے کے الفاظ موجود ہیں۔ اور ان کی بعض صفات کا بھی ذکر آتا ہے۔ اسی طرح وہ بحف بعد الموت، آخرت کی زندگی اور ثواب و عقاب، جنت و دوزخ کا بھی قائل ہے۔ یہ تعلیمات بالکل اسلام کی تعلیم کے مطابق ہیں۔ اگر ان کتابوں میں ان عقائد کی تفصیلات کے سلسلے میں کوئی فرق و امتیاز ہو تو ہمارے گزشتہ بیان کے مطابق وہ بالکل قرین قیاس ہے۔

زرتشت کی اخلاقی تعلیمات | زرتشت کی اخلاقی تعلیمات میں طہارت افکار، صدق و راست بازی، ظاہری و باطنی صفات، دوسروں کی مالی و اخلاقی امداد و نصرت جیسے اخلاقی فضاائل و شائے کا ذکر آتا ہے۔ ہر دین و مذہب اور ہر قوم و ملت کے مذہبی سربراہ اور مصلح بھی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ زرتشت نے رہبانیت کی شدید مخالفت کی ہے۔ وہ عائلی زندگی کو زائل کرنے اور معاشرتی صلاح و فلاح کا داعی تھا۔ اس کی تعلیمات میں محنت و مشقت کرنے اور ہمت سے روزی کمانے کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ مگر یہ امر بڑا افسوسناک ہے کہ اس کے ماننے والے موجودہ مذہبی کتب و دساتیر کی زد سے — محرمات سے نکاح جائز تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شئی بھی بعد میں بڑھائی گئی تھی کیونکہ مجوس اور دیگر ایرانی مذاہب میں ایسے نکاح کا عام رواج تھا۔

جیسا کہ بیان ہو چکا زرتشت کے زمانے میں شاہ بدیع گشتاپ مذہب زرتشت کا ارتقام | نے اس مذہب کو قبول کیا اور پھر وہ اس کا پرجوش داعی و مبلغ بن گیا۔ اس کی جدوجہد سے یہ مذہب نہ صرف ایران میں بلکہ اس سے باہر بھی اشاعت پذیر ہوا۔ اس مذہب کا دوسرا سربراہ سست اور سرگرم داعی سائترس (گورش) تھا جو جدید ترین

تحقیقات کے مطابق ذوالقرنین کے نام سے قرآنِ عظیم میں سراہا گیا ہے۔ سورہ الکہف میں اس کا حال پڑھ کر راجح ہو جاتا ہے کہ یہ واقعات، یہ کردار و افعال اور یہ اقوال و افکار ایک بندہ مومن کے ہی ہو سکتے ہیں۔ سکندر مقدونی تاریخ کی محترم شہادتوں کے پیش نظر مشرک و بت پرست تھیں۔ جن لوگوں نے اسے ذوالقرنین بتایا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ مذہبِ زرتشت کا تیسرا سرپرست بادشاہ داریا ابن گرشاسپ ہوا ہے۔ (یہ گرشاسپ غالباً اوپر بیان شدہ شاہِ بلخ کے علاوہ کوئی اور شخصیت ہے)۔ اچھی صدی قبل مسیح میں ایرانی حدود کے اندر اور باہر بھی مذہبِ زرتشت عروج پر رہا تاہنچ شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ یہ مذہب یونان تک پھیل گیا تھا۔ زرتشت کے پچھ سو سال بعد سکندر اعظم کا حملہ ہوا۔ ایران پر قبضہ کرنے کے بعد اُس نے سارا زرتشتی لوگوں کو آتش لکڑیا۔ اب جو کتب و مصانف موجود ہیں یہ اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد زبانی یادداشتوں اور ذہنی لکڑی کا دش کی بناء پر وجود میں آئیں۔ تیسری صدی عیسوی میں ساسانی خاندان کا دور دورہ تھا۔ اس زمانے میں مذہبِ زرتشت کو از سر نو عروج حاصل ہوا مگر یہ عروج اُس پہلے غیر متبدل مذہب کا نہیں بلکہ جدید مدون شدہ عرف مذہب کا تھا۔ اسلامی فتوحات کے زمانے تک یہی حالت قائم رہی۔ جب اسلام کا دیلا ایران کی طرف بڑھا تو اس کی سادہ تعلیمات، سبے لوٹ عقیدہ توحید، مساواتِ انسانی کے نظریے اور اصل زرتشتی مذہب سے بہت کچھ ملتی جلتی تعلیم کو باعثِ اہل ایران دھڑا دھڑا اسلام لے آئے۔ آج کل پارسی — مذہبِ زرتشت کے مدعی — لوگوں کی تعداد ایران، ہندوستان اور پاکستان میں صرف چند لاکھ تک محدود ہے۔ یہ لوگ آتش پرست ہیں اور دینِ زرتشت میں بہت سی بدعات کو داخل کر چکے ہیں۔

زرتشتی مذہب کی کتابیں | یہ تو ایک مسئلہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس مذہب کی کتابیں ایک بار بالکل نابود ہو جانے کے بعد از سر نو محض زبانی یادداشت کی بناء پر لکھی گئیں لہذا تحریف اور ترمیم و اضافہ سے پاک نہیں رہ سکیں۔ اس بات میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ مذہبی کتابوں کو زبانی حفظ کرنے کا رواج مسلمانوں کے سوا کسی اور قوم میں نہیں رہا۔ لہذا انہیں کہا جاسکتا کہ زرتشتی مذہب کی کون کون سی کتابیں کتنی اور کہاں کہاں تحریف ہوئی ہے۔ اور کون کون سا حصہ تغیر و تبدل سے محفوظ ہے۔ جنابِ زرتشت کی اصل تعلیمات کچھ پیش نظر ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان کتابوں میں جہاں جہاں شرک و بت پرستی آتش پرستی، شتمنیت اور دہلوی دیوتاؤں کی تعظیم و تکریم کا بیان ہے وہ سچے ضرور الحاقی ہیں۔ مجوسیوں نے اپنے خاص مقاصد کی خاطر اور اپنے قدیم مذہب کی حمايت میں بے شمار وہم و خرافات اور دیومالائی افسانے تراشے ہوں گے جو آج کل مذہبِ زرتشت کی کتابوں کی زینت

ہیں۔ بہر صورت ان کتابوں کے نام یہ ہیں۔ (۱) دساتیر خرد (۲) دساتیر کلاں (۳) بلوستان خرد (۴) بلوستان کلاں۔ بلوستان پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ اور ہر حصے کا نام الگ الگ ہے۔ ان میں سے ایک حصہ زرتشت اور ایک پارتد کہلاتا ہے۔ ایک حصے کا نام گاتھ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ خود زرتشت کی تحریر ہے۔ گاتھ میں شرک کی آمیزش کم ہوئی ہے۔ مگر دوسرے حصے دیوی دیوتاؤں کی مدح و ثنا سے لبریز ہیں۔ یہ حصے ضرور مجوسیوں کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے آگ کی پوجا، زمین، بادل اور روشنی کے دیوتا وغیرہ کی پوجا بھی اس مذہب کی کتابوں میں داخل کر دی ہے۔ موجودہ پارسیوں میں بھی مذہب رائج ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی لٹریچر میں انہیں مجوس کا نام دیا گیا ہے۔ اس لفظ کا عام معنی آتش پرست ہی سمجھا جاتا ہے۔ ان کتابوں میں جناب زرتشت کے اصل عقیدہ آخرت کو تناسخ اور رجعت سے بدل دیا گیا۔ رجعت کے عقیدے کے دوسے لوگ ایک بار پھر اس دنیا آئیں گے۔ بعض مسلمان فرقے بھی اس عقیدہ رجعت سے متاثر ہوئے اور دھڑلے سے اپنی کتابوں میں اس کا اظہار کیا۔ مذہب زرتشت میں جنت و دوزخ کا نقشہ بالکل ڈرامائی اور دیومالائی انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اوپر بیان شدہ دوتا کے علاوہ ایک دوتا اور بھی ہے جسے اوستائے آخر *THE LATER AVISTA* کہا جاتا ہے۔ اس میں دیوی دیوتاؤں کی عظمت اور مدح و ثنا کا بیان ہوا ہے۔ زرتشت کا بیان کردہ ہورترز اس میں معبود کی حیثیت سے نہیں بلکہ غص ایک فرضی دیوتا کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ اسے فرشتوں کی عبادت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ صفات خداوندی کو فرشتے عطا کیا گیا اور پھر ان میں خدائی صفات دکھ دی گئی ہیں۔ اس کتاب نے قدیم ایرانی آریاؤں کے دیوتا متھر اور کئی اور دیوتاؤں کو نیز مظاہر قدرت کی پوجا کو داخل مذاہب کر دیا۔ اب وہ تمام چیزیں جن کی پرستش زرتشت نے موقوف کر دی تھی۔ از سر نو مذہب کا جزو بنادی گئیں جادو، منتر، ٹرنے ٹرنے پھر مذہب کا حصہ قرار پائے۔ جس طرح مہاتما بدھ کے بعد خود اسی کو معبود بنا لیا گیا تھا اسی طرح زرتشت کو بھی پجاریوں کا سرور اور نجات دہندہ تصور کیا جانے لگا۔ زرتشت کے مذہب توحید کا یہ خوفناک اور افسوسناک انجام انسانوں کی شرک پسندی اور اودھام پرستی پر ایک واضح برہان کی حیثیت رکھتا ہے۔

مذہب زرتشت کا زوال | ایک زمانے میں پورا ایران، وسط ایشیا اور قریبی ممالک کے کچھ حصے زرتشتی تحریک کے زیر اثر آ گئے تھے۔ اس کے اثرات عراق اور یونان تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن بالی مذہب کی وفات کے بعد جلد ہی ہی یہ تحریک زوال پذیر ہو گئی۔ مجوسیت کی قوت کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں جو اس نئے مذہب کو لوں

کھا گئی جیسے برہمنیت نے بدھ مذہب کو مٹ کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گاتھا زرتشت کی خود نوشت کتاب مٹی پر مناجات الہی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مقدس مجموعہ بھی تحریف سے بچ سکا۔ جہاں تک اس کی شرح و تفسیر کا تعلق ہے، مجوسیوں نے کچھ نیا کر اسے ثنویت، مظاہر پرستی، دیوتا پرستی، آتش پرستی اور ریت پرستی سے ملا دیا۔ زرتشت کی کامیابی کے زمانے میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ خاموشی سے کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہے۔ جو نبی موع ملا انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اور توحید و خدا پرستی کے ایک سیدھے سادے مذہب کو شرک اور مخلوق پرستی کا اکھاڑا بنا کر رکھ دیا۔ زرتشت نے آہور مزد کو قادر مطلق، خالقِ ظہر و باطن و معبودِ واحد بتایا تھا مگر بعد میں وہ ”خدا کے خدا نکان“ بن کر رہ گیا۔ اس کے تحت اور اس کے جلو میں بے شمار دوسرے خداؤں کی پوجا پاٹ کا رواج ہو گیا۔ مذہبی رسوم و عبادات میں شرک آگیا۔ زرتشت سے پہلے مڑوں کی لاشوں کو آبادیوں سے باہر لے کر رکھ دیتے تھے تاکہ انہیں جنگلی درندے اور فضا کے پرندے کھا جائیں۔ زرتشت نے یہ رسم موقوف کر کے مردے دفنانے کا سلسلہ شروع کر دیا مگر اس کے بعد پھر وہی پہلی وحشت ناک رسم شروع ہو گئی۔ سائرس اور ساسانی خاندان کی سرپرستی میں یہ مذہب پھلا پھولا لیکن سکندر اعظم کے حملے نے اس کا حال بہت تباہ کر دیا۔ جب اسلام کے ساتھ اس مذہب کا تصادم ہوا تو یہ ایران سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اس کے پیرو آج کل ہندو پاکستان کے ساحلی شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ اور کچھ ایران میں بھی۔ ایران میں ان کی تعداد کا اندازہ دس ہزار اور پاکستان و ہند میں تقریباً بارہ ہزار ہے۔ یہ لوگ تاجر ہیں اور بالعموم بڑے شہروں مثلاً کراچی، ممبئی، بمبئی اور احمد آباد میں بستے ہیں۔ آتش پرستی کے باعث انہیں آتش پرست کہا جاتا ہے۔ اور خود یہ پارسی کہلاتے ہیں۔ واللہ غالب علی امرہ

کنفیوشس کا مذہب

اس مذہب کو ماننے والوں کی ایک معقول تعداد کو جاپان میں بھی موجود ہے مگر اصلاً یہ چین کا مقامی اور قدیم ترین مذہب ہے۔ نئے سوشل انقلاب کے بعد کا حال ابھی واضح نہیں ہو سکا مگر اس سے قبل کے زمانے میں چین کے اندر بدھ مذہب کے علاوہ دوسرے مقامی مذاہب کا عمل دخل رہا ہے۔ ایک مائوازم اور دوسرا کنفیوشسزم۔ مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں مختلف آراء و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ بھی تاحال پوری طرح معلوم نہیں ہے۔ کہ کیونٹ انقلاب کے بعد ان کا چین میں کیا حال ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک بڑے صوبے سنگاپور

غالباً چینی ترکستان — میں مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے۔ پھر اخبارات میں یہ خبریں آتی رہیں۔ کہ یہی صوبہ زیادہ تر ثقافتی انقلاب کی زد میں رہا ہے۔ سا لہا سال تک اس صوبہ کو ثقافتی انقلاب کی آماج گاہ بنائے رکھا گیا ہے۔ سوشلسٹ کمیونسٹ اصطلاحات کو سمجھنے والوں کا خیال ہے کہ اب صوبہ بن گیا۔ لیکن میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں رہی۔ چین سے بھاگ کر قریبی ممالک یا عرب ممالک میں پناہ لینے والے چینی مسلمانوں کے بیانات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

چین کے قدیم مذاہب | ہر مذہب تو چین میں ہندوستان سے درآمد ہوا مگر اس کے دو مقامی مذاہب میں سے ٹاؤ آرم قدیم تر ہے۔ اس کے بعد قدامت میں کنفیوشس کے مذہب کا نمبر آتا ہے۔ لیکن اس امر میں کچھ الجھاؤ موجود ہے، کیونکہ بتایا گیا ہے کہ لاؤتسے، لاوتسے یا لاوتسے جو ٹاؤ آرم کا بانی تھا۔ وہ کنفیوشس کا ہم عصر تھا۔ مگر الذکر نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا، یہ دونوں مذہب کئی امور میں مشترک بھی ہیں۔ مثلاً مقامی روایات اور قومی و موردی اڈام و عرفات کی دونوں میں یکساں مہر مار ہوئی ہے۔ ٹاؤ کا لفظی معنی ہے طرز عمل، رویہ، یا طریقہ۔ پہلے یہ لفظ قارن قدرت یا انسانیت کی فطری رفتار کے معنی میں استعمال ہوا مگر بعد میں مذہب کا ہم معنی بن گیا۔ ٹاؤ آرم بنیادی طور پر ایک تعلیمی، اخلاقی اور سیاسی ضابطہ عمل ہے۔ اس ضابطہ پر مقامی روایات، موروثی رسوم اور قدرت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ چینی قدامت پرست ہونے کے باعث اسے بہت عزیز رکھتے ہیں ٹاؤ آرم کا بانی کنفیوشس کی مانند اپنے فلسفیانہ افکار اور حکیمانہ خیالات کے باعث بہت مشہور اور مقبول عوام رہا ہے۔ اس کے فلسفیانہ افکار کے ساتھ — فلاسفہ یوتان کی مانند — دیوبی دیناؤں، بخیر فی ارواح اور بزرگوں کی پرستش کو شامل کر کے ایک مذہب بنایا گیا جو امتیاز ماننے کے ساتھ ٹاؤت کے نام سے معروف ہو گیا۔

جہاں تک حکیم کنفیوشس کا معاملہ ہے، وہ بھی ایک دانشمند، فلسفی، سیاست دان اور مستحکم اخلاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ فلاسفہ یوتان کی مانند اس نے مقامی دیوبی دیناؤں، رسم و رواج، معاشرتی آداب اور ریت پرستی کو نہیں چھوڑا۔ مذہبی روایات سے تفرض کیا، بلکہ جہاں تک ہو سکا ان کے ساتھ معالمانہ رویہ اختیار کیا اور انہیں اپنی اخلاقی و سیاسی افکار و تعلیمات کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔ شاید یہ اس لئے کیا کرے کہ بدکاروں اور اس کے اصل کام میں رکاوٹ نہ پڑے۔ پھر جس طرح ہمیشہ ہوا ہے آگے چل کر یہ فلسفہ اور دانشمند افکار ایک مستقل مذہب کی حیثیت اختیار کر گئے۔ جس طرح ٹاؤ آرم چین کا قدیم ترین مذہب ہے۔ (یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ لاؤتسے سے بھی ہزاروں سال

پہلے سے چلا آرہا تھا۔ اُس نے صرف اُسے مرتب و مدون کرنے کا کام انجام دیا، اسی طرح کنفیوشس موجودہ سوشل انقلاب سے قبل تک وہاں کا عظیم ترین مذہب شمار ہوتا تھا۔ کنفیوشس کا نام مغرب سے درآمد ہوا ہے۔ اصل نام گنگت چو یعنی تعلیمات کنفیوشس ہے۔ اسے چو شیڈ بھی کہتے ہیں۔ یعنی علماء کی تنظیم۔ اس گروہ کی تاریخ کا سراغ 25 صدی قبل سے لگایا جاتا ہے۔ اور کم و بیش دو ہزار برس تک چین پر اس کی حکومت بھی رہ چکی ہے۔ لہذا ہر آنے والی حکومت اسی کی پیروی کرنے کی تدبیر مہی۔

حکیم کنفیوشس 551 تا 476 قبل مسیح | چھٹی اور ساتویں صدی قبل مسیح کا زمانہ وہ عظیم دور ہے جس نے دنیا کو مہاتما بدمھ (ہندوستان میں)

درگشت (ایران میں) اور کنفیوشس (چین میں) جیسے عظیم معلم، فلاسفہ اور بانیان مذاہب دیئے۔ کنفیوشس چین کے ایک ضلعی حاکم شولیان کے ہاں اس کے بڑھاپے میں پیدا ہوا۔ تین سال کی عمر میں کراپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ 15 سال کی عمر میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔ 19 سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ اور اولاد بھی۔ فوراً بعد وہ سرکاری ملازمت میں لے لیا گیا۔ بحیثیت اہل کار اس کا کردار بہت نمایاں رہا۔ اس نے عوام کی خدمت کی اور ان کے دل موہ لئے۔ 27 سال کی عمر میں ملازمت کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ اس نے نوجوانوں کو آداب حکومت اور صحیح اجتماعی و سیاسی کردار کی تربیت دینے کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ بہت سے لوگ اس کے شاگرد بن گئے جن میں شاہی خاندان کے بعض نوجوان بھی تھے۔ مزید مطالعہ اور تحقیق کی خاطر وہ دلراغلافہ پنچا اور شاہی کتب خانے سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس وقت فن موسیقی شاہی سرپرستی میں ترقی پذیر تھا۔ کنفیوشس نے اس فن میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ اسی جگہ اس کی ملاقات ٹاؤ آؤیم کے بانی لاؤتے سے ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کے مداح تھے۔ کنفیوشس نے اس سے بہت کچھ حاصل کیا اور عمر بھر اس سے متاثر رہا۔

اتفاق سے اسی سال حکومت میں انقلاب آگیا۔ وہ پہلی حکومت کا زبردست حامی تھا لہذا حکومت ترک کر کے گوشہ نشین ہو گیا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس زمانے میں اس کے مشاغل کیا رہے ہوں گے، کیونکہ اس کی زندگی کا یہ حصہ پردہ خفایں میں منور ہے۔ 55 سال کی عمر میں اسے دوبارہ ملازمت ملی جس سے اپنی ذہانت و دیانت کے بل پر ترقی کر کے وزیر عدالت کے عہدہ تک جاپنچا۔ اس نے جرائم کو ختم کرنے کے لئے دن رات محنت کی اور بہت کامیاب رہا۔ انصاف کو عام کیا، رشوت ستانی اور سفارش کا قلع قمع کیا۔ لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے۔ اس کے اثر و رسوخ اور ہرول عزیزی کے باعث بادشاہ اس سے خائف رہنے لگا۔ اور اُس سے بے رنجی کا رویہ اختیار کر لیا۔ کنفیوشس

با اصول ہونے کے ساتھ ساتھ قانون پسند پڑا من شہری تھا، جب اس نے شاہی روٹی بدلا ہوا دیکھا تو سبب کو بھانپ لیا۔ ملازمت ترک کر دی اور سیر و سیاحت کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ حالات موافق ہونے پر پھر وطن واپس لوٹا اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۱۷۶۵ یا ۱۷۶۸ قبل مسیح میں اس کی وفات واقع ہو گئی۔

کنفیوشس کی تعلیمات حکیم کنفیوشس کی تعلیمات میں ہمیں قدرت، آسمان اور نیکی وغیرہ

عذاب و ثواب، آخرت کی زندگی اور حیات و ممات کی حقیقت پر اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس حقیقت کے پیش نظر ماہرین مذاہب کا خیال ہے کہ وہ مذہبی مقتدا تو نہیں تھا البتہ معاشرتی و اجتماعی اور سیاسی مصلح و رہنما ضرور تھا۔ زندگی کے اجتماعی شعبوں، باہمی ہمدردی، انصاف اور اچھی حکومت، بہتر حاکم جیسے موضوعات پر اس کے ان بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ چونکہ اکثر اراکے زمانے میں اس نے خود ایک مثالی نمونہ پیش کیا تھا۔ اور لوگوں کو طرزِ جہان بینی اور آداب و رموزِ حکومت سکھانے میں بڑی دل چسپی لی تھی۔ اس لئے آگے چل کر وہ "بائی مذہب" منشور ہو گیا۔ اہل چین کے احوال پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دین و مذہب کے باپ ہیں بڑے آزاد خیال واقع ہوئے ہیں۔ ان میں مذہبی تعصب نہیں پایا جاتا۔ انہوں نے اپنی اجتماعی زندگی کے معاملات میں حکیم کنفیوشس کی تعلیمات کو ہمیشہ اعلیٰ مقام دیا ہے۔ کنفیوشس عوام میں رائج رسوم و روایات کو مٹانا نہیں چاہتا تھا بلکہ ان کی ایسی اصلاح کرنا چاہتا تھا کہ وہ اجتماعی زندگی میں دوسروں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکیں۔ اس کی تعلیمات مابعد الطبیعیاتی مسائل کے متعلق خاموش ہیں۔ وہ رعایا سے زیادہ حاکم کی اصلاح کا قائل تھا۔ اس کے خیال میں ایک نیک اور مثالی حاکم رعایا کی اصلاح کر کے اسے مثالی بنا سکتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ "حاکم کو اپنے نام کی لاج رکھنی لازم ہے" اس کا یہ بھی قول ہے کہ اچھی حکومت وہ ہے جس میں بادشاہ بادشاہ ہو، وزیر وزیر ہو، باپ باپ ہو، بیٹا بیٹا ہو۔ معاشرہ اس کے نزدیک ایک حکم خداوندی ہے جس کی ترکیب پانچ رشتوں سے ہوئی ہے: و بادشاہ اور رعایا، شوہر اور بیوی، باپ اور بیٹا، بڑا بھائی اور چھوٹا بھائی، بوجھ دوست اور دوست۔ اس کے نزدیک بڑی خواہشات انتشار و اضطراب کا باعث ہیں۔ مگر فطرت انسانی پر اعتماد رکھنا ضروری ہے۔ جب بھی انسانیت بیدار ہوگی لافالوئیت رحمت ہو جائے گی

کنفیوشس کی جماعت جماعت سے ہماری مراد یہ نہیں کہ معروف معنوں میں اقتدار حاصل کرنے یا سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے اس نے کوئی

پارٹی بنائی تھی۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے اپنے شاگردوں یا حلقہ میں کا ایک حلقہ قائم کیا تھا۔ اس جماعت کو وہ رموز و نشاندہی، اسرار اخلاق و سیاست اور آداب زندگی سکھاتا تھا۔ ان کی تعداد تین ہزار تک بتائی گئی ہے۔ جن میں سے ۱۶۵، ۱۶۶ کو وہ خود غیر معمولی قابلیت کے علماء کہتا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت اس کے پاس حاضر رہتے تھے۔ اس کی زندگی اور اقوال و افعال کا گہرا مطالعہ کرتے تھے۔ سمجھتے ہیں کہ اپنے حقیقی فرزند کی موت پر اس نے رنج و غم کا اظہار نہیں کیا لیکن عزیز شاگردوں کی موت اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس کی موت پر شاگردوں نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا، بعض قبر کے نزدیک جھوٹیاں ڈال کر کئی سال تک وہیں پڑے رہے۔ اس کی قبر کے قریب سنگ مرمر کا کتبہ نصب کیا گیا ہے جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

”بہترین حکیم اور قدیم معلم“

کنفیوشس لطیف اس عظیم دانش مند و حکیم کا اہل چین پر گہرا اثر پڑا ہے۔ اس نے معروف اصولوں میں کوئی دین و مذہب پیش نہیں کیا بلکہ ایک اخلاقی و معاشرتی اور نیم سیاسی ضابطہ عمل پیش کیا تھا۔ وہ موروثی رسوم اور صدیوں سے رائج شدہ مذہبی اعمال پر بھی عمل کرتا رہا، مثلاً ارواح پرستی اور آبا پرستی۔ اہل چین ارواح جیستہ کے بڑے قائل ہیں اور ان سے خائف رہتے ہیں۔ اسی سبب سے وہ ارواح کی پرستش کرتے ہیں۔ علیٰ هذا القیاس ان میں فطرت کی پوجا کبھی رواج چلا آیا ہے۔ کنفیوشس نے ان کے عقاید یا مراسم عبادت کا کوئی رد نہیں کیا۔ ان کے ماننے والوں کی نامی ایک فرضی معبود یا خدا کی پرستش ہوتی ہے۔ اور اس کے گرد بے شمار اداہم و خرافات کا مالہ بنا ہوا ہے۔ تاؤ غیر شخصی خدا ہے جو قوت و قدرت اور فطرت کے معنی میں پوجا جاتا ہے۔ جینیوں میں ایک قسم کی ثنویت کا عقیدہ بھی موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر چیز میں ثنویت ہے مثلاً نور و ظلمت، آسمان و زمین اس ثنویت کے مظاہر ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک ثنویت کے مخالف مظاہر یا وجود متخالف ہونے کے ہم آہنگ ہیں۔ پہلی قوت — مثلاً روشنی اور آسمان یا **YANG** کہلاتی ہے۔ اس قوت کی صفات یہ ہیں: کروہ، مثبت ہے، مذکر ہے، سفید ہے، گرم ہے، خشک ہے اور متحرک ہے۔ دوسری قسم کی قوت **YIN** کہلاتی ہے جو پہلی کے بالمقابل: منفی ہے، مؤنث ہے، سیاہ ہے، سرد ہے، نرم ہے اور غیر متحرک ہے۔ یا ٹھک تو آگ اور دھوپ کا جو ہر ہے اور آبی سایہ اور پانی کا جو ہر۔ یہ دونوں قوتیں بعض حالات میں باہم تبدیل بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً لکڑی بن ہے مگر آگ میں ڈالنے سے یا ٹھک ہو جاتی ہے۔ چکنی ان دونوں قوتوں کا ایک دائرے میں ظاہر کرتے ہیں، یا ٹھک کر سفید اور بن

کو سیاہ، دونوں نصف نصف مگر اطراف میں ہم آغوش۔
کنفیو شس کے شاگردوں نے اس کی تقریروں اور مقالات کو جمع کیا تھا کہتے ہیں کہ تاریخی
دستاویزات کی ایک کتاب پر کنفیو شس نے ایک مقدمہ لکھا تھا۔ علاوہ انہیں بہار و خزاں پر
ایک نظم بھی لکھی تھی جو غیر مکمل رہ گئی۔

(۱) اعلیٰ آدمی جو چیز اپنے اندر تلاش کرتا ہے اونی اسے دوسروں میں ڈھونڈتا
حکیمانہ اقوال ہے (۴) تفکر کے بغیر علم ایک بیکار محنت ہے اور علم کے بغیر فکر خطرناک ہے۔
(۵) محتاط آدمی سے فاش غلطی نہیں ہوتی۔ (۶) آدمی اصولوں پر غالب آسکتا ہے مگر اصول آدمی پر
غالب نہیں آسکتے۔

کنفیو شس کے خاصائص (۱) وہ مشرق بعید کا قدیم ترین مذہب ہے (۴) یہ دراصل
حکمرانوں نے انفرمید جانا اور اس پر عملدرآمد کیا ہے۔ (۵) کہتے ہیں کہ موجودہ سوشل انقلاب نے
اسے طاقت سے محروم کر دیا ہے۔ مگر وہ عوام کے دلوں سے ابھی تک محو نہیں ہو سکا۔ (۶) اس کی
تعلیم عام فہم، سادہ اور ہلچلکدہ ہے۔ اس کے ساتھ فطری بھی ہے۔ (۵) چین کے علاوہ جاپان
میں بھی اس مذہب کا کافی اثر پایا جاتا ہے۔ کرڈروں جاپانی اس کے معقد ہیں۔ (۶) یہ معروف
معنوں میں مذہب نہیں اس لئے اس کی کوئی متعین بنیاد نہیں۔ (۷) اس قدر ہلچلدار، ملنسار اور
صلح پسند ہے کہ بد مذہب کے ساتھ غلط ملط ہو گیا۔ بعد میں جب اسلام اور عیسائیت نے چین
کی سرزمین پر قدم رکھا تو باسانی انہیں دیاں جگہ مل گئی۔ مقامی رائج مذاہب کے ساتھ ان کا
کوئی واشگاف تقادم نہیں ہوا۔ چینی لوگ روادار اور غیر متعصب ہیں۔ ہر مذہب کی رسوم
و عقائد کو باسانی قبول کر لیتے ہیں۔ آبا پرستی فطرت پرستی، منظر فطرت کی پوجا، وہم و خرافات
اور دیوی دیوتاؤں کا تصور سرچیزان میں آن گھسی ہے۔ کئی لوگ بیک وقت کنفیو شس، مانڈازم
اور بد مذہمت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ بعض عبادت گاہیں متصل بلکہ مشترک ہیں۔ ایک مذہب کے
مطابق عبادت سے فارغ ہو کر ایک دروازے سے باہر نکلے اور دوسرے دروازے سے دوسری
عبادت گاہ میں چلے گئے۔ وہاں جا کر دوسرے مذہب کے مطابق عبادت کر لی۔ "اللہ اللہ
خیر صلہ" (۸) اس مذہب میں روحانی تسکین و اطمینان کا کوئی سامان نہیں لہذا اسے مادی
مذہب کہا جاتا ہے۔ غالباً اسی لئے چین میں کمیونزم کا عمل دخل نسبتاً باسانی ہو گیا ہے۔ اس میں
کوئی "مذہبی عبادت" یا مابعد الطبیعیاتی فلسفہ و عقیدہ نہیں پایا جاتا۔ (۹) سیاسی آثار چڑھاؤ

اور حکمرانوں کے اُلٹ پھیر میں یہ مذہب ہمیشہ انقلابات کی زد میں رہا ہے۔ اس کی کتابوں کو ایک زور میں جلا دیا گیا تھا اور اس کے پیروؤں پر تشدد بھی ہوا، مگر جب دوسری حکومت آگئی اور اس نے موافقت کا اظہار کیا تو از سر نو زندہ ہو گیا۔ پھر حالات کا رخ پلٹا تو خواب غفلت کا شکار ہو گیا۔ (۱۵) اس وقت تو معلوم نہیں کہ اس مذہب کا جیتن میں کیا حال ہے۔ مگر سوشلسٹ انقلاب سے پہلے تک یہ وہاں کے باشندوں کی اکثریت کا مذہب تھا۔ اس سے قبل دو ہزار برس تک یہ ملک کا سرکاری مذہب بھی رہ چکا ہے۔ اتنی مدت مدید تک کسی مذہب کے لئے سرکاری سرپرستی تاریخ عالم کا ایک عجیب واقعہ کہلا سکتا ہے۔ اگر انقلاب کے نتائج کو جو نامعلوم ہیں — ذہن سے خارج کر دیا جائے تو اس مذہب کے پیروؤں کی تعداد شاید ۵ لاکھ دس سے کم نہ ہوگی۔ واللہ اعلم

یہودیت

تعارف یہودیت دنیا کے قدیم مذاہب میں سے ہے۔ یہودیوں کے خیال میں اس مذہب کی تاریخ کی ابتداء ابراہیم سے ہوتی ہے، مگر قرآن نے یہ کہہ کر ان کا قول رد کر دیا ہے کہ: **مَا كَانَ آيَاتُهُمْ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَ إِنِّي وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ**

ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو مومن مسلمان تھا اور مشرکوں میں سے بھی نہ تھا۔ اس مضمون پر مفصل بحث کا موضوع ”اسلام“ ہے۔ جہاں انشاء اللہ مدلل طور پر ثابت کیا جائے گا کہ تمام پیغمبرانِ برحق اسلام کے پیرو اور داعی تھے۔ دوسرے نام اور مذاہب بعد کی پیداوار ہیں۔ دراصل نبو اسرئیل — فرزند ان اسرئیل — کا تصور یعقوب سے شروع ہوتا ہے۔ جن کا لقب اسرئیل — عبد اللہ — تھا۔ ان کی اولاد نبو اسرئیل یا اسباط کہلاتی۔ یہ کل بارہ اسباط — قبائل — تھے۔ آگے چل کر یہودیوں نے اپنا نام اور اپنے مذہب کا نام یہودی رکھ لیا جو یعقوب کے چوتھے فرزند یہودا کی طرف منسوب تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اسباطی اسرئیل میں اس سبط — خاندان یا قبیلہ — کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اسی کے نام پر یہودی نامی سلطنت قائم ہوئی۔ یہودیوں کی دوسری حکومت — شمالی سلطنت — اسرئیل کے نام پر تھی۔ شمالی سلطنت مٹ گئی اور یہودیوں کے دوسرے سب خاندان یا تو مٹ گئے یا تقوٰیٰ

نابید ہو گئے۔ پہلی سلطنت — یہودیہ — نسبتاً زیادہ وسیع قائم رہی۔ اور یہود کا خاندان پھیلا پھولا۔ اس زمانے میں سارے اسرائیلی یہودی کہلانے لگے اور ان کا مذہب یہودیت کہلا۔ جنوبی سلطنت یہودیہ کے اندر سیر و شکم واقع تھا جس میں بیت المقدس تھا۔ اس مقدس عبادت گاہ کی نسبت سے یہودیہ کو مرکزیت کا مقام حاصل رہا اور قوم و مذہب ہر دو کا انساب اسی نام کی طرف ہو گیا۔

ماہرین مذاہب نے یہودی مذہب کی کئی تعریفیں کیں ہیں۔ صحیح ترین تعریف یہ ہے، یہودیت وہ مذہب ہے جس میں ایک خدا پر ایمان کے ساتھ ساتھ ایک نسل کی برتری اور فضیلت و عظمت کا عقیدہ بھی داخل دین ہے، یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہودی کوئی تبلیغی مذہب نہیں بلکہ نسلی مذہب ہے۔ خود یہودی کسی کو اس مذہب کی دعوت نہیں دیتے، نہ آسانی سے غیر یہودی کو داخل مذہب کرتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے، کہ یہودیوں کی تعداد ہمیشہ بہت کم رہی ہے۔ آج کل جب کہ دنیا کی آبادی میں مسلسل اضافہ ایک پریشان کن مسئلہ بن چکا ہے۔ یہودی کی تعداد سوا کروڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ قوم اپنی سازشوں، بیوفائیوں، مکر و فریب اور رسولوں کی نافرمانیوں کے باعث ہمیشہ مغضوب رہی ہے، یہودی کا لفظی نفرت و حقارت کا نشان بن چکا ہے۔ دنیا کا کوئی ملک ہی شاید ایسا ہو جس میں سے یہ اپنی کورتوں کے باعث جلا وطن نہ کئے گئے ہوں۔ ان کی آبادی کا زیادہ تر حصہ آج بھی — جب کہ اسرائیل نامی سلطنت کا ناسور عرب دنیا اور مسلم عالم کے لئے ایک لاعلاج بیماری کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مختلف ملک مثلاً امریکہ، برطانیہ اور روس وغیرہ میں سکونت پذیر ہے۔

وہیے تو کسی مذاہب کے متعلق قدامت کا دعویٰ کیا گیا ہے، مثلاً ہندو مذہب، ماناؤزم، شکتی مت، کنفیوٹسزم، جڈھ مت اور زرتشت کا مذہب۔ جہاں تک ہندو مذہب کا تعلق ہے اس کی نہ کوئی تاریخ ہے نہ کوئی متعین عقیدہ و عمل، ایک قوم کی ہزار ہا سالہ تہذیب و ثقافت کے نشیب و فراز میں جو ادھام و سورم پیدا ہو گئیں وہ سب مل جل کر ہندو مذہب کہلائیں۔ دوسرے مذکورہ مذاہب بھی واقعی قدیم ہیں۔ جڈھ مذہب، چینی مذہب اور زرتشت کا مذہب چھٹی ساتریں صدی قبل مسیح کی پیداوار ہیں۔ مگر یہودیت کی قدامت واقعی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ بلکہ یمن ملک ہے کہ مشرق بعید کے مذاہب کو چھوڑ کر یہودیت دنیا بھر کے مذاہب میں سے قدیم ترین تینوں الہامی مذاہب — یہودیت، عیسائیت اور اسلام — میں سے بھی

یہودیت کو ہی تقدم حاصل ہے۔ ان تینوں کو سامی مذاہب بھی کہتے ہیں۔

یہودیت کی تاریخ | یہودیت چونکہ ایک نسلی مذہب کا نام ہے لہذا اس مذہب کی تاریخ اس ایک خاص نسل کی تاریخ سے جدا نہیں کی جاسکتی۔

اسلام کے علاوہ دنیا بھر کے مذاہب میں سے یہودیت کی تاریخ میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو یہود نے گولے شمار واپسی تباہی روایات سے غلط نظر رکھا ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ انہوں نے اپنے مذہب و ثقافت اور تہذیب کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے عجائبات و معجزات کی ہے۔ یہودیوں کے لٹریچر کے علاوہ ان کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ قرآن مجید میں بھی محفوظ ہے۔ صرف یہی حصہ ترمیم و اضافے اور ادغام و خرافات کی ملاوٹ سے ملوث نہیں ہو سکا۔ اس کا سبب واضح ہے کہ قرآن دنیا کی واحد محفوظ و غیر متبدل کتاب ہے۔ ہم یہودی کی تاریخ کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ حضرت یعقوب سے شروع ہو کر یوشع بن نون کے شام میں فاتحانہ داسطے تک نئے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس حصے کے موٹے موٹے واقعات قرآن مجید کے سورہ البقرہ وغیرہ میں بیان کئے ہیں۔ اور تفصیل خود یہودی لٹریچر میں پائی جاتی ہیں۔ دوسرا حصہ شام کی فتح سے لے کر اب تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ کتاب و سنت میں اس حصے کے کچھ اجزاء موجود ہیں۔ اور بعض دوسرے واقعات و اعمال کی طرف صرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ اس حصے کی تاریخ کے لئے ہمیں زیادہ تر یہودی روایات بائبل اور تلمود پر مبنی ہیں۔ ان کتابوں میں بے شمار مبالغے، ادغام و خرافات، غلط بیانیوں اور واقعات کا توڑ مروڑ موجود ہے، جیسا کہ ہم یہودی لٹریچر پر گفتگو کے دوران میں ان کی طرف اشارات کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

ہجرت مدینہ کے بعد یہودیت اور اسلام کے تقابل کے نتیجے میں جو واقعات پیش آئے وہ اسلامی کتب و تاریخ میں محفوظ ہیں۔ یہودیوں نے لوگوں کو اسلام سے روکنے اور اس کی ترقی کی رفتار میں رکاوٹیں ڈالنے کی از حد زیادہ کوششیں کیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تاریخ کے آئینے میں خود ان کو اور دوسروں کو بھی دکھایا کہ اس قوم کی تاریخ انبیاء و رسل کی مخالفت اور احکام الہی سے بغاوت سے چمپے ہے۔ چنانچہ ہم مدنی سورتوں میں بالعموم اور البقرہ میں بالخصوص اس قوم کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قوم کی تاریخ بغاوت و سرکشی اور نافرمانی و بیوفائی کی تاریخ ہے۔ ان کی ان مشہور صفات پر خود انبیاء بنی اسرائیل، عیسا، یحییٰ اور عریقل و دانیال آئینہ ہاتھ اور ٹوٹے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ بائبل کے

مجموعہ میں انبیاء کی طرف منسوب جو کتا ہیں موجود ہیں ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت اظہار میں آتی ہے جو جاتی ہے۔ جس تناسب سے اس قوم پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات بے حد و بے شمار تھے۔ اسی نسبت سے ان کی بیوفائیاں اور نافرمانیاں بھی شمار و قطار سے باہر ہیں۔ انبیائے بنی اسرائیل کی زبان سے (اور بعض جگہ خدا کے تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہوئے) ان لوگوں کے لئے باغی قوم، سرکش قبیلہ، بیوفانگھرانہ اور احسان فراموش گروہ کے الفاظ ادا ہوتے ہیں جو صانف انبیاء کی ذہنیت ہیں۔ اور ہر وقت دیکھے جاسکتے ہیں۔

قرآن کی روش سے۔ اور تاریخ کی تصدیق و تائید سے۔ آدم کے بعد نوحؑ اور ان کے بعد ابراہیمؑ مشہور و معروف عالمی و آفاقی پیغمبر تھے۔ ان کی نسل کی دو شاخیں تھیں: باجرہ کے فرزند اسمعیلؑ کی شاخ جو مکہ میں سکونت پذیر ہوئی، اور سناؤہ کے فرزند اسماعیلؑ کی شاخ جو شام و فلسطین میں متوطن ہوئی۔ اسماعیلؑ کے بیٹے یعقوبؑ تھے۔ جو اسرائیل کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اور ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ یعقوبؑ کے ایک بیٹے یوسفؑ تھے جنہیں سوتیلے بھائیوں نے ازراہ حسد و عداوت پہلے کنوئیں میں پھینک کر باپ سے جدا کیا اور پھر مصر جانے والے ایک تجارتی خانے کے ہاتھ چند سکون کے عوض بیچ کر ان سے گلو غلامی کر لی چاہی۔ یوسفؑ کو اللہ تعالیٰ نے سلطنت کا اقتدار بخشا اور انہوں نے اپنے تمام خاندان کو کنعان۔ فلسطین۔ سے مصر میں بلوایا۔ یہ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق مصر میں اس وقت قطعی فرعونوں کی نہیں بلکہ چرواہے بادشاہوں کی حکومت تھی جو کچھ عرصہ قبل صحرائے عرب و شام سے آکر مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ انہیں ہم وطنی کی بنا پر یوسفؑ اور ان کے خاندان سے فطری ہمدردی تھی۔ چنانچہ جب ملک یہ حکومت قائم رہی بنی اسرائیل بڑی عزت و احترام اور اقتدار و وقار کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اور سرزمین مصر میں خوب پھلے چھوٹے۔ تقریباً پانچ سو برس کے بعد مقامی قطعی قومیت کے زیرِ علم انقلاب آ گیا۔ اور فرعونیت کی حکومت کا دور شروع ہوا۔ پہلا شاہی طبقہ۔ عمامہ و تاج مصر سے بیدخل بلکہ جلا وطن ہو گیا۔ اس وقت سے بنی اسرائیل پر ظلم و ستم اور ان کی تذلیل و تحقیر کا دور شروع ہو گیا۔ فرعون کے حکم سے بنی اسرائیل کا زور گھٹا ہے اور انہیں بے دست و پا بنائے رکھنے کی خاطر دومریدان کی نسل کشی کی گئی۔ ایک مرتبہ بخت موسویؑ سے قبل، اور اسی زمانے میں موسیٰؑ کی پیدائش ہوئی۔ اور دوسری مرتبہ بخت موسویؑ کے بعد جب فرعون کو موسیٰؑ جیسے لیڈر سے خطرہ لاحق ہو چکا تھا۔

بنی اسرائیل در اثنا کچھ حدیثیں مگر مصر کی طویل رہائش کے زمانے میں ان میں مصری دیوتاؤں کی عبادت اور دوسرے جملی خداؤں کی پرستش کا مرض پیدا ہو گیا۔ پھر یہ جہاں کہیں گئے مقامی لوگوں کے شرک سے متاثر ہو گئے۔ بائبل کی کتاب میں اس پر گواہ ہیں۔ بنی اسرائیل میں ہزار ہا بنی معبود ہوئے۔ ان سب نے توحید کا درس دیا مگر یہ بگڑی ہوئی قوم منجھل نہ سکی پیغمبروں کا اثر ان پر دیر پا نہیں ہوتا تھا۔ بنیوں کی نافرمانی اور ان کا اہتمام ان کا شیوہ تھا۔ بعض پیغمبروں کو انہوں نے بڑی دھڑائی سے قتل بھی کر ڈالا اور اس پر فخر کرتے رہے۔ ذکر کیا ویدیگی ہر دو کو قتل کیا اور عیسیٰ و محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی کئی بار سازش کی عیسیٰ کے متعلق تو انہوں نے بڑے فخر سے کہے ہیں کہا کہ: ”ہم نے اللہ کے رسول مسیح بن مریم کو قتل کر دیا ہے“ مگر قرآن نے اس کی شد و مد سے تردید کر دی۔ گائے پرستی کا مرض یہودیوں کو مصر سے لگا تھا۔ سامری نے موسیٰ کی عارضی غیر حاضری کے زمانے میں دھات کا سنہری بچھڑا بنایا اور بنی اسرائیل نے علی الاعلان دھڑلے سے اس کی پرستش کی۔ گائے کی معبودیت و تقدیس کا تصور موسیٰ نے بڑے جتنوں سے ان سے ایک گائے ذبح کر کے ان کے اذیان و قلوب سے محو کیا۔

موجودہ بائبل میں خدا سے واحد کا عقیدہ تو موجود ہے مگر واضح اور خالص نہیں، کافی حد تک دھندلایا ہوا اور اہام و خرافات سے ڈھکا ہوا ہے۔ مثلاً خدا کا یعقوب سے کشتی لڑنا، بنی اسرائیل کے کاہن کے آگے آگے چلنا، پہاڑ میں انہیں آگ میں نظر آنا۔ بیل کی چمک اور گرج سے ظہور کرنا، کبھی جھاڑیوں میں سے شعلہ بن کر دکھائی دینا، عہد کے صندوق میں بیواہ (خدا کا رہنا اور جنگ کے موقع پر ان کے ساتھ رہ کر قتل دینا وغیرہ۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل نے یہوواہ (خدا) کو دوسری مشرک قوموں کی طرح سب سے بڑا خدا — الہ الالہ یا اپنے عظیم ترین قومی معبود کا درجہ دے دیا تھا۔ یہ نہیں ہے بائبل کی ان آیات کا مطلب واضح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خداوند خدا، بنی اسرائیل کا خدا، تیرا اور تیرے بزرگوں کا خدا، کہہ کر پیش کیا گیا ہے۔ غالباً اسی سے ان کے نسل نقاح اور بڑھیا نسل کا راز کھل جاتا ہے۔ یہوواہ کے معنی میں بڑا اختلاف ہے۔ بائبل میں: ”یہی جو ہوں“ ”یہا“ ”وہ جو ہے“ لکھا ہے۔

الغرض فراغ نہ کی یہ پالیسی کہ بنی اسرائیل کو زندہ تو رکھا جائے مگر بے دست و پا اور مغلوب بنا کر، غیر قبیلوں سے نفرت و عداوت پر مبنی تھی۔ وہ بنی اسرائیل کی تعداد اور سابق

اقتدار سے بھی خائف تھے۔ لہذا صرف غلام بنا کر مزدوری کرنے، ایٹیں بنوانے، گاراز بنانے، گندگی اٹھانے اور بوجھ اٹھوانے کی خاطر ان کی کچھ تعداد کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ عورتوں کو اس لئے زندہ رکھا جاتا کہ ان سے قطعی اولاد پیدا کی جائے۔ انہی خوفناک حالات میں موسیٰ بنی اسرائیل پیدا ہوئے۔ ان کی ماں — یو کا بد — نے بالہام خداوندی انہیں صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا۔ فرعون کے ملازموں نے صندوق پکڑ لیا۔ اور وہ شاہی محل میں لے جایا گیا۔ اس کے کاغذ مشورہ ہے اور اس کے بعض ضروری اجزاء قرآن نے بھی بیان کئے ہیں۔ ہوش سنبھالنے پر انہیں اصل صورت احوال کا پتہ چلا۔ انہوں نے نوجوانی کے عالم میں بنی اسرائیل پر برسر عام مظالم ہونے دیکھے اور مظلوموں کی مدد کرنے لگے۔ ایک قطعی ظالم اتفاق سے ان کے ہاتھ سے مارا گیا تو وہ بھاگ کر ملحقہ ملک مدین جا پہنچے۔ وہاں ایک بوڑھے بزرگ شعیب یا نیرو (حسب روایت بائبل) کی دس سال خدمت کی۔ اسی کی بیٹی سے نکاح کیا اور مدت ملازمت ختم کر کے مع اہل و عیال مصر کو واپس لوٹے۔ راستے میں طور پر انہیں نبوت ملی اور ادھر مصر میں ان کے بڑے بھائی ہارون کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ دونوں بھائی مل کر باہم خداوندی فرعون کے دربار میں گئے اور اسے خدا کا پیغام پہنچایا۔ اس پیغام کے دو حصے تھے: پہلا یہ کہ فرعون خود ایمان لائے، بصورت دیگر بنی اسرائیل کو غلامی سے رہا کرے تاکہ موسیٰ باذن الہی انہیں واپس ملک شام کو لے جائیں۔ فرعون نے دونوں مطالبے ٹھکرادیئے اور ان سے بڑی ترشروی اور تندخوی سے پیش آیا۔ پھر جادو گروں سے ان کا مقابلہ کر لیا جس میں فتح موسیٰ کی ہوئی۔ عصائے موسیٰ جادو گروں کے جعلی سانپوں کو نکل گیا اور جادوگر خدائے واحد پر ایمان لا کر سچے سمجھ ہو گئے۔ فرعون اس واقعہ سے بڑا جھٹلایا اور بنی اسرائیل کی نسل کشی اور ان پر مظالم توڑنے کا نیا دور شروع ہوا۔ آخر کار موسیٰ بنی اسرائیل کو بحر احمق کی راہ سے مصر سے نکلنے اور دریا پار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرعون لاؤ نشکر سمیت غرق ہو گیا۔ مگر اس کی لاش محفوز رہی جو آج بھی مصری عجائب گھر کی زینت ہے۔

اب بنی اسرائیل کی قومی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ فرعون سے نجات پانے ہی انہوں نے موسیٰ سے ایک محسوس خدا کا مطالبہ کر دیا۔ وادی سینا میں بحر احمر سے لے کر شام کی سرحد تک بنی اسرائیل کئی نشیب و فراز سے گزرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے انعامات کی بارش ان صورتوں میں فرمائی: (۱) فرعون جیسے دشمن سے نجات اور اس کا ان کی آنکھوں کے سامنے غرق ہونا۔ (۲) راستے میں بادلوں کا سایہ کیا جانا (۳) من و سطرلی کا

نزول نہ کرکھا تا تیار کرنے کی زحمتوں سے بچے رہیں۔ (۴) صحرائیں پانی نہ ملا تو ایک چٹان سے بارہ چشموں کا ٹکٹا کر ہر قبیلہ ایک ایک چشمہ پر قبضہ کر کے کام چلائے۔ ان انعامات الہی کے بالمقابل یہود کا رویہ یہ تھا (۱) ناشکری (۲) نافرمانی (۳) بغاوت (۴) بات بات پر موسیٰ کے لگے شکوکے کہ اس شخص نے ہمیں بتلائے مصائب کیا ہے (۵) موسیٰ و ہارون سے مسخر و استہزاء کا رویہ (۶) گوسالہ پرستی (۷) نزولِ تورات کے بعد اس پر عمل کرنے سے گریز (۸) خدا کو درپردہ دیکھنے کا مطالبہ (۹) من و سلویٰ کے بجائے ہاتھ کی پکی ہوئی شہری غذاؤں اور چٹ پٹی چیزیں طلب کرنا (۱۰) گائے و بکری کے گوشت پر تمسک میں پس و پیش کرنا (۱۱) عیسٰی کو بالیسا کی فتح اور بازن الہی لشکر کے بجائے مسخر و استہزاء کا رویہ (۱۲) بیت المقدس میں داخلے کا حکم اور یہود کی بزدلی۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہود پر چالیس سالہ بیابانِ تور دی مسئلہ کی۔ اسی دوران میں ہارون و موسیٰ کی وفات واقع ہو گئی۔ مقررین پل ہوئی بزدل نسل مرکب گئی اور صحرائی آب و ہوا میں پل بڑھ کر ایک جدید نسل تیار ہوئی جس نے یوشع بن نون کی سربراہی میں بیت المقدس (اس زمانے کا یروشلم) فتح کیا۔ اس فتح کے ساتھ ہی تارین بنی اسرائیل کا دوسرا بڑا دور شروع ہوا جیسا کہ ہم نے ابتداء میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

فلسطین اس زمانے میں مختلف قوموں کا ملک تھا۔ بائبل کی کتابوں میں ان قوموں کے یہ نام آئے ہیں۔ حیتی، اموری، کنعانی، فرزی، حویتی، پھلیٹی اور فلسطی۔ یہ اقوام بت پرست تھیں۔ سب سے بڑا دیوتا ایل تھا جو سانپ کے مشابہ تھا۔ اس کی بیوی عشیروتھی۔ دونوں کی نسل میں ستر کے قریب دیوتا اور دیویاں تھیں جو سب معبود تھیں۔ مشہور جعلی خدا ایلن بھی ایل کی اولاد سے بتایا جاتا تھا۔ اور اسے بارش، سبزی، ترکاری اور زمین و آسمان کا مالک مانا جاتا تھا۔ اس کی بیوی اُنات یا عسارات کہلاتی تھی۔ یہ دونوں دیویاں عشق و محبت اور جسیات کی دیویاں کہلاتی تھیں۔ غرض جتنے مندر اتنی باتیں، جتنے انسان اُسے خدا اور خدا نیاں۔ خدائے واحد کی خدائی کو ان سب میں بانٹ دیا گیا تھا۔ زنا کاری کو مذہبی سند حاصل تھی۔ اور عبادت گاہیں بدکاری کے اڈے بن گئے تھے۔ بنی اسرائیل جب ان مشرک قوموں سے ٹکڑ مل گئے۔ جو صریحاً حکمِ تورات کے خلاف تھا۔ تو ان میں شرک و بت پرستی اور اخلاقی گراؤ کی تمام بیماریاں گھس آئیں۔ بنی اسرائیل میں قبائلی اختلاف بھی پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کی وہ آبادی جو بھی غیر ملتوح تھی اس نے گٹھ جوڑ کر کے بنی اسرائیل کو فلسطین کے ایک بڑے حصے سے نکال دیا۔ مقامی فاتحین بنی اسرائیل

ابن بنی اسرائیل کی اس مضبوط سلطنت پر طاقت، داؤدؑ اور سلیمانؑ نے کیے بعد دیگرے حکومت کی۔ یہ حکومت ۱۰۵۰ B.C سے لے کر ۶۰۰ B.C تک قائم رہی۔ طاقت ۱۶ اسالہ داؤدؑ ۳۹ سال اور سلیمانؑ ۴۰ سال، اس عرصے میں نظام سلطنت اور معاشرہ درست رہا۔ سلیمانؑ کے بعد خود غرضی اور دنیا پرستی کے سبب سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

اسرائیل اور یہودیہ۔ پہلی کا علاقہ اتر شمال کا علاقہ بشبول شرقی اُردن تھا۔ اور دوسری کا جنوبی علاقہ بشبول اودم۔ پہلی کا پایہ تخت سامریہ اور دوسری کا یروشلم تھا۔ دونوں میں شدید علالت و فسادات تھیں۔ پہلے اسرائیل میں شرک و بت پرستی پھیل اور پیغمبروں الیاس و ایلیسع کی بھی مذمتی گئی۔ بلکہ الیاس کو جلادین کر دیا۔ ان حالات میں آشوری حملے متواتر شروع ہوئے۔ عاموس نبی اور مہربان سے بھی ناکامی کا منہ دیکھا۔ عاموس کو تو سلطنت سے ہی نکل جانے کا حکم مل گیا۔ آخر کار 721 B.C میں سارگون نامی آشوری بادشاہ نے سامریہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہودیہ کو آشوری علاقوں میں بکھر دیا۔

یہودیہ میں بھی شرک اور ملاحہ کفر و بت پرستی پھیلی۔ آشور و بابل نے حملے کر کے مغربہ سلطنت
کچھ دیر پائنا تب ہوئی تسلیفات اور یہ مباحہ نبیوں نے بہتر از دور لگایا مگر یہود اپنی کرتوتوں سے
باز نہ آئے۔ اور آخر کار ۵۹۵-۵۸۶ میں بخت نصر بابل نے بیت المقدس و ربوہ و شلیم سمیت ساری
سلطنت یہودیہ پر قبضہ کر لیا۔ یہودوں نے کچھ مدت بعد بغاوت کی تو اسے کی بار بخت نصر نے شہر اور
معبد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور بے شمار یہودیوں کو غلام اور قیدی بنا کر عراق لے گیا۔
ہیکل سلیمانی کو یہود خاک کر دیا اور تورات کے نسخے کو بھی جلا دیا۔

آخر کار ۱۵۳۹ء میں ایمانی فاتح سائرس (خورس، خند و یاگورڈش) نے بابل فتح کیا اور بنی اسرائیل کو غلامی سے چھڑایا۔ بیت المقدس کو ۱۵۵۲ء کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ مگرانی کا لالہ عجیبی اور نیکر یاہ بنی نے کیا۔ ۱۵۵۸ء میں عزیزیہ نے یہودی کتب بشمول تورات کی کتب پر خمسہ از سر نو ترتیب دی۔ ۱۵۵۵ء میں نجمیہ نے باذن شاہ ایران یروشلیم کی تفصیل بنائی۔ شمالی فلسطین (اسرائیل) والوں نے کوہ جزیریم پر اپنا معبد تعمیر کر لیا۔ اس سے دونوں فرقوں میں عداوت اور بڑھ گئی۔ ۱۹۶۸ء میں انیسویں سالٹ شاہ انطاکیہ نے فلسطین پر قبضہ کر لیا اور

یہودیوں کو یونانی تہذیب و تمدن اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اندر کے غداروں نے اس کا ساتھ دیا۔ ۱۷۵-۸۰۰ میں اینٹوکس چہارم نے بیت المقدس میں بت رکھو کر یہودیوں سے بت پرستی کرائی۔ اسی زمانے میں مکائی تحریک اٹھی اور اس نے سارا فلسطین یونانیوں سے آزاد کرانے ایک بڑی سلطنت قائم کر لی جو پہلی دونوں پر مشتمل تھی اور کچھ مزید علاقے بھی اس میں شامل تھے یہ سلطنت ۶۶ ق م تک قائم رہی۔

یہود میں پھر اختلاف و شقاق پیدا ہوا اور انہوں نے رومیوں کو خود فلسطین پر حملے کی دعوت دی۔ ۶۶ ق م میں پوپتس نے فلسطین پر حملہ کر کے اسے رومی سلطنت کا جزو بنایا مگر عملاً حکومت مقامی لوگوں کو دے کر مطمئن رہا۔ ۵۰ ہ ق م سے ۴۰ ق م تک فلسطین پر ہیرود یہودی کے ذریعے سے رومی حکومت کرتے رہے۔ ہیرود رومیوں کا نایاب محتالہذا ان کی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیتا رہا۔ یہود کی مذہبی و اخلاقی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اور وہ زوال کی آخری حد تک پہنچ گئے۔ اسی زمانے میں یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام مجبوث ہوئے۔ یحییٰ کا توبہ انجام ہوا کران کے وقت کے یہودی بادشاہ (ہیرود انٹی پاس) نے اپنی ایک فاحشہ محبوبہ کی فرمائش پر — جس کے باعث یحییٰ نے بادشاہ کو احکام الہی سے روگردانی پر مجبور کیا تھی۔ انہیں پہلے محبوس کیا اور پھر سر کاٹ کر ایک تختی میں رکھ کر اس یحییٰ کو پیش کر دیا۔ عیسیٰ کو اس جرم کی پاداش میں (دربویم) یہود و نصاریٰ قتل و صلب کی منزلوں سے گزرنا پڑا کہ انہوں نے یہودیوں کی ظاہر پرستی اور شدید خست و خوار پر علانیہ تنقید کی تھی۔ یہود نے کہا کہ یہ کنواری ماں کی ناجائز اولاد (معاذ اللہ) اسی لائق تھا کہ اسے صلیب کی لکڑی پر لختی موت مار کر اس کی نبوت کا ڈھونگ غلط ثابت کیا جائے۔ اسی طرح انہوں نے ذکر کیا کہ بھی ایک مجرم تھا الزام لگا کر عین بیت المقدس کے اندر سنگسار کیا۔ یہود کی ان بدکاریوں اور بد اعمالیوں کے باعث پہلے تو ایک دفعہ پھر ان کی سلطنت کے تین ٹکڑے ہوئے اور پھر یہودیوں اور رومیوں کی ملی جلتی کے نتیجے میں رومی بادشاہ مائیکس نے ان کی سلطنت کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک روند ڈالا۔ یروشلم کو فتح کر کے یہود کا قتل عام کیا۔ سوا لاکھ سے زیادہ یہودی مارے گئے۔ جو بچ گئے انہیں غلام بنالیا گیا۔ اور ان سے نہایت ذلیل کام لئے گئے۔ بعض کو درندوں سے چھڑوایا گیا۔ عورتوں کی کھلی بے حرمتی کی گئی۔ بیت المقدس کو یونہی خاک کر دیا گیا اور وہ ہزاروں سال کے لئے دنیا کے تختے سے ناپید ہو گیا۔

یہود کے کردار کا ایک نہایت تاریک پہلو | دنیا کے ہر دین و مذہب کے ماننے والے بائبلان مذاہب کی عزت

و احترام اور توقیر و اعزاز کے قائل ہیں۔ دلی عقیدت و محبت اس وقت تک کسی بزرگ یا رہنما کے متعلق ہو ہی نہیں سکتی جب تک اس کی اخلاقی برتری اور نصیحت کردار کا پختہ یقین نہ ہو۔ لیکن یہودی قوم کا معاملہ بالکل جدا گانہ ہے۔ وہ ایک طرف جن لوگوں کو نبی و رسول اور فرشتہ الہی مانتے ہیں دوسری طرف ان کے اخلاق و کردار پر ایسے ایسے شرمناک الزام لگاتے ہیں جن کا تصور ہی تو کبھی کسی معمولی شریف انسان کے متعلق بھی نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل یہودیوں کو جب اس مفسدہ قوم کے عوام و خواص، علماء و مشائخ اور ہر طبقے اور ہر شعبہ زندگی کے لوگ اخلاقی زحالی کی انتہائی پستیوں میں گر گئے تو اپنی اصلاح کرنے کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے انہوں نے بزرگان دین، اولیاء اللہ اور انبیاء و رسول تک کو ہر قسم کی بد عملی کا مرتکب ٹھہرا دیا تاکہ اپنی بد کاریوں کے لئے دجر و جزا نکالی جاسکے۔ اس سلسلے میں کوئی قوم اگر یہودیوں کی ہم سر و ہم نوا ہو سکتی ہے۔ تو وہ ہندو قوم ہے۔ انہوں نے بھی اپنے رہنماؤں بلکہ دیوی دیوتاؤں تک کو اپنی بد اعمالیوں میں ملوث کر کے دکھایا ہے۔

موجودہ بائبل کی کتابوں کے وہ مقامات پر پڑھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے جس میں حلیل القدر پیغمبروں پر شراب نوشی، دھوکا فریب، غیر عورتوں کی تاک جھانک، غیر محرم خواتین سے عشق و محبت کی پیٹلیں بٹھانا، زنا کاری، جھوٹ اور کھلے ظلم و ستم کے غلیظ الزامات لگائے گئے ہیں۔ نوح علیہ السلام پر شراب نوشی اور عریانی کا گندہ مجتہان کتاب پیدائش کے باب ۲۰-۲۵ میں موجود ہے۔ لوط علیہ السلام پر شراب نوشی اور خود اپنی بیٹیوں سے بدکاری کرنے کا غلیظ الزام کتاب پیدائش کے ۱۷ ویں باب میں مفصل مذکور ہے۔ یعقوب علیہ السلام پر بے صبری و ناشکرگی کا مجتہان بائبل کی کتاب پیدائش اور تلمود میں موجود ہے۔ نیناسی کتاب میں ان کے رات بھر خدا سے گفتنی اڑنے کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس مختل خدا پرست پیغمبروں کی توہین و تنقیص ہے، یوسف علیہ السلام پر جھائیوں کی چٹل خوری کا الزام کتاب پیدائش میں لکھا ہے۔ پھر بائبل کی کتاب خروج میں حضرت موسیٰ پر قتل عمد اور مقتول کی لاش کو رویت میں چھپا کر چلے جانے کا الزام ہے۔ تلمود میں حضرت موسیٰ پر خفیہ عشق بازی اور بدکاری تک کا الزام لگایا گیا ہے۔ قرآن نے نہری گو سالہ بنانے کا قصہ بیان کرتے ہوئے اُسے سامتری کی کارستانی بتایا ہے۔ مگر بائبل کی کتاب خروج باب ۲ میں یہ شرک و کفر اور منعت کاری دارون علیہ السلام

کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ بچھڑا بنا کر اس کی پوجا کرنے اور کرانے میں سب سے زیادہ مدت انہی ارووں کا تھا۔ واؤد علیہ السلام پر اپنے ایک ملازم سرکار اور یا حتیٰ کی خبر ہو جوان بیوی کی ناک جھانک اُسے عریاں نہاتے دیکھ کر مبتلائے عشق ہوئے، اُسے بلوا کر بدکاری کرنے اور اُس کے خاوند کو دھوکے سے مروا کر پھر اُسے اپنے گھر ڈال لینے کا غلیظ عبتان کتاب موسیل باب ۱۱-۱۲ میں بڑی تفصیل سے مزے لے کر لکھا گیا ہے۔ سلیمان علیہ السلام پر بت پرستی و مشرک عورتوں سے نکاح کرنے اور ان کے عشق میں محو ہو جانے کا الزام کتاب سلاطین باب میں شرمناک طریقے سے لگایا گیا ہے۔ یہودی لڑکچہ واؤد و سلیمان کی تصویر پیغمبروں کی حیثیت سے نہیں بلکہ دنیا دار عیش پرست بادشاہوں کی حیثیت سے کھینچا ہے۔ قرآن نے ان تمام برگزیدہ پیغمبروں کی عظمت و عصمت کا اعلان کیا ہے۔ اسلامی عقیدے میں پیغمبر معصوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں صحیح تر مسلک یہی ہے کہ نبی و رسول قبل از نبوت اور بعد از نبوت ہر قسم کے پیغمبر و دیکرہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ خلاف اولیٰ افعال اور نفوذ کو گناہ کی تعریف میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ اسی ضمن میں ایوبؑ کا ذکر بھی مناسب ہے۔ جنہیں قرآن نے فہرست انبیاء میں داخل کیا اور ایوبؑ صابر کا معزز لقب عطا کیا ہے۔ بائبل کی کتاب ایوب اس کے برخلاف انہیں محظوظ و بے صبر اور غیر ثابت قدم معہراتی ہے۔ الغرض اس ہمسازشی قوم سے نہ خدا بچا نہ اُس کے انبیاء و رسل مگر خداوند نے تیرے لئے چھوڑا زمانے ہیں۔

اسلام اور یہود اس موضوع پر گفتگو بڑی اذیت ناک ہے۔ اس کا تقور آتے ہی اسلام اور اہل اسلام کے سینکڑوں ہزاروں زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ جو قوم خدا اور اُس کے پیغمبروں سے وہ سلوک کر چکی تھی جس کا ذکر اوپر گزرا، اُس سے کوئی غیر کی توقع رکھنا عبت ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اسلام نے یہود کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کیا۔ پیغمبر اسلام نے ان سے بے شمار دُکھ اٹھا کر بھی نہایت نرم اور رحمانہ برتاؤ کیا۔ اہل اسلام نے اپنی سلطنتوں اور حکومتوں میں انہیں ہر قسم کے وہ حقوق عطا کئے جن کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ مگر حیف ہے اس بیوفا اور سرکش قوم پر کہ اس نے نہ کبھی اسلام کو بخشا، نہ پیغمبر کے احسانات کو یاد رکھا اور نہ اہل اسلام کی رواداری اور رحمدلی کو کبھی پیش نظر رکھا۔ یہودیوں میں عقلمندی نہایت پائی جاتی ہے۔ شیخ سعدی نے بچھو کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ اس قوم پر حرف بحرف صادق آتا ہے:

نیش عقرب نہ از پیئے کین است

انگشتائے طبیعتش این است

اس قوم کی تاریخ پڑھ کر ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ دو حال سے کبھی خالی نہیں رہی: یا ظالم ہوگی یا مظلوم۔ درمیان کا کوئی مقام انہیں جھٹانا ہی نہیں!

ادھر بیان کردہ تاریخ یہودیت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ شاہ اردو م کے ہاتھوں پہلی صدی عیسوی میں یہودیوں پر کیا ہوتی۔ اس کے بعد یہ قوم دنیا کے کئی ممالک میں ترسہ ترسہ ہو گئی اور موجودہ صدی کے وسط تک اس کا یہی حال رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہودی صلیبی گمبہ جوڑ کے نتیجے میں مغربی اقوام اور روس کی تقاربت کے باعث اسرائیل جدید نامی سلطنت کا ناجائز پھر متولد ہونا۔ جن نے آج ساری دنیا کے امن کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔ اب ہم مختصراً اسلام اور یہود کے تعلقات پر کلام کریں گے۔

سنہ ۶ کے بعد یہودیوں پر ایک اور افتاد پڑی اور اس کے نتیجے میں رومیوں نے انہیں فلسطین سے بالکل بے دخل کر دیا۔ فلسطین میں ابھی کسبھی نکل گئی۔ اور باقی ماندہ یہودی بھی شام سے خارج ہو کر آوارہ جہاں ہو گئے۔ کچھ یہودی اسی زمانے میں حجاز میں داخل ہوئے۔ اور یہاں کے سرسبز و شاداب مقامات اور وادیوں پر قابض ہو بیٹھے۔ حجاز ان کے سابق وطن کے متعلیٰ جنوب میں واقع ہے۔ نقشہ دیکھیں تو سمجھ میں آجائے گا۔ کہا نہیں نے آبد، مقنا، جبوک، تیماء وادی القریٰ ذکاء اور یتیمہ کو اپنی رہائش کے لئے منتخب کیوں کیا تھا۔ تین مشہور قبائل جن کا تاریخ اسلام میں بار بار ذکر آتا ہے: یعنی بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینقاع بھی اسی زمانے میں آکر یثرب میں بس گئے تھے۔ یہودیوں کے علاوہ یثرب کے دوسرے باشندے، قبائل بنو نضیر و خزرج، دراصل یمن کے باشندے تھے۔ یمن کی سیدنا اب ٹوٹ جانے کے باعث جو سیلاب آیا اُس کی وجہ سے یمنیوں کو وطن سے مجبوراً بھاگنا پڑا۔ یہ دو قبیلے یثرب میں آئے لیکن آتے ہی ان کی یہود سے ٹکرائی گئی۔ اپنے سابق ہم وطن عسائیوں کی مدد سے انہوں نے یہود کو یثرب سے بے دخل کر دیا۔ اور خود شہر پر قابض ہو گئے۔ یہودی مدعیہ سے باہر بیتان بنا کر رہنے پر مجبور ہوئے۔ بنو قینقاع نے خزرج کی مدد سے شہر کے اندر جگہ حاصل کر لی۔ باقی دونوں قبیلے بنو نضیر و خزیم بن گئے۔ مگر شہر کے باہر ہی رہائش اختیار کی۔ ان لوگوں میں نسلی غرور اور دنیوی و اخروی فضیلت کا بلا جواز دعویٰ تھا۔ اور یہ عربوں میں سوائے ظاہری لباس اور طریق بود و باش کے غلط غلط نہیں ہوئے۔ یہ سودی کاروبار کرتے اور قلعہ گنڈھے، ٹوٹے ٹوٹے اور جاؤ کے بل

پر اپنی علیت جتاتے تھے۔ بعض افراد کے سوا عربوں نے یہودیت اختیار نہیں کی اور بیرونی دخل انداز، ہونے کے بنا پر بطور پالیسی یہ عربوں کو لڑاتے رہتے تھے۔ تاکہ ان کے خلاف متحدہ عرب مجاذین نہ بن سکے، لیکن اتحاد میں کم ہونے کے باعث خود بھی اس بات پر مجبور تھے کہ کسی نہ کسی طاقتور عرب قبیلے کے حلیف بنیں اور اس کی حمایت میں رہیں۔ یوں عربوں کی باہمی لڑائیوں میں یہودی بھی شامل ہونے اور ایک یہودی قبیلہ دوسرے کے خلاف بھی تہرہ آزمارتا۔

اہل کتاب ہونے کے باعث یہودی قاطعاً یقین کے منظر تھے۔ اور حضور کی بعثت سے قبل انہوں نے یہ بات بالعموم مشہور کر رکھی تھی کہ آخری نبی مبعوث ہوا چاہتے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ یہ لوگ سب سے آگے بڑھ کر حضور پر ایمان لاتے۔ مگر دنیوی مفادات اور نفسی تعصبات کے پیش نظر انہوں نے نہ صرف اسلام کی دعوت کو رد کیا بلکہ بغض و عناد اور عداوت و سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ حضور نے ان کے ساتھ جو معاہدے کئے تھے انہوں نے ایک ایک کر کے توڑ ڈالے۔ اسلام کے خلاف نفرت پھیلانا، پیغمبر اسلام کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرنا، مسلمانوں کو باہر لڑانے کی کوشش کرنا، اسلام کے خلاف شرک و کفر کی مدد کرنا۔ بار بار اسلام اور اہل اسلام کے خلاف لشکر کشی کرنا، حضور کو قتل کرنے کی بار بار کوشش کرنا، دشمنان اسلام کو حضور اور مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہنا، مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرنا، عام گفتگو اور سلام و کلام میں اپنے پوشیدہ بغض و عناد کا ثبوت دینا، حضور پر الزام تراشی اور سب و شتم کرنا، یہ ان لوگوں کا اسلام کے متعلق رویہ رہا۔ منافقین کی جماعت میں ان کا خاص دخل اور حصہ تھا۔ مسجد طرار انہوں نے بنوائی تھی۔ حضور کو پتھر مارا کر قتل کرنے کی سازش کی۔ جنگ خیبر کے بعد حضور کو زہر دلوایا۔ جنگ تبوک سے واپس پر راستے میں ایک تنگ گھاٹی کے اندر حضور کے خلاف قتل کے لئے کمین گاہ بنائی، آپ کے گھروالوں پر ہتھان لگوائے۔ غرض کوئی ایسا حربہ نہ تھا جو انہوں نے اسلام کے خلاف استعمال نہ کیا ہو۔ انہی شرارتوں اور عہد شکنیوں کے باعث بنو قینقاع اور بنو نضیر کو خود ان کی مرضی سے جلاوطن کیا گیا۔ اور بنو قریظہ کے قابل جنگ مردوں کو خود انہی کے پسند کردہ مالٹ کے فیصلے کے مطابق قتل کرایا گیا۔ مدینہ سے جلا وطن ہونے والے یہودی خیبر جا پہنچے جہاں پہلے سے یہودی ایک طاقتور آبادی موجود تھی۔ یہ لوگ آئے دن کوئی نہ کوئی سازش یا شرارت کرتے رہتے تھے۔ ہجرت کے ساتویں سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی منت نہی کا رستائیوں سے تنگ آکر خیبر کے درجنوں قلعے یکے بعد دیگرے فتح کر لئے۔ مگر یہودی درخواست پر انہیں بطور کاشت کار

باغوں اور زمینوں پر ہر ہائش پذیر رہنے دیا۔ ان کی حقارتی فطرت کے پیش نظر معاہدہ صلح میں یہ شرط رکھ دی گئی کہ جب بھی مسلمان چاہیں گے انہیں خیبر سے بالکل بیدخل کر کے نکال دیں گے۔ لیکن ابھی معاہدے کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی ہوگی کہ انہوں نے حضورؐ اور اصحابؓ کو کھانے میں نہ ہر ہلا کر کھلا دیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک انصاری مسلمان عبداللہ بن سہیل کو خفیہ طور پر قتل کر کے ایک نہر کے کنارے چھپیک دیا۔ خلافت فاروقی میں ان کی سرکشی اور بڑھی حتیٰ کہ انہوں نے عبداللہ بن عمرؓ کو بحالت خواب کوٹھے سے گرا دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ آخر صحابہؓ کے مشورے سے انہیں خیبر سے نکال دیا گیا۔

ترمانہ حال کے یہودی تاریخ اس حقیقت کو روز روشن کی طرح واضح کرتی ہے کہ فلسطین یہودیوں کا اصل وطن نہیں ہے۔ موسیٰ کے بعد یہ لوگ بزدل و شمشیر اس ملک پر قابض ہوئے۔ اور اصل آبادی کا قتل عام کیا تھا۔ شمالی فلسطین میں ان کی مدت قیام صرف چار پانچ سو سال اور جنوبی فلسطین میں آٹھ نو سو برس رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں عرب اس علاقے میں دو اڑھائی ہزار برس سے متوطن چلے آئے ہیں۔ اور انہیں آشوریوں نے اس وقت اس علاقے میں بسایا جب کہ پہلی مرتبہ یہود کو یہاں سے نکال کر مختلف ممالک میں بکیر دیا تھا۔ ان حقائق کے پیش نظر یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ یہ علاقہ ہماری پرانی میراث ہے محض یاد رہتا ہے۔ مسلمانوں نے دنیا بھر میں جہاں کہیں ان کی حکومت رہی دہش مول شام فلسطین ہمیشہ یہودیوں کے ساتھ فیاضانہ اور غیر متعصبانہ رویہ رکھا۔ اس کا صلہ مسلمانوں کو یہ دیا گیا کہ یہودیوں نے اپنے پرانے حریف بلکہ دشمن مغربی ممالک کے عیسائیوں اور روس سے گٹھ جوڑ کر کے یہ علاقہ ہتھیا لیا اور آج یہ مسئلہ دنیا بھر کے لئے ایک خطرناک چیلنج بن چکا ہے۔

مسلمانوں کی کمزوری اور اعادے اسلام کی ان کے ممالک پر یلغار اس سازش کا فوری سبب بنی کہ ۱۹۴۷ء سے یہود نے فلسطین میں جائیدادیں بنانے اور دھڑے دھڑے ادھر ادھر سے دباؤ اگر لبنا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک یہودی لیڈر ہرزل نے باقاعدہ یہودی تحریک کا آغاز کیا جس کا مقصد فلسطین پر قبضہ اور یہیل سلیمانی کی تعمیر نو تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں یہودی لیڈر ڈاکٹر دائرین نے انگریزی حکومت کو یہودی سرہانے اور یہودی قوم کی ہر قابلیت کو اس کے لئے وقف کر دینے کا وعدہ کیا۔ بشرطیکہ جنگ کے اختتام پر فلسطین کو یہودی وطن بنانے کا پختہ وعدہ کیا جائے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ ملعون اور رسوائے عالم دستاویز شائع ہوئی جسے اعلان بالغور کہتے ہیں۔ اس دستاویز کی دوسری یہودیوں کو فلسطین میں بسانے

اور انہیں جان و مال کی حفاظت کا یقین دلایا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں مجلس اقوام نے فلسطین کو انگریزی قبضے میں دے دیا تاکہ یہودیوں کو بسا سنے اور اعلان بائبل کو رد و بھل لاسنے میں آسانی ہو۔ چند ہی سال میں لاکھوں یہودیوں کو دنیا کے دوسرے ممالک سے لاکر وہاں بسایا گیا۔ اب ان کے تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک جا پہنچی۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں یہودی دھڑا دھڑا دھڑا سر قسم کا ساز و سامان اور اسلحہ حاصل کرنے اور لاکھوں دوسرے یہودیوں کو فلسطین میں لا بسا سنے میں کامیاب ہو گئے۔ آخر ۱۹۴۷ء میں مجلس اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین کا ملحدانہ فیصلہ کر دیا اور یہودیوں کو قومی وطن نہیں بلکہ ایک قومی سلطنت عطا کر دی۔ اس سلطنت کو مغربی اقوام اور روس دونوں کی اشیر باد حاصل تھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک امریکہ اور دیگر اقوام مغرب یہودیوں کی سرپرست بن چکی ہیں۔ روس بھی عملاً اس یہودی ریاست کا حامی ہے گو مسلم ممالک کو کچھ ہنرمند کے جال میں پھانسنے کے لئے بظاہر کبھی کبھی اس کے خلاف بھی کھتا رہتا ہے۔ بعد کے واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ مسلم ممالک کی ناف پر اس ناسور کو مسئلہ کرنے اور مسلمانوں کو ہر طرح کمزور کر کے یہودیوں سے مروانے کی پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں مستقبل میں کیا ہوگا لیکن اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ شاید کسی وقت یہ اسرائیل کا مسئلہ ہی تیسری خوفناک عالمی جنگ کا پیش خیمہ بن جائے گا۔

یہودی لٹریچر یہودی لٹریچر سے ہماری مراد قوم یہود کا مذہبی و ذخیرہ کتب ہے۔ ان کتب میں یہودی لٹریچر کا بول کے علاوہ کسی اور کتاب مثلاً خالص تاریخی یا ادبی (فلم و نثر) پر بحث مطلوب نہیں۔ یہود کے مذہبی و ذخیرہ کتب کی بنیادی کتاب بائبل کا پہلا حصہ ہے۔ جسے عہد نامہ قدیم یا عتیق کہا جاتا ہے۔ بائبل کا دوسرا حصہ یعنی عہد نامہ جدید یہودی کتب پر نہیں بلکہ عیسائی انجیل اور دیگر مذہبی صحائف پر مشتمل ہے۔ بائبل کا لفظی معنی کتاب مقدس کا لگایا ہے۔ اصل نسخہ کا حال تو اللہ جانے مگر اس کے تراجم دنیا کی بیشتر زبانوں میں ملتے ہیں اور ان میں وقتاً فوقتاً ترمیم و اضافہ اور تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ عہد نامہ قدیم کی کتابوں کی ترتیب یہ ہے : (۱) تورات — جس کا لفظی معنی قانون ہے — اس میں یہ پانچ کتابیں شامل ہیں۔ پیدائش، خروج، ابرہ، اعداد، استثناء و معلوم رہے کہ یہ تورات اصل تورات نہیں جو کہ ویش چار یا پنج بار دنیا سے جل کر اور تباہ و برباد ہو کر ناپید ہو چکی ہے۔ یہ بعد کی پیداوار ہے کہا جاتا ہے کہ عزرائل کا حصہ — عزرائلی — کے اسے اسپرٹ بائبل سے روٹی کے بعد موسیٰ سے کافی عرصہ بعد اپنی زبانی یادداشت سے لکھا تھا۔ اس کی طرف اوپر اشارہ کر رہا ہے۔

درجہ نبیہم جس میں بائیس کتابیں شامل ہیں۔ بعض خالص تاریخی اور بعض انبیاء کی طرف منسوب ہیں۔ مثلاً یسع، قشاشہ، سموئیل اول و دوم، سلطین اول و دوم، تواریح اول و دوم، یسعیاہ وغیرہ۔ دوسرے کتب میں بارہ کتابیں شامل ہیں: زبور، امثال سلیمان، ایوب، یسعیاہ، نعجیاہ، دانیال، حزقیل، نوہ وغیرہ۔ یہ کل ۹ کتب ہیں جو کہ ان کے علاوہ یہودی مذہبی کتابوں میں لکھ کر ذکر بار بار آتا ہے۔ یہ ان روایات، قصص و حکایات، مذہبی احکام، جملہ اور غیرہ کے مجموعے کا نام ہے جو یہودیوں میں سینہ بسینہ چلا آیا اور دوسری صدی عیسوی میں ایک یہودی عالم پرورداتی نام سے جمع کر ڈالا۔ اس کا نام مشتاقا۔ بالفاظ دیگر اسے تورات کی تفسیر کہہ سکتے ہیں۔ اس مجموعے کی مزید تشریح ہوتی رہی اور اُسے جمع کیا گیا تو اس کا نام لکھا آد رکھا گیا۔ ان دونوں مجموعوں کو ملا کر لکھا جاتا ہے۔ تاملو دلی و اقسام ہیں: ایک شاکی جو فلسطین میں تیار ہوا دوسرا بائبل جس کا مواد بزمائے اسی لایبل اکٹھا ہوا۔ یہودیوں میں دونوں معتبر اور مستعمل ہیں۔ مگر اختلاف کے وقت ترجیح شامی کو دیتے ہیں۔

یہ بھی معلوم رہنا لازم ہے کہ عہد نامہ قدیم کے دو نسخے ہیں: ایک عبرانی نسخہ جو یہودیوں میں مستعمل اور لائق اعتقاد ہے۔ دوسرا نسخہ یونانی ہے جسے سینیون کہہ جاتا ہے اور عیسائیوں میں معتبر و مستند ہے۔ عیسائیوں کے معتبر نسخے میں بھی پھر ان کے دو بڑے فرقوں کی تفرک اور پیرسٹنٹ کے نزدیک و اکتب متنازعہ یہ ہیں کیونکہ انہیں صحیح مانتے ہیں۔ اور پیرسٹنٹ جعلی قرار دیتے ہیں۔ جو کتب صرف یونانی نسخے میں زائد ہیں انہیں آپا کر لیا گیا حقیقت تحریر میں کہا جاتا ہے۔

موجودہ بائبل کی کتابوں میں بعض ان کتب یہود کا ذکر یا حوالہ موجود ہے جو شامل مجموعہ نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کتابیں کم ہو چکی ہیں۔ ان کی تعداد ڈیڑھ درجن تک جا پہنچی ہے۔ غرض بائبل کی کتب موجودہ و غیر موجودہ کا معاملہ بہت مشکوک ہے۔ ان کتابوں میں بے شمار تناقضات بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کی تفصیل علامہ ابی حزم ظاہری نے الفصل میں درج کی ہے۔ اس سے بھی زیادہ تفصیل و وضاحت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب اظہار الحق میں موجود ہے۔ یہ کتاب واقعی لا جواب ہے۔ اور اس کا اردو ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ ابتدائی پانچ کتابیں — یعنی تورات — بھی تحریف اور ترمیم و اضافہ کا شکار ہوئی ہیں۔ اس میں کئی تضاد ہیں۔ خود موسیٰ کی وفات کا ذکر ہے اور لکھا ہے کہ: آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کتاب موسیٰ کی وفات کے کافی عرصہ

بعد مدتوں ہوئی تھی۔ اس کتاب میں بعض ایسے واقعات بھی درج ہیں جو بعد میں پیش آئے۔
تورات اور کتاب بائبل کی تحریف ولفاد کو خود مسیحی علماء بھی تسلیم کرتے ہیں اور اس کا ہر ملا
اظہار بھی۔

یہود کی عبادت گاہیں مشہور یہود سلیم میں وہ مشہور معبد تیار نہیں کیا جس کا نام
بیت المقدس ہے، اُس وقت تک یہودیوں کی کوئی مستقل عبادت گاہ نہیں تھی۔ مگر سے
نکل کر جب تک فلسطین میں فاسخانہ داخل نہیں ہوا، سفر و حضر میں مراسم عبادت ایک
عارضی معبد کے سامنے ادا کی جاتی تھیں۔ اس کا انتظام ہارون کے ہاتھ میں تھا جو ان کی وفات
کے بعد ورثہ ان کی اولاد کو منتقل ہوا۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ کعبۃ اللہ اور
بیت المقدس کی تعمیر کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ تھا۔ ان احادیث کو اس لحاظ سے
منہایت مشکل سمجھا گیا ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر سلیمان نے کی جن کا زمانہ ابراہیم علیہ السلام
کے سینکڑوں برس بعد کا ہے۔ بعض اہل تحقیق کی یہ رائے منہایت درست معلوم ہوتی ہے
کہ موجودہ بیت المقدس بالکل اُسی مقام پر تعمیر ہوا ہے جہاں پر تورات میں حضرت یعقوب
کا بیت ایل بنا نا وارد ہوا ہے۔ اور تعمیر کعبہ سے لے کر یعقوب کے اس واقعہ تک چالیس
ہی برس ہوئے ہیں۔ بیت المقدس کے علاوہ یہودیوں کی اور کوئی عبادت گاہ نہ تھی۔ جب
تک سامریہ اور اسرائیل دو متقارب سلطنتیں وجود میں تھیں آگئیں اس زمانے تک تمام
یہودی زیارت اور قربانی وغیرہ کی خاطر بیت المقدس ہی میں آیا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں
جب ایک حکومت کی دو بن گئیں تو پہلی رسم پر عمل ممکن نہ رہا۔ اسی طرح جو یہودی ایسیر
بائبل کے زمانے میں بیت المقدس سے دور تھے۔ یا دنیا میں اور اور منتشر تھے ان کے
سلسلے دوسری عبادت گاہوں کا سوال آیا۔ چنانچہ سامریہ والوں، بائبل میں قید ہونے
والوں اور مختلف ممالک میں بکھرے ہوئے یہودیوں نے اپنی اپنی عبادت گاہیں بنالیں
گزارت اور قربانی کے لئے پھر بھی بیت المقدس ہی کو مرکز مانا جاتا رہا۔ ان معبدوں میں
زیر و بیل کا معبد بہت مشہور ہوا جو کہم و بیش ۵۵ برس قبل مسیح میں تعمیر ہوا پھر شہنشاہ
ہیردوس نے ایک اور عبادت گاہ تعمیر کی جو طول و عرض میں بے مثال بنائی جاتی ہے۔
گردش زمانہ کے ساتھ یہودیوں میں ایک قسم کی مرکز گریزی کی کیفیت پیدا ہوئی تو
ہر آدمی میں الگ الگ عبادت گاہیں تعمیر ہونے لگیں۔ یہ وعظ و تبلیغ اور مذہبی مشاوت

کے مرکز تھے جنہیں **SYNAQUE** کہا گیا ہے۔ سنہ میں بیت المقدس کی مکمل تباہی کے بعد ایک یہودی رہتی نے جاتیہ کے مقام پر ایک مدرسہ بنایا جس کی حیثیت بعدوں ایک مقدس مرکز کی ہو گئی۔ اسی قسم کے مدارس دوسرے مقامات پر بھی تعمیر ہو گئے۔

دیگر ادیان و مذاہب کی طرح یہودی بھی فرقہ پرستی کا شکار ہوئے۔ **یہودیوں کے فرقے** اور ان کے مختلف فرقوں میں اختلاف ہوا ہے۔ بحث نبوی

کے زمانے میں یہود کا ایک فرقہ مدینہ میں موجود تھا جو عربوں کو ابن اللہ ماننا تھا۔ قرآن نے سورہ توبہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور اس وقت کے یہودیوں نے کبھی اس کی تردید کی جرات نہیں کی اس فرقے کا ذکر تاریخ میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح سنہ میں بیت المقدس کی بربادی کے بعد یہودیوں کی از سر نو شیرازہ بندی کے لئے ایک یہودی عالم نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ تمام یہودیوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اور دوحی سلطنت کے خلاف بغاوت کر دی لیکن ۳۷ء میں اس وقت کے رومی بادشاہ قیصر ہیٹیرین نے انہیں مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ بچے بچے لوگ دنیا کے مختلف ممالک میں بھاگنے اور منتشر ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔ ہیسکیلیمانی ہمیشہ کے لئے دھوا کر پوینڈ خاک کر دیا گیا۔ اس کی از سر نو تعمیر سنہ ۶۷ء سے کہ اب اسرائیل میں ہو رہی ہے۔ ان کے علاوہ یہودیوں کے درج ذیل فرقے مشہور ہیں اور دوسروں سے الگ متکلم رہنے والے لوگ تھے۔ نہ خود حوام میں

سحارینی فرقہ | غلط فطرتوں کے نہ کوئی دوسرا ان کے قریب آتا تھا۔ انہیں "سوشلسٹ یہودی" کہا جاتا ہے۔ تنہائی کی زندگی گزارنا، شادی بیاہ نہ کرنا، کرنی مال و متاع اور جامد اور منکھ، یعنی حملوں کو چیزوں کو سب میں مشترک رکھنا ان کے خصائص تھے۔

الیسینی فرقہ | یہ لوگ ایمان کو علم پر مقدم نہیں رکھتے۔ ان کے ہاں باعث نجات علم ہے نہ کہ ایمان۔ انہیں آپ یہودی مذہب کا درخشاہری فرقہ، کہہ لیجیے۔ معافی سے زیادہ کارائی فرقہ | الفاظ پر اور ظواہر و قرات پر سختی سے کار بند رہتے تھے۔ غالباً انہی کو **کاتب یا SCRIBES** بھی کہا گیا تھا۔

یہ ترم یہود کے فقہاء اور قانون دان تھے۔ کتب مقدسہ کے علاوہ زبانی روایات فریسی فرقہ | کے بھی معتقد تھے۔ مابد و زائد اور متقی مشہور تھے۔ آخرت کی زندگی اور جوار و سنا کے قابل تھے۔ یہودی لٹریچر میں آخرت یا جنت و دوزخ کا کوئی ذکر نہیں ملتا، شاید

اصل کتابوں کی بربادی کے بعد از سر نو تدوین کے وقت جان بوجھ کر ایسا کیا گیا کیونکہ یہودی قوم مادہ پرست اور نسلی تفریق کی قائل تھی۔ ان کے نزدیک بنی اسرائیل اللہ کے پیارے فرزند ہونے کے باعث عذاب سے یکسر بری ہیں۔

صدوقی فرقہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ صرف رب الیہود ہے۔ جنت و دوزخ، قیامت ضروری ہے، اور ان میں ترمیم و اضافہ ناجائز۔

فلسفیانہ مکاتب فکر اگتھیوں کو سمجھانے کا نام ہے۔ دنیا کے دیگر پیروان مذاہب کی مانند یہودی بھی یونانی فلسفہ سے متاثر ہوئے۔ اس تاثر کی کار فرمائی ہمیں بائبل میں نظر آتی ہے۔ بعض کتب و صحائف تو سراسر فلسفیانہ ہیں۔ بعض یہودی عالم افلاطون کے فلسفہ سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ اس کے داعی و مبلغ بھی بنے۔ کچھ اور لوگ ارسطو کے فلسفہ کے شیدائی تھے۔ بعد کے یہودی علماء میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو مسلمان فلاسفہ سے متاثر ہوئے اور ان کے اسلامی فلسفہ علم کلام کو اپنے علم و تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ ہر علم و فن کی مختلف شاخوں میں مشہور یہودی فلاسفہ کے نام ملتے ہیں۔ بعض مسلم فلاسفہ کی مانند یہودیوں نے بھی بائبل کے نظریات کو فلسفہ کے مطابق قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں میں علامہ ابن رشد اندلسی کا نام مشہور ہے۔ جس نے اسلامی عقاید و تعلیمات کو فلسفہ کے اور فلسفہ کو اسلامی تعلیمات کے مطابق قرار دینے کے لئے تاویل کا سہارا ڈھونڈا تھا۔ بہر حال دنیا کے مشہور فلاسفہ کی فہرست میں ہمیں کئی یہودی علماء کے نام بھی ملیں گے جس سے ہم ان کے علمی ذوق اور تحقیق کے شغف کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

یہودیوں کے عقائد انبیاء کی تعلیم پر نظر ڈالیں تو عقیدہ توحید صاف نظر آتا ہے۔ مگر آتنا واضح اور اجل نہیں جتنا اسلام نے اُسے پیش کیا ہے۔ یہودیوں کے ہاں خدا کو رب و غم، پچھتاوا، تھکن اور اسی طرح کے دوسرے انسانی عوارض لاحق ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً سبت اُن کے نزدیک تخلیق کائنات سے فارغ ہو کر خدا کے آرام کا دن تھا۔ لہذا شریعت موسوی نے اسے عبادت کا دن قرار دیا۔ نوح کے وقت میں لوگوں کا شرک

و کفر اور بدکاری دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو تخلیق انسان پر پچھتانا پڑا۔ خدا نے رات بھر یعقوب سے کشمی لڑی اور پنج برابر رملہ۔ خدا یہود کے قافلے کے آگے آگے چلا کرتا تھا۔ آدم کے وقت میں خدا کے بیٹے خدا کی بیٹیوں سے تعلق کر کے انسانی نسل میں اضافہ کرتے رہے۔

جہاں تک رسالت کا تعلق ہے یہودیوں نے سچے اور جھوٹے نبیوں کا اقیانوس ڈال دیا ہے۔ ان کے لٹریچر میں کذاب اور دجال انسانوں پر بھی نبی کا لفظ بولا گیا ہے۔ انہوں نے بڑے بڑے عظیم پیغمبروں پر جو شک و کفر، شرب خوری، جھوٹ، دھوکا فریب، زنا کاری، شہوت پرستی اور بُت گردی و بت پرستی کے الزام لگائے ہیں انہیں پڑھ کر پتہ چل سکتا ہے کہ یہودیوں میں عصمتِ انبیاء کا کوئی عقیدہ نہیں، اور وہ ہر قسم کے آوارہ مزاج — معاذ اللہ — لوگوں کی نبوت و رسالت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

یہودیوں کا مذہب ایک نسلِ خدا کا تصور پیش کرتا ہے۔ جو رب العالمین کے بجائے صرف رب بنی اسرائیل ہے۔ اسی طرح وہ نسلِ رسالت کے قائل ہیں۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے ایمان نہ لانے کا بڑا سبب یہی تھا کہ آپ اسلامِ علی کے بجائے اسماعیلی تھے۔ لیکن اس بات کا ان کے ہاں کوئی جواب نہیں کہ عیسیٰ مسیح تو اسرائیلی تھے۔ انہیں کیوں نہ مانا؟

آخرت اور جنت و دوزخ کا ذکر یہودی لٹریچر میں نہیں ملتا اگر ملتا ہے تو دھندلے انداز میں۔ وہ صاف ظاہر ہے کہ جب خدا صرف ایک نسل کا خدا ہے تو وہ نسل پاک اور بخشی ہوئی ہے۔ اصل معاملوں نظر آتا ہے کہ آخرت اور عذاب و ثواب کا قائل ہونے کے باوجود ان کا مادہ پرستی اور بندگی نفس جملہ ان عقاید کو کتب مقدسہ سے نکال دینے پر اکسا یا ہوگا۔ وہ فرشتوں کے قائل تو ہیں مگر ان کے متعلق عجیب و غریب توہمات کا ذکر بائبل میں ملتا ہے۔ وہ جبریل کے دشمن ہیں کیونکہ اُس نے اُن پر بار بار ان کی سرکشی کے باعث مذابِ راہی کا کوڑا برسایا تھا۔ ان کے ہاں ایک نجات و منہد مسیح موعود کا عقیدہ اب تک موجود ہے۔

توریت کے حکم کے مطابق یہودیوں میں ہر نومولود کا غنہ پیدائش یہودیوں کی مذہبی رسوم کے بعد آٹھویں دن کیا جاتا ہے۔ یہ حکم موجودہ بائبل کی کتاب پیدائش میں بھی موجود ہے۔ ان کے ہاں جوتیو ہار بطور رسوم مذہبی منائے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) ہر سال عیسوی کی ۱۵، ۱۶ اپریل کو عید فصح — مہرے رانی اور چمکار کے عید — منائی جاتی ہے۔ (۲) ستمبر کے مہینے میں یہودیوں کے سال نو کا نہوار منایا جاتا ہے۔ ۱۱/۵۶ فروری کو یامان

فرعون کا وزیر — کے ہاتھ سے تیج جانے کی خوشی میں پوریم کی عید ہوتی ہے۔ (۸) یہودی سالہ
 یہود امکا میس کے شامیوں کے لشکر پر فتح پائی کی خوشی میں چونو کا دہ کا دن منایا جاتا ہے۔ (۵)
 سبت کا دن تورات کے حکم کے مطابق ہر کام سے فارغ ہو کر صرف عبادت میں گزارتے ہیں۔
 (۶) موجودہ یہودی اسرائیل کی سلطنت کے قیام کی یاد میں جشن مناتے ہیں جسے یوم باتنز موت کہا
 جاتا ہے۔ (۶) عید فصح کے بعد ۵ ویں دن یوم خمیس مناتے ہیں اس دن نئے گیہوں کی
 دو روٹیاں پیواؤں کے آگے لہرا کر پروست — کاھن — کھالیتا ہے۔ سات جھڑیوں یا ہیل
 اور دوسرے ذبح کر کے غرابار و مساکین کی دعوت کی جاتی ہے۔ (۸) یہودیوں میں بے شمار سوختنی
 اور غیر سوختنی قربانیاں ہوتی ہیں۔ ان کا طریقہ اور پیچیدہ رسم کتاب خروج اور اشعار میں
 درج ہیں۔ سوختنی قربانی میں جانور جلادیے جاتے تھے۔ غیر سوختنی قربانی میں کچھ اجناس اور تیل وغیرہ
 قربان گاہ پر پیش ہوتا تھا۔ سوختنی قربانی عموماً گناہوں کا کفارہ بھی جاتی تھی۔ جب یہودیوں میں
 ان قربانیوں کی ادائیگی کا زیادہ سی رواج ہو گیا اور انہوں نے اسی کو اصل مذہب قرار دے لیا تو
 موسیٰ کے بعد دوسرے امیلے اس بد بھان کو رد کیا اور بنیادین نقطہ ہر پرستی کا نام نہیں بلکہ
 دل غلوں اور پختہ ایمان کا نام ہے۔ اب غالباً یہودیوں کی رسم پر اتنا تعدد نہیں دیا جاتا۔
 (۹) یہودی سات کے عدد کو مقدس سمجھتے ہیں۔ لہذا سبت کی طرح ساتواں مہینہ بھی مبارک سمجھتے
 ہیں۔ اسی مہینے میں قربانی دگنی کر دیتے ہیں۔ زمین کو ساتویں سال جو نیا چھوڑ دیتے ہیں۔ قرض معاف
 کر دیتے یا ادائیگی میں مزید مہلت دے دیتے ہیں۔ دعوتیں ہوتی ہیں۔ اور لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا
 ہے۔ (۱۰) ساتویں سال کے بعد ہر پچاسویں سال کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ غلام آزاد کرتے
 اور مرصونہ جاندار اصل مالک کو لوٹا دیتے ہیں۔

بعض معاشرتی احکام | بائبل کی کتاب خروج کے مطابق اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام
 کی معرفت بنی اسرائیل کو یہ دس احکام دیئے تھے۔ جن کو احکام
 عشرہ کہا جاتا ہے۔ (۱) والدین کی تعظیم (۲) قتل سے گریز (۳) زنا سے اجتناب (۴) چوری سے
 پرہیز (۵) ہمسائے کے خلاف جھوٹی گواہی دینے سے پرہیز (۶) ہمسائے کے گھر کے لالچ سے گریز۔
 (۷) پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا (۸) پڑوسی کے غلام اور لڑکھائی کا لالچ نہ کرنا (۹) پڑوسی کے جانوروں
 کا لالچ نہ کرنا۔

شریعت موسوی میں عورت کا درجہ مرد سے بہت کم ہے۔ اس کا مالک خاوند ہے اور وہ
 اس کی غلامی ہے۔ شادی سے قبل وہ والدین کی ملک میں ہوتی ہے اور شادی کے بعد خاوند کی۔

یہی سبب ہے کہ زنا اور اغما کے مقدمات میں اکثر جرمانے کی سزا مقرر ہے۔ صرف بعض صورتوں میں رجم کی سزا کا حکم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان مقامات میں بھی اصل کتاب میں تحریف کی گئی ہے۔ واللہ اعلم حق تعالیٰ کا حکم بائبل میں موجود ہے۔ تعدد ازواج کی اجازت ہے۔ بائبل کی کتابوں میں بعض پیغمبروں کی سینکڑوں تک بیویاں بتائی گئی ہیں۔ طلاق کے احکام بھی بائبل میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تو چند معاشرتی احکام ہیں۔ جنگ کے احکام، غیر قوموں سے سلوک کا حکم، جنگی قیدیوں کے احکام، مفتوح اقوام کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کے احکام مہانت شد بد ہیں۔ جنہیں چڑھ کر دو لگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ پاکیزگی، ذبح کرنے اور سود کی ممانعت کے احکام بھی موجود ہیں۔ مگر سود کے سلسلے میں تورات کے احکام میں تحریف کر کے غیر اسرائیلی لوگوں سے سود لینا حلال قرار دیا گیا ہے۔ خنزیر کا گوشت حرام کیا گیا ہے۔ اور یہ حکم موجودہ بائبل کی کتابوں میں واضح طور پر موجود ہے۔

عیسائیت

تعارف اسلامی عقیدے کی رُو سے تمام پیغمبروں کی دعوت اسلام کی طرف متھی۔ جس طرح مرد و زمانہ سے انبیائے نبی اسرائیل کے پیش کردہ دین کو یہودیت کا نام ملا اسی طرح عیسائیت کا معاملہ بھی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت میں ہمیں کوئی نیا عقیدہ نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ عیسائیت یا نصرانیت کے داعی تھے۔ اناجیل اربعہ یا عہد نامہ جدید کی کسی اور کتاب میں یہ اصطلاح نظر نہیں آتی۔ عیسیٰ علیہ السلام کے دور تبلیغ میں اور اس کے بعد بھی ایک عرصے تک یہی نظر آتا ہے کہ وہ یہودیوں کی پیدا کردہ دعوات کا انکار کر کے اصل الہی دین کو قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہودی کافی عرصے تک پیروان مسیح کو اپنا ہی ایک جزو سمجھتے رہے اور خود پیروان مسیح نے بھی اس سلسلے میں کوئی دوسری وضاحت نہیں کی۔ عیسائیت اور نصرانیت کے الفاظ بعد میں ایجاد ہوئے۔ مسیح کے وہ پیرو جو یہودیوں سے نکل کر ان کی جماعت میں شامل ہوئے تھے۔ فلسطین میں پہلے پہل یہودیوں کے انہیں امتیاز کی خاطر یہ مسیح ناصر کی کہ پروردگار کا لقب دیا۔ ناصرو یا نزارتہ اس مقام کا نام تھا جس میں عیسیٰ علیہ السلام بچپن میں اپنی والدہ کے ساتھ کچھ عرصہ ٹھہرے تھے، اسی نسبت سے انہیں ناصر کہا گیا تھا۔ عیسائی کا لفظ ان غیر یہودی رومانی الاصل لوگوں کے لئے استعمال ہوتا تھا جو یہودیوں کی تفسیر

ہے بچنے کی خاطر مسیحیوں سے نکل کر ایک ساعلی مقام انطاکیہ میں آ مقیم ہوئے تھے۔ انہیں لوگوں کے عقائد سے ملنے بجلتے خیالات و عقاید پلوٹوس (سینٹ پال) تک بھی گئے جسے موجودہ عیسائیت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ یونانی الاصل عیسائی اور پائی اس بات پر متفق تھے کہ یہودی شریعت پر عمل کرنا عیسائی کی بچت کے بعد ضروری نہیں رہا اور سجات کے لئے صرف عیسائی پر ایمان لانا ان کی پیش کی ہوئی وضاحت و تفصیل کے مطابق کافی ہے۔ غرض یہ ان القاب کی مختصر ابتدائی تاریخ ہے۔ اب عیسائیوں کے تمام فرقوں پر انہی الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے اور ان کا مذہب عیسائیت یا نصرانیت کہلاتا ہے۔

تعریف جہاں تک عیسائیت یا نصرانیت کی تعریف کا تعلق ہے، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ عیسائیت میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ عیسائیت وہ مذہب ہے جو اپنی اصلیت کو ناصروہ کے باشندے یسوع کی طرف منسوب کرتا ہے اور اسے خدا کا منتخب قرار دیتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف لیجن میں اسی نام کے مقالے میں مسٹر الفریڈ ای گاروس نے لکھا ہے کہ عیسائیت کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ اخلاقی، تاریخی، کائناتی و موجدانہ اور کفار سے پر ایمان رکھنے والا مذہب ہے جس میں خدا اور انسان کے تعلق کو خداوند یسوع مسیح کی شخصیت اور کردار کے ذریعے سے پختہ کر دیا گیا ہے۔ اخلاقی سے مراد یہ ہے کہ اس مذہب میں عبادتوں اور قربانیوں سے کوئی دیوی مقصد حاصل کرنے کے بجائے یہ بتایا گیا ہے کہ مذہب کا مقصد اعلیٰ روحانی کمال حاصل کرنا اور خدا کی رضا طلب کرنا ہے۔ تاریخی کا مطلب یہ ہے کہ اس مذہب میں بنیادی حیثیت ایک تاریخی ہستی یعنی عیسیٰ یسوع مسیح کو حاصل ہے۔ کائناتی سے مراد یہ ہے کہ یہ مذہب عالمگیر دعوت پیش کرتا ہے۔ کسی رنگ یا نسل کے ساتھ مخصوص نہیں۔ موجدانہ کا مطلب یہ کہ عقیدہ تخلیق کے باوجود اس میں ایک خدا کا تصور پایا جاتا ہے۔ کفار سے مراد یہ ہے کہ اس میں انسان کو کفار سے کے ذریعے خدا کے قریب کیا گیا ہے۔ کیونکہ گناہ کے باعث وہ اس سے دور ہو چکا تھا۔

اس تعریف میں تعریف کم اور تبلیغ زیادہ ہے۔ مشرک قوموں نے اپنے شرک کو ہمیشہ فلسفیانہ مشرک گنیوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ہندوؤں جیسی بت پرست قوم کے پڑھے لکھے لوگ بھی کہنے کو ایک ہی خدا مانتے ہیں مگر ان احق یہ تسلیم کرے گا کہ وہ واقعی موجد ہیں؟ عیسائی علماء و فضلا عقیدہ تخلیق کا جو بھی نام رکھیں اور اس کی

جو بھی تاویل یا تشریح کریں، بہر حال یہ ایک صریح شرکیہ عقیدہ ہے۔ اندر سے خود انہیں بھی اس تضاد کا احساس ہے۔ مگر بات بنانے کی کوشش میں وہ ادھر ادھر کے تاویلوں کا سہارا لیتے ہیں۔ تشبیہ پر مفصل گفتگو انشاء اللہ آگے آئے گی۔ غرضائیت کے متعلق بعض علماء کا یہ خیال بھی قابلِ لحاظ ہے کہ یہ لفظ ناموسہ سے نہیں بلکہ حوائیوں کے قول: **تَحْنُ أَنْصَارُ** (ہم دینِ آلہی کے مددگار ہیں، اور **تَحْنُ أَنْصَارُ**) انہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ (مددگار آلہی مسیح) ہیں، سے ماخوذ ہے۔

بعثت عیسوی کا پس منظر عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہودی قوم اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور خالص دینی نقطہ نظر سے پستیوں کی انتہاء گہرائیوں میں گر چکی تھی۔ ان کے علماء شکر پرست، مشائخ، مادہ پرست اور عوام قوم پرست ہو چکے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے پیغام کے ساتھ ان کا تعلق ہرائے نام رہ گیا تھا۔ ان کی نافرمانیوں، بد اعمالیوں اور قانونِ الہی کی علانیہ مخالفت کے باعث کئی مرتبہ عذابِ خداوندی کا کوڑا برس چکا تھا۔ مگر انہوں نے اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا تھا۔ اسیریِ بائبل کے بعد جو یہودی شہنشاہ سائرس کی نوازشات کے نتیجے میں فلسطین میں آئے تھے۔ ان میں عرانی مشرکوں کے اندر ایک عزمِ گزرنے کے باعث بے شمار مراسمِ شرک و کفر پیدا ہو چکی تھیں۔ جو لوگ بائبل ہی میں رہ بس گئے تھے وہ کسی بہتر مستقبل کی امید سے خالی ہو چکے تھے۔ یہودی رنجی اور عالم اس زوال زدہ قوم کو ایک موعود شاندار مستقبل کی امیدیں کراؤم کی غذا پر زندہ رکھنے کی سعیِ ناکام کر رہے تھے۔ کچھ مدت کے بعد اس منغوب قوم پر غضبِ خداوندی کا ایک اور چابک دھنسی کے محلے اور برو شیم اور قدس کی مکمل تباہی کی صورت میں برسے والا تھا۔ پیمانہ بھر چکا تھا بس اب لبریز ہوا چاہتا تھا۔ یہودی میں ایک نجات دہندہ مہیسا کا انتظار تھا۔ جہاں کے خیال کے مطابق بنی اسرائیل کی شیرازہ بندی کر کے از سر نو انہیں سیاسی و مادی قوت دلانے کا کفیل تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد آسمانی بادشاہت کا جو تصور ان کے پیروؤں میں جاگزیں ہوا، یہود کا تصور مہیسا اس کے بکسر برعکس تھا۔

اس دور کے یہودیوں کی نام نہاد دینی حالت کا اندازہ کچھ ان مواظلوں و تقاریر اور عیسیٰ کے ساتھ ان کے سوال و جواب سے ہو جاتا ہے۔ جو انجیل میں موجود ہیں۔ بقولِ عیسیٰ: وہ دیکھا کرتے تھے، علو پر پرست تھے، منافق تھے، خدائی احکام کو پس پشت ڈال کر انسانی احکام پر عمل کرتے کرتے اور آلہی کی تعمیل دیتے تھے۔ مادہ پرستی نے ان کے دلوں کو زنگ آلود اور سخت کر دیا تھا

قرآن کے بیان کے مطابق ان کے دل: **كَا نَحْبَاكَ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً** پتھروں جیسے بلکہ ان سے بھی سخت تر تھے۔ انہوں نے تو رات میں تحریف اور رد و بدل کو شب و روز کا شیعہ بنا لیا تھا۔ اول تو تو رات پر جو تباہی کے متعدد حوادث گزر چکے تھے ان کے باعث وہ محض زبانی یا دواشتوں کا مجموعہ رہ گئی تھی، پھر یہودی اس کے احکام میں سنت نبیؐ تبدیلیاں اپنی شکم پرستی اور دنیا دار چہ بدلیوں کی خوشنودی مزاج کی خاطر کرتے تھے۔ انہوں نے "بڑے لوگوں" کی خاطر تو رات کے احکام پر بھی اور قوانین جرائم کو عملاً منسوخ کر رکھا تھا، حالانکہ یہ احکام اب بھی تو رات کی مختلف کتب میں موجود ہیں۔ قرآن نے ان پر جو فرد قرار و جرم لگائی ہے اس میں سود خوری رشوت خوری، حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنا، تھیل انبیاء خدا کے برگزیدہ بندوں پر جھٹان طرہ تحریف کتاب، اپنی بناوٹ کو کتاب الہی قرار دینا، نسلی غرور، خدا کے محبوب اور بیٹے بن بیٹھا، آخرت کی نجات کی اجارہ داری، حسد و بغض کے باعث انبیاء کی تکذیب، طاغوت کی عبادت کرنا، مبت پرستی، گوسالہ پرستی اور بار بار کی تہنہات اور عقوبات کے باوجود ڈھٹائی اور سینہ زوری شامل ہیں۔ الہامی مذاہب و ادیان کے ماننے والوں میں ان کے سوا کوئی دوسری قوم ایسی نظر نہیں آتی جس میں اخلاقی و دینی زوال کی اتنی پستیاں پائی جاتی ہوں۔

عیسیٰ کی پیدائش اور بعثت | عیسیٰ کی والدہ مریم کے باپ کا نام عمران تھا۔ عمران کا نسب اور قبیلہ نامعلوم ہے۔ البتہ مریم کی ماں حنہ اور یحییٰ کی والدہ ایشاع سگی بہنیں تھیں۔ اور ہارون علیہ السلام کی اولاد سے تھیں۔ بائبل کی رو سے موسیٰ علیہ السلام نے عبادت گاہ کا انصرام اور رسوم عبادت و قربانی کی ادائیگی کا انصرام ہارون کے ذمہ کر رکھا تھا۔ وہ مجاہد کے کاہن اعظم تھے۔ ان کے بعد یہ منصب ان کی اولاد میں وراثتہ پلتا رہا۔ یحییٰ کے والد زکریا کے متعلق بھی ثابت ہے کہ وہ بیت المقدس کے کاہن تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یحییٰ تو ماں باپ دونوں کی طرف سے ہارونی تھے۔ مگر عمران کے قبیلہ کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ غرض مریم اور یحییٰ خالہ زاد بہن بھائی تھے۔ اسی رشتے کی بناء پر احادیث میں یحییٰ اور عیسیٰ کو خالہ زاد فرمایا گیا ہے۔ جب ایشاع باوجود بوڑھی اور باجھ ہونے کے باز اللہ زکریا سے حامل ہوئی (زکریا) اس وقت خود کافی بوڑھے ہو چکے تھے، تو اس معجزانہ عمل نے حنہ کے دل میں اولاد کی طلب پیدا کی۔ اس زمانے میں لوگوں کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے نامزد و حقہ کرنے کا رواج تھا۔ حنہ نے اپنے پیٹ کے بچے کو اسی خیال سے بیت المقدس کی نذر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اسے فرزندانہ عزیز عطا کرے گا۔ مگر جب مریم پیدا ہوئی تو حنہ کو تعجب ہوا، آخر نذر کے

مطابق اسے بیت المقدس لے جایا گیا اور قہر انداز ہی سے مریمؑ کے خالوز کر گیا کو اس کا مرتبی اور نگران مقرر کیا گیا۔ مریمؑ بڑی پاکباز، عقیقہ اور عبادت گزار معنی۔ جب وہ جوان ہوئی تو فرشتوں نے اسے عیسیٰ کی پیدائش کی بشارت دی۔ اس کے اظہار تعجب پر فرشتوں نے خدا کا حکم سنا دیا کہ یونہی ہوگا۔ مریمؑ بہت غمگین ہوئی اور بیت المقدس کو چھوڑ کر بیت اللحم چلی گئی تاکہ لوگوں کی سب و شتم اور بدنامی سے بچے رہے۔ انجیل کا بیان ہے کہ مریمؑ کا نکاح یوسف بنحاز نامی ایک شخص سے ہو گیا تھا اور وہی مریمؑ کو بدنامی کے خوف سے بیت اللحم لے گیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ انجیل عیسیٰ کا نسب نامہ یوسف بنحاز سے (بیمشیت والد) شروع کرتی ہیں۔ کتاب و سنت میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اور یہ بات بھی حیرتناک ہے کہ عمر بھر کے لئے معبد کی خدمت کے لئے وقف کی جانے والی لڑکی کا نکاح کیسے کر دیا گیا اور وہ بھی ایک غیر معروف شخص کے ساتھ!!

بہر حال مریمؑ نے بیت اللحم میں عیسیٰؑ کو جنم دیا۔ ولادت کے بعد مریمؑ بچے کو قوم کے سامنے لائی اور لوگوں نے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف بنحاز سے نکاح والا افسانہ بس افسانہ ہی ہے۔ ورنہ یہ صورت احوال پیش نہ آتی۔ اور یہود کو معاذ اللہ عیسیٰ علیہ السلام پر ازراہ عداوت و تمسخر ناجائز اولاد کی بھتیجی کہنے کا موقع نہ ملتا۔ مریمؑ نے فرشتوں کی ہدایت کے مطابق بچے کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھ لو۔ پھر گواہی کے لئے بول پڑا جس میں اپنی عہدیت و نبوت اور صاحب کتاب ہونے کا ذکر تھا۔

عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی پر تاریخ کی کچھ پرے پڑے ہوئے ہیں۔ عیسائی لٹریچر میں ان کے مقام پرورش میں بھی کافی اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ حاکم وقت کے خوف سے یوسف بنحاز یہودی بچے کو لے کر مصر چلا گیا۔ جب شاہ ہیرودیس مر گیا تو واپس فلسطین لے آیا۔ پھر ایک دوسرے بادشاہ کے عہد میں اس خاندان کو گلیل کے علاقے میں ناصرو نامی قبضے میں پناہ دے کر رہنا پڑا۔ اور عیسیٰؑ کی پرورش زیادہ تر ناصرو میں ہوئی۔ اس تعلق کی بنا پر انہیں یسوع ناصری کہا گیا۔ ناصرو میں مریمؑ کی خالہ کا مکان بھی تھا جس میں اسے گھر جیسی سہولتیں میسر تھیں۔ کچھ لوگوں نے عیسیٰؑ کی پرورش کا مقام دمشق بتایا ہے۔ بعض نے رملہ اور بعض نے یروشلم بھی کہا ہے۔

بے باپ کی پیدائش عیسیٰؑ کی خدائی یا ابن اللہ کی دلیل نہیں بن سکتی ورنہ پھر آدمؑ کو عیسیٰؑ سے بڑا خدا یا معاذ اللہ خدا کا بڑا بیٹا یا بھائی ماننا لازم آئے گا۔ اس پر مزید گھٹکھوکھٹا کا مقام انشاء اللہ آگے آئے گا جہاں بتایا جائے گا کہ عیسیٰؑ کی پیدائش بھی مہجراۃ فلور پر ہوئی مگر کسی نے انہیں خدائی یا

نیکو کے مقام پر فائز نہیں کیا۔

انجیل کے بیان کے مطابق عیسیٰ ۳۳ برس کی عمر میں نبوت سے سرفراز ہوئے۔ انہوں نے سچی سے بیشک (عقل تو بہ) بھی لیا تھا۔ اور سچی کی فضیلت اور رفعت درجات کا اظہار کرتے رہے۔ انجیل کے مصنفوں نے اس مقام پر عجیب دیوالا کی قسم کی حکایات بیان کی ہیں جن کا ذکر ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ عیسیٰ کو دیگر انبیاء و رسل کی مانند عظیم معجزات دینے لگے مثلاً گھوڑے میں کلام کرنا، کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کا علم، موشی کی چڑیاں بنا کر حکم خداوندی سے بھڑک مار کر اڑا دینا، لاعلاج مریضوں کا علاج، بحکم الہی مردوں کو زندہ کرنا، جب یہود نے انہیں جادوگر کہہ کر مبتلائے اذیت کرنا چاہا تو ان سے صاف سچاے جانا۔ قرآن کے بیان کے مطابق عیسیٰ کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ میں دین موشی کی تجدید کرنے آیا ہوں۔ انہوں نے دیگر انبیاء کی مانند توحید الہی اور رسالت عیسوی کا پرچار کیا، بدعات کو رد کیا۔ اور شریعت موشی کی بعض شرکوں میں نرمی پیدا کی۔ انہوں نے یہودی علماء و مشائخ کی ظاہر پرستی، شکم پروری اور حُب دنیا پر شدید تنقید کی جسے وہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کر سکے اور ان کے درپے آزاد ہو گئے۔ حکومت وقت کے ساتھ سازش کر کے انہوں نے عیسیٰ کی گرفتاری اور ان کے خلاف عدالتی کارروائی کا پروانہ حاصل کر لیا۔ بارہ حواریوں میں سے ایک یہود اسکیرلوتی نے جاسوسی کی کہ عیسیٰ ظلمان مقام پر شاگردوں سمیت موجود ہیں۔ قرآن کے بیان کے مطابق وہ گرفتار کرنے آئے مگر عیسیٰ کو نہیں بلکہ ان کی ایک تشبیہ جو خود وہ جاسوس حواری تھا۔ کو پکڑ کر لے گئے۔ عیسیٰ کو خدا نے اٹھالیا اور یہود نے اس تشبیہ پر مقدم چلویا۔ اس کے دادیلا اور شور و غل کی پروانہ کی اور آخر کار موت کا حکم صادر کر کے اسے صلیب پر مار دیا۔ عیسائی لٹریچر کا بیان ہے کہ سولی چڑھنے والا اور مرنے والا تھا تو عیسیٰ ہی مگر موت نے تیسرے دن وہ قبر سے غائب پایا گیا۔ یہیں سے یہود نے عیسیٰ کے کذب پر اسدلال کیا کہ بائبل کے مطابق صلیب لغتی مرت ہے۔ جو کسی صادق القول اور راست باز کو نہیں دی جاسکتی تھی، لہذا عیسیٰ نبی وغیرہ کچھ نہیں بلکہ ایک ملعون مجرم تھا۔ معاذ اللہ منشاء عیسائیوں نے کہا کہ یہ لغتی موت مکرر عیسیٰ نے اپنے ماننے والوں کو گناہ کی آلائش سے صاف کر دیا تھا۔ بعد میں یہی کفارے کا عقیدہ عیسائیت کی بنیاد بنیٹ بنا دیا گیا۔ انجیلوں میں سے انجیل برنیاس کی تصریحات قرآن کے بیاہ کے مطابق ہیں۔ انجیل برنیاس چھپ چکی ہے اور بائسائی مل سکتی ہے۔

تعلیمات مسیح اس عنوان کے تحت ہیں جو کچھ لکھنا نظر ہے وہ موجودہ عیسائیت کی تعلیمات نہیں بلکہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح اور اصلی تعلیمات ہیں۔ ان

تعلیمات کے بیان کے لئے سب سے بڑا اور لائق اعتبار منبع خدا کا آخری غیر متبدل اور محفوظ کلام قرآن مجید ہے۔ انجیل میں بھی یہ تعلیمات موجود ہیں مگر مختلف اناجیل کے مصنفین نے ان تعلیمات کو اپنے متخاصم کی خاطر دھندلایا کچھ پیچیدہ کر ڈالا ہے۔ عیسائیت کی تعلیمات عیسیٰ کی تعلیمات سے بالکل مختلف ہیں۔ عیسیٰ نے کہیں اپنے آپ کو خدا نہیں کہا۔ وہ بار بار اپنے کو ابن آدم کہتے ہیں۔ سچائی کو اپنے سے افضل قرار دیتے ہیں۔ تثلیث فی التوحید یا توحید فی التثلیث کی طرف کہیں اشارہ بھی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس خدائے واحد کی توحید و عبادت کا اعلان کرتے ہیں۔ عیسیٰ کی مصلوحتیت کو بھی اناجیل میں متضاد طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اور

انجیل برنیاس نے تو اس سے انکار کر کے عیسائیت کا بھانڈا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کفارے کا عیسیٰ کے ہاں کوئی وجود نہیں۔ پر سب عقاید بعد کی پیداوار ہیں۔ جیسا کہ عنقریب انشاء اللہ اس موضوع پر بحث کی جائے گی۔ مازدوسے قرآن مسیح علیہ السلام کی دعوت پر مبنی کہ: **اَللّٰهُ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ** (مریم - ۳۶) ”بلاشبہ اللہ میرا اور تمہارا رب ہے سو اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔“ **وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيِّ مِنَ السُّورَةِ (آل عمران)** ”میں قرأت کی تصدیق کرتا ہوں جو مجھ سے پہلے نازل ہو چکی ہے۔“

وَمُبَشِّرًا بِرِسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِيْ (يُحْمَدُ اَحْمَدُ) (الصف) ”اور میں اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی خوش خبری دیتا ہوں جس کا نام احمد ہے۔“ **اَوْصِيْنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (مریم)** ”اور مجھے اللہ نے زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے۔“

تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اُسی کی عبادت کر (انجیل متی) اسے اسرائیل میں، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ (لوقا) اور ہمیشہ کی زندگی پر ہے کہ انسان تجھ خدائے واحد اور برحق کو جاننے اور مسیح کو برا بھیجا ہوا یقین کرے (یوحنا) انجیل پڑھنا کی اس آیت میں توحید الہی کے ساتھ عیسیٰ کی رسالت کا بھی اظہار ہے۔ یہاں خدائی عاقبت اور کفارہ وغیرہ کی طرف ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح اسی انجیل کے دوسرے مقام پر ہے: ”میں نے کہا تا کہ وہ ایمان لائیں کہ تو ہی نے مجھے بھیجا ہے (یوحنا باب ۸) جو

مجھ پر ایمان لاتا ہے وہ مجھ پر نہیں بلکہ میرے جھینجھنے والے پر ایمان لاتا ہے (یوحنا باب ۱)
 جب تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرتے تو کیوں مجھے خداؤں خداؤں کہتے ہو؟ (لوقا)
 بنیادی عقائد اور بعض اخلاقی احکام کے سوا عیسائی علیہ السلام نے کچھ نہیں فرمایا۔ بقول
 ایک عیسائی عالم جوڑکے: سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق حضرت عیسیٰ کی تعلیم
 افسوسناک حد تک مبہم ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عیسائی علماء سرسرایہ واری استبدادیت، غلامی،
 جنگ، قید و بند، دشمنوں کو زندہ جلانا اور تکالیف دینا، غرض جو چاہیں بلا دقت مسیح کی
 تعلیم ثابت کر سکتے ہیں (عیسائی عبادت کے اصول)

مسطر جوڑکے جو کچھ کہتا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ عیسائی دنیا شروع سے اب تک حضرت
 عیسیٰ کی تعلیم کو زندگی کے اخلاقی شعبے کے سوا ہر چیز سے خاموش تسلیم کرتی آئی ہے۔ بلکہ عیسائی علماء
 کو اس بات پر فخر و ناز بھی ہے کہ ایسی "بے ضرر" تعلیم کو تسلیم کر لیں جس میں کسی شخص یا قوم کو کیا عیب
 ہو سکتا ہے۔ جو اس کی سیاسی، معاشی، معاشرتی زندگی میں اسے بالکل آزاد چھوڑ دے موجود
 عیسائی مذہب بڑا نمکدار ہے۔ پھر پائل وغیرہ لوگوں نے اسے لونیائی وروسی مشرکوں کی خاطر قابل
 قبول بنانے کے لئے اور بھی بہت سی تبدیلیاں کر دی ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

اخلاقیات میں عیسائی کی تعلیم کچھ اس طرح کی ہے: شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو ترے داہنے
 گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر تاش کر کے تیرا گوشہ لینا
 چاہے تو کر لے تجھ بھی اسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھ کا ایک کوس بیگار میں لے جائے اس
 کے ساتھ دو کوس چلا جا (متی ۱۵)

اسی واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور
 نقيب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو (متی ۶)
 کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں
 کر سکتے۔ اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ تم کیا کھائیں گے اور کیا پیئیں گے، اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔
 ہمارے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بڑتے ہیں نہ کھاتے ہیں نہ کوٹھیلوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمہارا
 آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر
 کر کے اپنی عمر کو ایک گھڑی بھی بڑھاسکے؟ اور پوشاک کے لئے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوس کے
 درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کھاتے ہیں۔ پھر بھی میں تم
 سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی شان و شوکت کے ان میں سے کسی کی مانند پوشاک پہنے

ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل توڑ میں جھونکی جائے گی
ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اسے کم اعتقاد و اقم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ (مسی)،
مسیح علیہ السلام کی یہ تعلیم بالکل برحق تھی۔ انہوں نے مادہ پرستی اور شکم پروری کا تذکرہ
کر کے خلا پرستی کا تصور لوگوں کے ذہن و دماغ میں راسخ کرنے کی کوشش کی۔ اس مضمون کو فضیلت
اور مجاہدات کی زبان میں پیش کیا تاکہ دنیا پرستانہ ذہن کا رخ موڑا جاسکے۔ لیکن عجب اب پسند
اور غلو سے محبت کرنے والی ذہنیت نے اس کا اور ہی مطلب لیا اور وہ بہائیت کو ہی دین بنا
ڈالا۔ ترک دنیا اور زہد و قناعت میں مبالغہ کرنے کو رضائے خداوندی سمجھا گیا اور سادہ و سادہ
عربانی، اپنے آپ کو اوزیت دینا، شادی نہ کرنا اور نفس کشی کے عجیب و غریب طریقے باقاعدہ
قواعد و ضوابط کے ساتھ اختیار کے جانے لگے۔ یہ غیر فطری عمل تھا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور
اُس کے سچے پیغمبروں کی تعلیم غیر فطری نہیں ہو سکتی۔

اُس دور کے مقدس لوگوں، مذہبی اجارہ داروں، علماء اور مشائخ نے ریا کاری اور
مناقت کا جو ڈھونگ رچا رکھا تھا اس پر علیہ السلام نے یوں چوٹ لگائی: ”فقید اور قریبی
موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں، پس وہ جو کچھ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ
کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھنا مشکل ہے باندھ کر
لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں۔ مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے ہلانا بھی نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب
کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے
چوڑے رکھتے اور دنیا فتوں میں صد نشینی اور عبادت خالوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور
بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے رتی کہلانا پسند کرتے ہیں؟“

”اے ریا کار فقیہو اور قریبیو! تم پرافسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند
کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔ اے ریا کار
فقیہو اور قریبیو! تم پرافسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو
اور جب وہ مرید ہو چکا ہے تو اسے اپنے سے ڈگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔ اے اندھے
راہ بتانے والو! تم مجھ کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو لنگل جاتے ہو۔ اے ریا کار فقیہو اور قریبیو!
تم پرافسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں
مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو
لوگوں کو راستباز باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریا کاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے“

ہو، (متی ۲۳)

عیسٰی مسیح کے اس وعظ سے یہودیوں کے دینی پیشواؤں کے اخلاقی و عادات اور اعمال کو رد و بار پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وعظ میں معافی کا سمندر پہنچا ہے۔ اس سے ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ قرآن مجید نے بگڑی ہوئی قوم یہود و نصاریٰ کے اچھوت و دھبہ بان کی "خداوندی" اور دینی مناصب کی گہری نشینی کے جو پوست کندہ احوال مدنی سعادتوں میں — بالخصوص البقرا، آل عمران النساء، التوبہ میں — بیان فرمائے ہیں ان کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ہر زمانے کے خود غرض ختم پرست دینی پیشواؤں کا یہی کردار رہا ہے کہ وہ دین حق کی راہ میں پتھر بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نہ خود وہ راستہ اختیار کرتے ہیں نہ کسی اور کو کہہ سکتے ہیں: **وَالَّذِينَ آمَنُوا أَقْبِلُوا** **وَالَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ أَعْرَضُوا عَنْكَ أَمْ لَمْ يَعْرِضُوا عَنْكَ إِنَّكَ تَرَاهُمْ يَرْجُفُونَ** **فِي كُلِّ مَسْجِدٍ وَفِي كُلِّ مَسْجِدٍ يَخْرُجُونَ** **وَالَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ أَعْرَضُوا عَنْكَ أَمْ لَمْ يَعْرِضُوا عَنْكَ إِنَّكَ تَرَاهُمْ يَرْجُفُونَ** **فِي كُلِّ مَسْجِدٍ وَفِي كُلِّ مَسْجِدٍ يَخْرُجُونَ** بلاشبہ بہت سے عالم اور درویش لوگوں کے مالوں کو ناجائز طور پر ہٹ کر لے گئے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ آیت کے اگلے حصے میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں انہیں خرچ نہیں کرتے، ایسے لوگوں کو دردناک سزا کی توقع ہے۔ (التوبہ)

نہ صرف قرآن و حدیث کے مغفوت دینی ذخائر کی روشنی میں بلکہ اناجیل کے ذریعے سے بھی عیسٰی علیہ السلام کی جو تعلیم ہم تک پہنچی ہے اس کی روش سے ہم یقینی طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ۱۔ مسیح علیہ السلام نے یہود کی ظاہر پرستی کا رد کیا اور دین کا اصل مغز اور جوہر پیش کیا مگر بعد میں مسیحیت مخرج و قانون سے گھر خلاصی کرنا بیٹھی اور تورات کی شریعت جس پر عمل کرنے کی جناب مسیح نے تاکید کی تھی۔ (متی ۵۔ لوقا ۱۶۔ یوحنا ۱۰) اس نے عہد جدید کی کتاب نامہ گلیتوں ۳۔ کے مطابق شریعت کو لعنت مٹھایا اور سموات کا انحصار صرف مسیح پر ایمان قرار دیا۔ ج۔ عیسٰی نے کوئی نیا دین یا نئی شریعت پیش نہیں کی تھی۔ ان کا پیغام موسیٰ کے دین کا تکملہ و ترمیم تھا (متی ۵۔ لوقا ۱۶۔ یوحنا ۱۶) مگر ان کے بعد اسے ایک مستقل دین و مذہب بنا دیا گیا جس کی تعلیمات پورن زندگی پر حاوی نہیں، محض چند عقائد اور کچھ اخلاقیات کا نام "مسیحیت" رکھ دیا گیا۔

ج۔ مسیح کی تعلیم میں دھبا نہ تھی بلکہ دنیا پرستی سے نفرت کا سبق تھا۔ ان کے بعد ایک غیر فطری دھبا نہ تھی کہ مسیحیت کا طرہ امتیاز قرار دے دیا گیا اور اس کے لئے باقاعدہ ادارے

کھول دیئے گئے۔

(۱) موجودہ مسیحیت نے دین و دنیا کی تفویق کا نظریہ نشہ و مدہ سے پیش کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں اسلام پر گندگی بھی اُچھالی ہے۔ مسیح کی تعلیم سے یہ غرض ہرگز نہ تھی کہ دین کو عبادت کا گہرل میں بند کر دو اور زندگی کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی میدانوں میں خوب اُدھم مچاؤ۔ مگر عیسائی علماء کو اس پر اصرار ہے کہ خالص دنیوی معاملات میں دین کی ہدایات کی کوئی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے عیسائی کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر اور اس کا غلط مطلب بیان کر کے پیش کیا ہے۔

۷۔ عیسائی صرف نبی اسرائیل کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ قرآن نے کہا ہے کہ مسیحؑ نے فرمایا اے نبی اسرائیل رَاقِی تَسْئُولِ اللّٰهِ اَلَيْسَ كُودُ (الصف) ”میں صرف تمہاری طرف اللہ کا فرستادہ ہوں؟ انجیل کہتی ہے کہ مسیحؑ نے اپنے متلوں کو حکم دیا: غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور ساموئیل کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کی بھٹکی ہوئی بھیڑوں ہی کے پاس جانا (متی۔ ۱۰)۔ عیسائی نے کبھی یہودیوں کے سوا کسی قوم کو خطاب نہیں کیا۔ ایک مدت تک اولین عیسائیوں کا یہی عقیدہ رہا۔ پرتوئس نے پہلی بار عیسائیت کو ایک عالمگیر دعوت کے طور پر پیش کیا۔ پھر یونانی اور رومی مشرکوں کے عقائد و اعمال اور رسوم و عبادات کو اس میں داخل کر کے اصلی مسیحی بنیاد کا حلیہ بگاڑ دیا گیا۔ اپنے گھر کی اس چوری کو چھپانے کے لئے اسلام جیسے عالمگیر دین پر حملہ دہونے اور صرف عربوں کی خاطر ہونے کا شدید پوچھ گچھا کیا گیا جواب تک جاری ہے۔

(۲) عیسائیت کی پر شکوہ عمارت کی بنیاد تثلیث، مسیح کی مصلوبیت اور کفارے جیسے خلاف فطرت و عقل جعلی مسائل پر استوار ہوئی ہے۔ مسیح کی تعلیم میں ان نام نہاد بنیادی عقاید کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ نہ اس میں انبیت مسیح جیسے ناقابل فہم مسئلے کا کوئی ذکر ہے۔ جن الفاظ کی رو سے مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا گیا ہے۔ اسی قسم کے الفاظ دوسرے نبیوں، حواریوں بلکہ تمام انسانوں کے لئے بائبل کے قدیم و جدید عہد نامے میں موجود ہیں۔

(۳) ایک طرف انبیت مسیح کا چکر چلایا گیا تو دوسری طرف الوحیت مسیحؑ کا ڈھونڈ بھی رچایا گیا۔ اب ایک ہی شخص بیک وقت انسان بھی تھا، خدا بھی تھا، خدا کا بیٹا بھی تھا اور کان و اشخاص اللہ میں سے تیسرا رکن بھی تھا۔ یہ منہمک اور گورکھ دھند کسی اور کی سمجھ میں کیا آتا، خود عیسائی علماء و فضلا کی عقل و فہم سے بھی بالاتر ہے اور اس کا اُنہیں کھلا اعتراف بھی ہے۔

مفصل بحث انشاء اللہ آگے آئے گی۔

عیسائیت کی تعلیمات | جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، مسیح کی تعلیمات اور عیسائیت کی تعلیمات دو بالکل جدا گانہ چیزیں ہیں۔ اوپر کے عنوان کے ماتحت ہم نے مسیح کی تعلیمات پر مختصر کلام کیا ہے۔ اس عنوان کے ضمن میں ہمیں موجودہ عیسائیت کی تعلیمات پر کچھ گفتگو کرنا مد نظر ہے۔

موجودہ عیسائیت کا بانی پولوس (سینٹ پال) تھا جو مسیح کا حواری نہیں بلکہ شدید دشمن یہودی تھا۔ اس کے ایک ذہین اور "قد آور" شخصیت ہونے میں شبہ نہیں۔ طویل سوچ بچار کے بعد وہ یکایک نمودار ہو کر کشف الہام اور مسیح کی ملاقات کا مدعی بن بیٹھا اور عیسائی کے پیغام کو یونانیوں، رومیوں اور غیر اسرائیلی عوام میں مقبول بنانے کی خاطر اس کا عملیہ لگاؤ کر رکھ دیا۔ اس نے شریعت کو لعنت مقرر کر عیسائیوں کے لئے موسوی قانون کی تمام پابندیاں اٹھا دیں۔ لکھنے پینے اور ذبح میں حلال و حرام کا فرق مٹا دیا، غنّے کے حکم کو منسوخ کر دیا کیونکہ یہ حکم غیر یہودی عوام کو سخت ناپسند تھا۔ مسیح کی الوہیت، ان کا خدا کا بیٹا ہونا، مسئلہ ہو کر آدم کے موروثی گناہ کا کفارہ بننے کا عقیدہ، یہ سب چیزیں پولوس کی اختراع تھیں۔ مسیح کے حواریوں کی ناپسندیدگی بلکہ مزاحمت کے باوجود یہ عقاید پھیلنے لگے اور عیسیت یونانی حدود و سرحدوں کا مذہب بنی چلی گئی کیونکہ یہ خیالات ان کے شرک کے عقاید سے بہت حد تک مناسبت رکھتے تھے۔ پھر رومی اور یونانی تہواروں اور مشرکانہ رسوم عبادت کو بھی اپنا لیا گیا۔ چالاکی یہ کی گئی کہ اب ان کے نام بدل کر مسیحی رکھ دیئے گئے۔ اس ساری جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصل مسیحی تعلیم بالکل پس پردہ چلی گئی۔ اور ان کے نام پر ایک مشرکانہ مذہب بن کر تیار ہو گیا۔ اس نئے مذہب کی بنیاد جن عقاید پر رکھی گئی ہے، ان پر مختصر گفتگو ذیل میں کی جاتی ہے:

عقیدہ تثلیث | انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں: "تثلیث کے عیسائی نظریے کو ان الفاظ میں اچھی طرح تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ باپ خدا ہے بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے۔ لیکن یہ لکرتین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی خدا ہیں۔ اس لئے کہ عیسائی نظریے کے مطابق ہم جس طرح ان تینوں میں سے ہر ایک اقنوم (Person) کو خدا اور آقا سمجھنے پر مجبور ہیں، اسی طرح ہمیں کیتھولک مذہب نے اس بات کی بھی ممانعت کر دی ہے کہ ہم ان کو تین خدا یا عین آقا سمجھنے لگیں۔"

مطلب یہ ہوا کہ اس عقیدے کی رُو سے بننے تو زمین خدا ہی ہیں مگر عیسائی لوگ مذہبی ممانعت کے باعث انہیں ایک ہی ماننے پر مجبور ہیں۔ مشہور عیسائی عالم اور فلسفی سینٹ آگسٹائن اس عقیدے کی وضاحت میں اپنی کتاب تثلیث میں لکھتا ہے کہ، ”باپ بیٹا اور روح القدس مل کر ایک خدائی وحدت تیار کرتے ہیں جو اپنی ماہیت اور حقیقت کے اعتبار سے ایک اور ناقابل تقسیم ہے، اسی وجہ سے وہ تین خدا نہیں ہیں۔ بلکہ ایک خدا ہے۔ اگرچہ باپ نے بیٹے کو پیدا کیا لہذا جو باپ ہے وہ بیٹا نہیں ہے۔ اسی طرح بیٹا باپ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے جو بیٹا ہے وہ باپ نہیں ہے اور روح القدس بھی نہ باپ ہے نہ بیٹا، بلکہ باپ اور بیٹے کی رُو سے ہے جو دونوں کے ساتھ مساوی اور تثلیثی وحدت میں ان کی حقہ واسطہ ہے اس وضاحت کی رُو سے بھی تثلیث کے تینوں اتقدم تین ہیں، الگ الگ ہیں۔ باپ خالق ہے بیٹا مخلوق ہے اور روح ان دونوں کے علاوہ تیسری چیز ہے، لیکن وہ اندلی یہ ہے کہ اس کے باوجود دینہ زوری کے ساتھ ان میں کو ایک کہا جا رہا ہے۔ اس کے بعد آگسٹائن نے لکھا ہے کہ مریم کے بیٹے سے پیدا ہونے والا اور بھانسی پا کر دفن ہونے والا صرف بیٹا تھا نہ کہ یہ تثلیثی وحدت جو اد پر بیان ہوئی۔ پھر یسوع پر جب بیٹھی سے بیٹہ لینے کے بعد کبوتر کی شکل میں روح اُتری تو وہ تثلیثی وحدت نہیں بلکہ صرف روح تھی۔ اور جب وہ پہاڑ پر بکھڑا تھا اور اسے آواز آئی تھی کہ تو میرا پیارا بیٹا ہے، تو یہ آواز صرف باپ کی تھی نہ کہ تثلیثی وحدت کی۔ آگسٹائن کے قول کے مطابق باپ اپنا کام الگ کرتا ہے بیٹا الگ اور روح الگ، مگر وہ بھر بھی ایک ہیں۔ اس کی وجہ آگسٹائن نے آخر میں بھی ہے کہ، ”یہی میرا عقیدہ ہے۔ کیونکہ یہ کیتھولک عقیدہ ہے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین کاتین ہونا اس کے دل میں بھی رہ رہ کر کھٹکتا ہے مگر وہ کیا کرے کہ وہ کیتھولک مذہب کا پیرو ہے اور اندھا دھند اس ناقابل فہم غیر عقلی عقیدے کو ماننا ہے۔ پھر یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ آگسٹائن اس عقیدے کے سلسلے میں کیتھولک مذہب کا حوالہ دیتا ہے، جناب مسیح کا یا ان کے حواریوں میں سے کسی کا یا کسی مقدس کتاب اور صحیفہ کا حوالہ نہیں دیتا۔ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ من گھڑت اور بعد کی ایجاد ہے، مسیح کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

اس عقیدے میں جو باپ بیٹا اور روح القدس کے الفاظ بولے جاتے ہیں، ان میں سے باپ سے مراد خدا کی ذات ہے۔ بیٹے سے مراد خدا کی صفت کلام ہے جو یسوع مسیح کے انسانی جسم میں حلول کر گئی تھی۔ اور وہ خدا کا بیٹا کہلاتا ہے۔ روح القدس سے مراد باپ اور بیٹے

کی صفت حیات اور صفت محبت ہے۔ یعنی اس صفت کے ذریعے سے خدا کی ذات (باپ) اپنی صفت کلام (بیٹا) سے محبت کرتی ہے۔ صفت کلام کا ایک الگ جوہری وجود ہے اور صفت محبت کا بھی ایک مستقل جوہری وجود ہے۔ یہ تینوں عمل کر خدا بنتا ہے۔ باپ بھی انہی وادہی، بیٹا بھی انہی وادہی اور روح القدس بھی انہی وادہی ہے مگر یہ تین ہوتے ہوئے بھی میں نہیں بلکہ ایک ہیں۔ مگر ایک ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ میں نہیں، بلکہ یہ میں بھی ہیں۔

اس ناقابل فہم گورکھ دھند سے نے کئی منطقی و فلسفی سوال پیدا کئے جن کے جواب کے لئے عیسائیوں میں شدید فرقہ بازی ہوئی اور ان کے حصیے کے لئے کوششیں منعقد ہوتی رہیں جن کا ذکر انشاء اللہ فرقوں کے بیان میں آئے گا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ ”یسوع مسیح“ میں چارلس ایڈورس سکاٹ نے لکھا ہے کہ: ”پہلی تینوں انجیلوں — متی، مرقس، لوقا — میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جاسکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔“ یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا، انجیل کی متعدد جہاتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ”مجھے آج اور کل اور برسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو“ (لوقا) اور اکثر اپنا ذکر ابن آدم کے نام سے کرتا ہے۔ یسوع کہیں اپنے آپ کو ”ابن اللہ“ نہیں کہتا۔“

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ مسیحیت میں جانج وکیم ناکس عقیدہ تثلیث کے متعلق لکھا ہے کہ: ”عقیدہ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لئے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے جس میں مذہبی خیالات تو بائبل کے ہیں۔ اور وہ ڈھلے ہوئے ہیں ایک اجنبی فلسفے کی صورت میں۔ باپ بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی فرائض کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔۔۔۔ پس اس عقیدے کا مواد یہودی ہے اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال متضاد مذہبی، بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا۔“

ادھر کے اقتباس میں عقیدہ تثلیث کی بنیاد یونانی فکر کو قرار دیا گیا ہے۔ تاریخ، مذاہب پر گہری نظر ڈالنے والے جانتے ہیں کہ دنیا کی اکثر مشرک قوموں میں تثلیث کا عقیدہ کسی نہ کسی رنگ میں ضرور کارفرما رہا ہے۔ قدیم مصریوں میں اس کے ارکان یہ ہوتے تھے۔

عیسٰی علیہ السلام کے متعلق عیسائی عقیدہ | جس طرح خدا کے متعلق عیسائی عقیدہ

ب۔ مسیح کی مصلوبیت

ج : مسیح کی حیاتِ ثانیہ

و: کفارے کا عقیدہ

بات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک ان چاروں اجزاء پر گفتگو نہ کی جائے۔ سہم ترتیب وار ان پر افتقار کے ساتھ کلام کرتے ہیں،

۱۔ حلول اور تجسم کا عقیدہ | حلول کا لفظی معنی گھس جانا ہے۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خدائی صفات کو ترک

کئے بغیر انسان کے وجود میں ظاہر ہو گیا۔ اور مجسمہ کا لفظی معنی ہے جسم یا اختیار کرنا یعنی خدا کی صفت کلام (بالفاظ دیگر بیجا) مجسم ہو کر عیسائی کے روپ میں آ گیا۔ بالکل اسی قسم کا تفصیل سپندوؤں میں بھی ہے کہ وہ رام چندر، کرشن جی اور پھر بعد میں مہاتما بدھ کو بھی خدا کا اوتار مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں وشنو دیوتا ان تینوں کی صورت میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا رہا۔ روپ تو رام، کرشن اور بدھ کا تھا مگر دراصل ان کے اندر وشنو یا مہنگان تھا جو ان کے رنگ ویسے میں جاری و ساری تھا۔

یوحنا کی انجیل کی ابتدائی آیات میں کلام کا ازلی وابدی ہونا، خدا کے ساتھ ہونا، خود خدا ہونا، پھر کلام کا مجسم ہونا اور خدا کے اکلوتے بیٹے کا جلال بن کر انسانوں میں رہنا مذکور ہے۔ مارکس ایلمن نے اس عقیدے کی شرح میں لکھا ہے کہ: ”دیکھتو ایک عقیدے کا کہنا یہ ہے کہ وہ ذات جو خدا حقیقی، خدا کی صفات کو چھوڑے بغیر انسان بن گئی۔“

یعنی اُس نے ہمارے جیسے وجود کی کیفیات اختیار کر لیں جو زمان و مکان کی قیود میں مقید ہے اور ایک عرصے تک ہمارے درمیان مقیم رہی، (مطالعہ عقائد عیسائیت) انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھنکس کے مقالہ عیسائیت میں مسٹر الفریڈ ای گارو اس عقیدے کی مزید شرح یوں کرتے ہیں کہ: ”حضرت مسیح حقیقتہً خدا بھی تھے اور انسان بھی، اُن کی ان دونوں حیثیتوں میں سے کسی ایک کے انکار یا ان کے وجود میں دونوں کے متحد ہونے کے انکار سے ہی مختلف بدعتی نظریات پیدا ہوئے۔۔۔۔۔ لہذا پہلی مسیحی کونسل کے منظور شدہ فارمولے کی رُوسے مسیح کی ایک شخصیت میں دو ماہیتیں (خدا کی اور انسانیت) جمع ہو گئی تھیں“

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ تاریخ کلیسا میں ہے کہ: ”تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر کلام کا جسد ہی ظہور تو مان لیا گیا تھا مگر بائبلت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ ۳۲۵ء میں اس مسئلہ پر شدید بحث و مناظرہ برپا تھا جس سے کلیسا کی بنیاد ہل گئی۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیہ کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ مگر اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا مگر آخری فتح نیقیہ کے فیصلے کو ہوئی جسے مشرق و مغرب میں اس حیثیت سے مان لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اُسے پتھر کے الفاظ میں اور دوسرے رائج الوقت رسوم میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیہ میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدہ تثلیث اصل مذہب مسیحی کا ایک لازمی اور ضروری حصہ قرار پا گیا۔“

اس اعتبار سے واضح ہے کہ تثلیث و تجسم اور الوہیت مسیح کا عقیدہ جناب مسیح یا ان کے حواریوں کا نہیں تھا بلکہ ان کے سینکڑوں برس بعد ایجاد ہوا تھا۔ عیسائیوں میں پھر بھی اختلاف باقی رہا اور کئی نئے نئے مسائل اس جدید اختراع سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب بڑا سوال یہ سامنے آیا کہ مسیح کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ آخر اس بار میں کالیدن کونسل نے اس کا فیصلہ یہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبعیتیں جمع تھیں، ایک الہی طبعیت اور دوسری انسانی طبعیت، اور یہ دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جدا گانہ خصوصیتیں قائم رکھتی تھیں ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا۔ پھر

ایک اور الجھن اچڑی کہ یہ دونوں طبیعتیں جو مسیح کی ذات میں جمع تھیں آیا ان کی مشیت واردہ ایک تھا یا الگ الگ؟ ۵۵۵ء میں قسطنطنیہ کے مقام پر تیسری کونسل قائم ہوئی جس نے پہلے طے شدہ فیصلے پر اتنا اضافہ کر دیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیتیں رکھتی ہیں، یعنی مسیح بیک وقت دو مختلف مشیتوں کا مجموعہ ہے۔

حلول و تجسم، الوحییت مسیح اور مسیح کی شخصیت میں بیک وقت دو جداگانہ مشیتوں کا پایا جانا، یہ سب فلسفیانہ خیالات تھے جو لوانی فلسفے سے لئے گئے تھے۔ ان مسائل کی تفصیلات بڑی دلچسپ اور مضحکہ خیز ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مسیح خدا سے کم تر تھے اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ ”باپ مجھ سے بڑا ہے“ (انجیل یوحنا ۱۴) اور اسی حیثیت سے ان میں تمام انسانی عوارض و کیفیات پائی جاتی تھیں، لیکن خدائی حیثیت سے وہ باپ (خدا) کے ہم کر تھے جیسا کہ انجیل یوحنا میں یہ بھی لکھا ہے کہ ”میں اور باپ ایک ہیں“ (یوحنا ۱۱) آگسٹائن نے حسب عادت اس کی فلسفیانہ تشریح یوں کی کہ: ”خدائی حیثیت سے مسیح نے انسان کو پیدا کیا اور انسانی حیثیت سے وہ خود پیدا کیا گیا“ (آگسٹائن اصطلاحات)۔ یسوع مسیح اپنی خدائی شکل میں خود اپنے آپ سے افضل ہے اور انسانی حیثیت میں خود اپنے آپ سے کم تر بھی، (آگسٹائن حوالہ سابقہ)

یہ مسئلہ بڑا نازک اور لایعلاج قسم کا تھا کہ مسیح خدا بھی ہے اور انسان بھی، خالق بھی ہے اور مخلوق بھی، اپنی ایک حیثیت میں اپنے آپ سے بڑھیا ہے اور دوسری حیثیت میں گھٹیا، عیسائیوں میں صدیوں اختلاف و شقاق اور فرقہ بازی کا باعث بنا رہا۔ اس الجھنی کو سلجھانے کے لئے کئی کونسلیں برپا ہوئیں مگر ہر کونسل کا نتیجہ مزید اختلاف کی شکل میں نکلا۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب الاحزاب ۱: ”اجواب الھیج لمن یدل دین المسیح میں اس مسئلے پر شافی بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”مسیح کی طبیعت کے باب میں عیسائیوں کا کلام پراگندہ، مختلف اور متناقض ہے۔ اس بارے میں ان کا کوئی متفق علیہ قول نہیں، نہ کوئی معقول قول ہے اور نہ ایسا قول جس پر کوئی کتاب دلالت کرتی ہو۔ اس باب میں ان کے کئی فرقے اور گروہ ہیں جو سب ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں جیسے یحویہ، ملکانیر اور نشورہ۔ ان لوگوں کے اقوال اس مسئلے میں پراگندہ ہیں اور ان میں شدید اختلاف ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ دس عیسائی کسی مسئلے کے فیصلے کے لئے جمع ہوئی تو ان میں گیارہ فرقے بن جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ غیثت و اتحاد کا عقیدہ جو ان کی امانت — کیتھولک، عیسائیوں کا

تشکیث پر متفقہ فارمولا — میں پایا جاتا ہے وہ نبیوں کی طرف منسوب کتابوں میں یا مسیح اور ان کے حواریوں کے کلام میں یا دوسرے انبیاء کے کلام میں بالکل موجود نہیں۔ ان کی کتابوں میں کچھ انتشار اور الفاظ میں اور کچھ حکم ان کے معانی کو سمجھنے میں ان کا اختلاف ہے۔ پھر جو لوگ اس طے شدہ عقیدے کے قائل ہوئے — جیسا کہ جمہور عیسائیوں کا دعویٰ ہے — وہ بھی اس کی تفسیر میں اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے اس عقیدے میں بھی تناقض پایا جاتا ہے جس کا تصور کسی صحیح طریقہ پر ممکن ہی نہیں، (الجباب الصبح ص ۳۳)

ب۔ مسیح کے مسولی پر مرنے کا عقیدہ | اس عقیدے کے بیان سے قبل اس بات پر نیاز اس حواری کی انجیل میں بھی مسیح کی مصلویت کا واضح رد موجود ہے۔ قرآن نے یہ کہہ کر کہ

وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ
 کا بیان کر دیا ہے، کہ یہود نے نہ تو عیسیٰ کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ اُن کے لئے ایک تشبیہ بنا دی گئی۔ یہ تشبیہ کیا تھی؟ اس راز سے پردہ ہر نیاز اس حواری نے اٹھایا کہ اگر خدائے کر ان کی خاطر جاسوسی کرنے والا حواری یہود اور اس کے گروہ کی شکل و صورت میں تبدیل ہو گیا۔ عیسیٰ تو اٹھائے گئے مگر یہودیوں نے اس تشبیہ کو عیسیٰ سمجھ کر سولی پر لٹکا دیا اور بزرگمرد خوش خوش ہو گئے کہ چھپنے کا ایک کذاب کو (معاذ اللہ منہ) لختی موت مار کر اس کی اصل حقیقت ظاہر کر دی ہے۔ عیسائیوں نے عیسیٰ کی مصلویت کو تسلیم کر لیا مگر اسے آدم کے موروثی گناہ کا کفارہ سمجھا کر ابن اللہ کی عظیم قربانی قرار دیا اور اسی پر اپنے جدید مذہب کی بنیاد رکھ دی۔ عیسائی عقیدے کے مطابق یہ مسولی اس اقنوم ابن کو نہیں دی گئی جو ان کے نزدیک خدا ہے بلکہ اس اقنوم ابن کے انسانی منظر عیسیٰ کو دی گئی جو انسانی حیثیت میں خدا نہیں تھا بلکہ مخلوق تھا۔ اس عقیدے میں وہی فلسفیانہ تناقض و تضاد موجود ہے جو عقیدہ تشکیث کی جان ہے۔ چوتھی صدی عیسوی کے ابتدائی دوسرے عشرے میں شاہ روم قسطنطین کے کسی دہم یا خراب کی بناء پر اور اس کی والدہ، سینٹ ہیلینا کے کہیں سے ایک صلیب دستیاب ہو جانے کی بناء پر آئندہ کے لئے صلیب کو عیسائیت کا شعار قرار دے دیا گیا اور صلیب کو اس بناء پر مقدس سمجھا لیا گیا کہ اس پر مر کر آئندہ نے سب اولاد آدم کے موروثی گناہ کی سزا سے بچا لیا ہے اور ابن اللہ کی موت ہمارا کفارہ ہو گئی ہے۔

ج۔ مسیح کی دوسری زندگی کا عقیدہ

عیسائیوں کے عقیدے میں مسیح کو صلیب پر مار کر دفن کر دیا گیا تھا مگر تیسرے

دن وہ دوبارہ جی اٹھے اور حواریوں سے کچھ باتیں کر کے آسمان پر چلے گئے تھے۔ اس سلسلے میں ہماری گواہی فقط یہ ہے کہ جب عیسیٰ کو سوئی دی ہی نہیں گئی تو یہ سارا افسانہ بے بنیاد ہے۔ یہود اسکو یوقی کی لاش کو یوسف نامی ایک شخص نے غائب کر دیا تھا۔ انجیل کے بیان کے مطابق یہی وہ شخص تھا جس نے حکومت کی اجازت سے عیسیٰ (در اصل یہودا) کے گفن دفن کا انتظام کیا تھا۔ عیسائیوں کی چار معتبر انجیلوں کے ساتھ اگر برنیاس حواری کی انجیل کا بھی یہ مقام غور سے پڑھا جائے تو اصل بات کا سمجھ لینا مشکل نہیں رہتا۔ موجودہ عیسائیت کی عمارت اسی عقیدہ کفارہ پر استوار ہے۔ پولوس نے یہی پروپیگنڈا کر کے شریعت پر عمل کرنے والے کو نفی قرار دیا تھا اور عیسائی دنیا کے لئے اباحت کا دروازہ چوٹ کھول دیا تھا۔ کفارے کا عقیدہ عقل و فکر، عدل و انصاف اور رحمت و مغفرت کے خدائی اصول کے قطعی خلاف ہے۔ اس سے بے راہ رومی اور لاندہ بیبیت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ عیسائی دنیا نے اپنی تاریخ میں جس قدر مظالم کئے ہیں، کمزوروں اور ناتواانوں کو جس طرح ستایا ہے، اختلاف رائے کی بنیاد پر مخالفین سے جو ظالمانہ سلوک کئے ہیں، صلیبی جنگوں میں اہل اسلام کے خلاف جن وحشت بربریت کا مظاہرہ کیا ہے، دنیا بھر کو اپنی استعمار کا نشانہ بنانے کی خاطر جتنے کھیل کھیلے ہیں وہ تاریخ کے ناقابل تردید حقائق ہیں۔ ان کی تہذیب کا فی حد تک یہ کفارے کا عقیدہ بھی کارفرما رہا ہے۔

د۔ کفارے کا عقیدہ

یہ عقیدہ موجودہ عیسائی مذہب کی جان ہے۔ مسیح کے بارے میں

نہید ہیں۔ اس عقیدے کی تشریح انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ”عقیدہ کفارہ“ کے مضمون میں یوں آئی ہے: ”عیسائی علم عقاید میں کفارہ سے مراد یسوع مسیح کی وہ قربانی ہے جس کے ذریعہ سے ایک گناہگار انسان ایک نیک خدا کی رحمت کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس عقیدے کی پشت پر دو مفروضے کارفرما ہیں۔ ایک تو یہ کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے انسان خدا کی رحمت سے دور ہو گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ خدا کی صفت کلام (بٹیا) اس لئے انسانی جسم میں آئی تھی کہ وہ انسان کو دوبارہ خدا کی رحمت سے قریب کر دے“ اس مقالے کے کاتب نے جن دو مفروضوں پر اس عقیدہ کفارہ کی بنیاد رکھی ہے وہ دونوں سرے سے غلط اور ناپسندیدہ ہیں۔ اولیٰ تو آدم سے

کوئی گناہ سہرزد نہیں ہوا۔ گناہ نام ہے احکام شرع کی خلاف ورزی کا، آدمؑ اس وقت دنیا میں نہیں بلکہ عالم بالا میں تھے جہاں شریعت کا کوئی سوال نہ تھا۔ دوسرے اس نعرش کی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی تھی اور معافی مل بھی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ رحمن و رحیم ہے۔ یہ تصور ہی غلط ہے کہ معافی دینے کے بعد بھی اس نے اس ”گناہ“ کو باقی رکھا، نہ صرف یہ بلکہ آدمؑ کی نسل میں بلا و جبر و بلا قصور منتقل کر دیا۔ آدمؑ کے قصور میں اس کی اولاد کیسے ملوث ہو گئی؟ اگر خدا نے ایسا کیا تو وہ معاذ اللہ بڑا بے انصاف ہے۔ پھر ”کرے کوئی اور بھرسے کوئی“ کے مصداق یہ ایک دوسری عظیم بے انصافی ہوئی کہ اس نے آدمؑ اور اس کی نسل کے گناہ میں مرदा اپنے اکلوتے کو دیا! لغو ذالک من ذالک۔

پھر یہ ردولوں مقروضے محض ”مفروضے“ ہی ہیں جن کی کوئی جڑ بنیاد نہیں اور عقاید کو مفروضوں کی ریتی زبیں پر استوار نہیں کیا جاسکتا۔ عیسائی دنیا کی یہ ایک فلسفیانہ قسم کی دھاندلی ہے کہ محض مفروضوں کو عقاید بنالیا گیا ہے۔ کفارہ و دراصل پر لوس کے پیچیدہ یہودی ذہن کی پیداوار ہے۔ اسے عقیدہ بنا کر اس نے مسیح علیہ السلام کے سارے کام پر پانی پھیر دیا ہے۔ اس عقیدے کی رو سے نہ صرف بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء و رسل گناہ گار مٹھڑے گئے ہیں بلکہ شریعت اتارنے، گناہیں نازل کرنے اور رسولوں کو ہادی بنا کر بھیجنے کا سلسلہ بھی فضول قرار پاتا ہے جب عیسوی مسیح کی کمصورتی تک کوئی انسان بھی پاک صاف اور بے گناہ نہ رہا تو رسالت و نبوت کا یہ سارا سلسلہ ہی معاذ اللہ فضول اور بے مقصد مٹھا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ قائم کر کے محض ایک ڈرامہ کیا تھا؟ اس بے بنیاد عقیدے کی رُو سے انسان پیدا نشی گز گار ہے۔ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والا ہر بچہ گناہ گار ہے۔ کیا یہی وہ خدا کا انصاف اور رحمت ہے جس کا نام لے کر یہ عقیدہ منوانے کی کوشش کی جاتی ہے؟ عیسائیت انسانی فطرت سے بالواس ہے۔ وہ خواہ عزا و بلا سبب ہر انسان کو گناہ گار قرار دے کر انسانیت کی توہین کا ارتکاب کر لی ہے۔ ایک عیسائی فاضل جان کالوٹن سے انسانیت کے خلاف فتویٰ سنئے: ”در حقیقت ہم نے آدمؑ سے صرف سزا و داشت میں نہیں پائی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم میں گناہ کا ایک وہائی مرض جاگزیں ہے جو آدمؑ سے ہم کو لگا ہے اور اس گناہ کی وجہ سے ہم لوہے انصاف کے ساتھ سزا کے مستحق ہیں۔ اسی طرح شیر خوار بچے بھی اپنی ماں کے پیٹ سے سزا کا استحقاق لے کر آتے ہیں اور یہ سزا خود ان کے نقص اور قصور کی ہوتی ہے کسی اور کے قصور کی نہیں“

ماشاء اللہ کیا فلسفہ عدل و انصاف ہے اور عظمت انسان، کا کیسا بلند تصور ہے جو

ان سطور سے جھٹک رہا ہے! ایک اور عیسائی بزرگ اکیوناس کا ارشاد ہے: ”جو بچے بپتسمہ لینے سے پہلے مر گئے ان میں چونکہ ”اصلی گناہ“ برقرار ہے اس لئے وہ کبھی خداوند کی بادشاہت نہیں دیکھیں گے“ مطلب یہ ہوا کہ عیسائیوں کی اولاد اگر بپتسمہ لینے سے قبل ہی اتفاقاً مر جائے تو وہ بھی جہنمی اور ہمیشہ کی سزا کی مستوجب ہے۔

کنارے کا عقیدہ چونکہ عقل دکھ اور فطرت انسانی کے خلاف ہے اور نتائج کے لحاظ سے خوفناک بھی، لہذا عیسائی دنیا کی اکثریت کے اس پراسرار کے باوجود ہمیشہ اس کے خلاف کسی نہ کسی رنگ میں صدائے رد و احتجاج بلند ہوتی رہی ہے۔ لیکن اسے چھوڑنے کا نتیجہ پورٹوس کی تہہ کردہ عیسائیت کی عظیم عمارت کا انہدام تھا لہذا مخالفانہ آوازیں ہمیشہ صدائے صحرانِ ثبات ہوتی رہیں آج بھی عیسائیت کے تمام بڑے فرقے اس عقیدے پر متفق ہیں۔

انسان کے پیدائشی گناہ کا رہنے کا عقیدہ جس پر کفار کے کا عقیدہ قائم کیا گیا ہے، کسی آسمانی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ اب تو خود کیتھولک علماء بھی تسلیم کرنے لگے ہیں کہ بائبل میں اس عقیدے کی کوئی بنیاد نہیں۔ ایک جرمن عیسائی ہربرٹ باگ نے ”کیا پیدائشی گناہ مذہبی کتابوں میں موجود ہے؟“ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ تیسری صدی تک یہ عقیدہ عیسائیوں میں موجود نہ تھا کہ انسان پیدائشی گناہ کا رہے۔

عیسائیت کا ارتقا عیسائیت کی ابتدائی تاریخ بڑی حد تک نامعلوم ہے۔ جسے جتنے حالات و واقعات ہی معلوم ہو سکتے ہیں جن کا منہج عہد نامہ جدید کی کتابیں اور کچھ تاریخی مواد ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے رُفح کے بعد حواریوں پر گھرا ہوا اور بے چارگی کا مستط ہونا قدرتی امر تھا مگر انہوں نے ناموافق حالات میں اپنا تبلیغی کام جاری رکھا۔ اس وقت تک عیسائیت ایک الگ مذہب شمار نہ ہوتی تھی بلکہ اس کی حیثیت یہودیت میں ایک اصلاحی و اخلاقی تحریک کی تھی۔ عیسیٰ کی ہدایت کے مطابق غیر یہودیوں کو دعوت نہیں دی جاتی تھی اور یہود میں دعوت کی اشاعت کا کام بڑا سست تھا۔ پچھلے واقعات کی یاد بھی ذہنوں میں تازہ تھی لہذا اس گھٹی گھٹی فضا میں کام بڑا مشکل سے چل رہا تھا۔ اچانک ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے حالات کا رخ بدل دیا۔ یہ واقعہ ایک یہودی عالم ساؤل نامی کا یکا یک منور وار ہو کر عیسائیت کو قبول کرنے کا اعلان تھا۔ یہ شخص پہلے عیسیٰ مسیحؑ اور حواریوں کا دشمن رہ چکا تھا۔ اس کی ملاقات عیسیٰ علیہ السلام سے تو نہیں ہوئی تھی مگر وہ ان کے پیروؤں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے میں پیش پیش تھا۔ کہا

جاتا ہے کہ وہ قبیل بن یا یسین سے تعلق رکھتا تھا اور عقائد کے اعتبار سے شہید قسم کا فرقہ سی
 یہودی تھا۔ وہ روم کے شہر ترسوس کا باشندہ تھا۔ عیسائیت پر باقاعدہ ایمان لانے سے
 پہلے وہ غور و فکر کرنے کی خاطر یرشلیم سے نکل کر سیدھا جنوبی دمشق چلا گیا۔ یہاں اُس نے
 تین سال گزارے۔ بعد ازاں وہ یکا یک ڈرامائی انداز میں سیدھا یرشلیم پہنچا۔ اور اعلان کیا کہ دمشق
 کے رستے میں اس پر ایک نور چمکا اور آسمان سے عیسیٰ کی آواز نے اسے چوکا دیا۔ اس آواز
 نے اُسے — بقول اُس کے — عیسائیت پر ایمان لانے اور تبلیغ مذہب میں عیسیٰ علیہ السلام
 کی نمائندگی کرنے کا حکم دیا تھا۔ حواری اس کی پچھلی زندگی کے باعث اس سے ڈرتے تھے مگر
 برنیاس کی سفارش پر سب خاموش ہو گئے اور اسے اپنی برادری کا رکن بنا لیا۔ اس نے اپنا نام
 بدل کر پولوس رکھ لیا اور حواریوں کے ساتھ مل کر مذہب عیسوی کی اشاعت کرنے لگا۔
 حواریوں سے اس کی پہلی مخالفت اس وقت سامنے آئی جب اُس نے غیر یہودیوں کو بھی —
 رومی، یونانی وغیرہ — عیسائیت کا پیغام دینا اور انہیں داخل مذہب کرنا شروع کر دیا۔
 اکثر حواری عیسیٰ کے پیغام کو یہودیوں کی اصلاح تک محدود جانتے تھے۔ اب ان کے دوحقے
 ہو گئے۔ برنیاس — حسب بیان لوقا — پولوس کے ساتھ تھا اور یہ لوگ یرشلیم کے
 باہر انطاکیہ وغیرہ کے علاقوں میں جاسکے۔ دوسرے خیال کے لوگ یرشلیم میں رہے۔
 مگر اس وقت تک یونانیوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے باعث بہت سے غیر یہودی داخل
 عیسائیت ہو چکے تھے۔ غیر یہودیوں بالخصوص یونانیوں اور رومیوں کے لئے قابل قبول بنانے
 کی خاطر پولوس نے عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات میں تحریف کی۔ عقیدہ تثلیث و حلول اور
 کفارہ یونانی فلسفہ زدہ دماغ کے لئے بہت دل پسند اور خوش آئند تھا۔ صرف نام بدلنے پڑے
 ورنہ بالکل وہی توہم جو یونانی دیوتاؤں کیلئے منائے جاتے تھے اب عیسیٰ کے نام پر منائے جاتے
 لگے۔ میلاد مسیح کی تاریخ اور مہینہ تک بدل دیا گیا۔ ۵۴۰ سمبر دراصل یونانی مشرکوں کے
 ان سورج دیوتا کی عبادت کا دن تھا۔ اب اسے میلاد مسیح کی عید بنا دیا گیا حالانکہ عیسیٰ کی
 پیدائش موسم گرما میں ہوئی تھی جس کا ثبوت خود انجیل میں موجود ہے۔

مسیح کے حواریوں نے جب پولوس کی کارروائیوں کو دکھا تو پہلے تو اسے ان سے باز
 رکھنے کی کوشش کی، جب اس میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے کھل کر پولوس کی مخالفت کی۔
 غالباً برنیاس کی انجیل اسی غرض سے لکھی گئی کہ یہ حواری پولوس کے نئے ایجاد کردہ مذہب کو
 رد کر چکا تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کی مسیح تعلیم کے ساتھ ان کی زندگی کے صحیح آنکھوں دکھائے

اور کانوں نے حالات و واقعات قلمبند کر کے اصل دین مسیح کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ یونانی ذہن جو عیسائیت پر فہم نہ کر چکا تھا وہ اس انجیل کو برداشت نہ کر سکا اور بلا دلیل و بلا سبب اسے رد کر دیا۔ یہ انجیل جب بھی کسی زبان — انگریزی، عربی، اردو وغیرہ — میں چھپی اسے فوراً ناپید کر دیا گیا۔ اب یہ لاسٹور سے چھپ چکی ہے۔ اور باسانی مل سکتی ہے، لوقا نے حواریوں کے اعمال کے نام سے جو رسالہ لکھا تھا وہ عہد جدید کی کتابوں میں شامل ہے۔ جب لوقا پولوس کے ساتھ حواریوں کے اختلاف کے موضوع تک پہنچتا ہے تو اس کے بعد حواریوں کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ عیسائی لٹریچر میں اس واقعہ کے بعد حواریوں کو پس پردہ کر دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی نکتہ دلیل ہے کہ موجودہ عیسائیت کا بانی پولوس تھا۔ لوقا اس کا شاگرد ہونے کے باعث قصص حواریوں کے احوال پر پردہ ڈال دینا چاہتا تھا۔ عرض اس کے بعد پولوس عیسائیت پر چھا گیا اور اسی کا ایجاد کردہ مذہب عیسائیت کہلانے لگا۔ اس نے یونانیوں کی خاطر ختنہ کا حکم منسوخ کر دیا اور حلال و حرام کی تقویٰ مٹا ڈالی۔

چوتھی صدی عیسوی تک عیسائی مذہب کے ماننے والے ائمہ نہیں سکے، یہ زمانہ عیسائیت کی مغلوبیت و مظلومیت کا تھا جسے عیسائی وہ زمانہ تندیب و ابتلا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۳۱۳ء میں مسیحیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی اور وہ یونان، روم، شام اور فلسطین میں پھیلے ہوئے تھے، فیرو نے ان پر رومی سلطنت کی مخالفت کا الزام لگا کر قید، تصلیب زندہ جلانے، درندوں کے آگے ڈالنے اور روم کے کھیلوں کے اکھاڑوں میں بے پناہ مظالم کا نشانہ بنایا۔ ۳۱۳ء میں طلیس رومی نے یروشلم اور آلفین کو برباد کیا۔ یہود کے ساتھ عیسائیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارا۔ ان کے بیوی بچوں کو غلام بنایا اور ایمفی تھیٹروں میں درندوں کے آگے ڈلوا دیا یا شمشیر بے زہار کے سپرد کر دیا۔

نیرو کے بعد نصف درجن سے زائد رومی بادشاہوں نے عیسائیوں کے خلاف شدید قسم کے مظالم کی پالیسی جاری رکھی۔ ان کی مذہبی کتابیں جلوا دیں، عبادت گاہیں گروا دیں۔ انہیں گرجوں میں بند کر کے جلوا دیا اور ناقابل تصور ظلم و ستم ان پر روا رکھے۔ چوتھی صدی کی ابتداء تک یہی حال رہا۔ آخر کار جب قسطنطین اعظم نے عیسائیت قبول کی تو حالات نے پلٹا لکھایا۔ اس بادشاہ نے عیسائیت کی تبلیغ کا بیڑا اٹھایا۔ ان کی عبادت گاہیں بنوائیں۔ عیسائیوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے اور ان کے علماء کا بہت

زیادہ اعزاز و اکرام کیا۔ اس نے مختلف عیسائی فرقوں کو متحد کرنے اور ان کے عقائد کا اختلاف مٹانے کی بھی سرکوشش کی۔ اسی کے عہد حکومت میں ۱۵۵۲ء میں نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی اور تثلیث کو عیسائیت کا بنیادی عقیدہ قرار دے کر سلطنت میں اسے بزر وراہج کیا اور اس کے مخالف عیسائیوں، آریوس وغیرہ کو مذہب سے خارج کر کے جلا وطن کر دیا۔ عقیدے کے بحث و مباحثے دو صدیوں تک جاری رہے مگر پہلا قدم اٹھانے والا یہی بادشاہ تھا۔

قسطنطین اعظم نے غیر عیسائی رعایا پر تبدیل مذہب کے لئے ظلم و تشدد بھی کیا۔ مشرکوں کی عبادت گاہیں گروا دیں۔ بتوں کو تڑوا دیا۔ مندروں کے اوقاف چھین لئے اور بزورِ شمشیر عیسائیت کو پھیلانے کے بہت سے طریقے اختیار کئے۔ ایسے قوانین بھی وضع کئے گئے جن کی مدد سے حکام کو جبراً غیر عیسائی آبادی کا مذہب اور ثقافت مٹا دینے کے اختیارات حاصل ہوئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مائیکل میں حکومت کی طاقت آتے ہی عیسائیت نے مظلومیت کا چہرہ اتار کر ظلم و تشدد اور سنگاری کا روپ دھار لیا۔ شاید اپنی بچھی مظلومیوں کا بدلہ اب بے گناہ غیر عیسائی آبادی سے لینا چاہتی تھی۔ آخر کار بت پرست رعایا جان بچانے کے لئے دھڑا دھڑا داخل عیسائیت ہونے لگی۔ چند ہی سال میں سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے تک عیسائیت کو فتح حاصل ہو چکی تھی۔ اور بت پرستی کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ یوں افریقہ اور فلسطین کے علاقوں کے علاوہ اس یورپ میں بھی بزورِ شمشیر عیسائیت کو پھیلایا گیا جو آج بزورِ شمشیر پھیلانے جانے کا الزام عیسائیت کے گلے سے اتار کر جھوٹ موٹ اسلام کے سر پہنچانا چاہتا ہے۔

چوتھی صدی سے چھٹی صدی مسیحی تک عیسائیت کے فروغ و اشاعت کا زمانہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی عیسائیت دو سلطنتوں میں بٹ گئی جو ایک دوسری کی رقیب و حریف بھی تھیں۔ پہلی مشرقی سلطنت جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا۔ اور اس میں بلقان، یونان، ایشیا کے کوچک، مصر اور حبشہ شامل تھے۔ یہاں کا سب سے بڑا مذہبی رہنما بطریق کہلاتا تھا۔ دوسری مغربی سلطنت مبنی جو روم اور یورپ کے بیشتر علاقے پر مشتمل تھی۔ اور اس کا مرکز روم تھا۔ اس کا مذہبی پیشوا پوپ کہلاتا تھا۔ علاوہ ازیں اس دور میں عیسائیت میں رہبانیت پیدا ہوئی۔ اس کے لئے باقاعدہ ادارے اور خانقاہیں وجود میں آئیں۔ اس رہبانیت کی مثالیں ہمیں مہند و مذہب کے سادہ صورت نظام میں اور بدھ مذہب کے منکشانہ ادارے میں بخوبی دکھائی دے سکتی ہیں۔ رہبانیت کی تعلیم غیر

فطری ہے۔ لاسب اپنی دنیوی ضروریات میں سوسائٹی پر بوجھ بنتے ہیں، دوسروں کی کمائی پر پلے ہیں۔ سماج کی اجتماعی فلاح و بہبود میں حصہ لینے کے بجائے اُنٹا اس کے کندھوں پر پیر لسمہ پا بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مسیح کی تعلیم — اگر وہ وہی ہے جو انجیلوں میں لکھی ہے! مادہ پرستی اور غرغرضی کے خلاف ایک چوٹ مٹی۔ بعد میں اس کو غلط معنے پہنا کر اور ترک دنیا کو رضائے الہی کا ذریعہ جان کر ایک باقاعدہ مذہبی ادارہ بنا ڈالا گیا۔ دنیا کی فلاح و صلاح پر اس کے بے شمار مضرات پڑے ہیں۔ خدا کا صبح دین جو دنیا کے رہنے والوں کی رہنمائی کے لئے بھیجا گیا۔ دنیوی معاملات سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ وہ خدا پرستی دراصل نفس پرستی اور خود غرغرضی ہے جو ایک انسان کو صرف اس کی ذات کی فلاح کا راستہ تو دکھائے مگر دوسروں کے حقوق و فرائض سے بیگانہ کر دے۔ اسی لئے حضورؐ کا ارشاد ہے لَا تَتَّبِعُوا هَبَانِيَّةً فِي الْإِسْلَامِ ”اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں“

پچھلی صدی عیسوی کے آثار سے لے کر نویں صدی کے اوائل تک کا زمانہ عیسائیوں کے ہاں قرون مظلمہ — تاریک دور کہلاتا ہے۔ اس اصطلاح میں ایک طرف تو اسلام کے خلاف عداوت و تعصب کا فرما ہے اور دوسری طرف عیسائیوں کے اس سیاسی اور علمی و عملی انحطاط کا اظہار ہے جس میں اس وقت عیسائی دنیا گرفتار تھی۔ پہلی چیز کا سبب اسلام کا ظہور اور اس کا بے نظیر عروج تھا۔ اور دوسری کا باعث فرقہ بندی اور انتشار — اسلامی اتحاد کا علم ”مشرقی ممالک یعنی شام و عراق اور فارس میں لہرا رہا تھا۔ اور اس دینِ حق کی روشنی مغربی ممالک یعنی مصر، افریقہ، اندلس اور سسلی میں بھی پھیل چکی تھی۔ مسلمان تازہ دم تھے۔ اور عیسائی دنیا کے جسم و جان پر تنگی اور ماندگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ بے درپے علمی و سیاسی اور معاشرتی شکستوں نے انہیں خستہ حال اور مایوس بنا رکھا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی عیسائی روم کی مذہبی و سیاسی فتوحات کا عظیم لہرانے ہوئے برطانیہ، جرمنی اور فرانس وغیرہ پر چھا گئے اور یورپ نے عیسائیت کے سامنے گھٹے ٹیک دیئے۔ یورپی ممالک میں عیسائی مذہب کے علاوہ روم و یونان کے علوم طبیعیہ، فلسفہ، منطق اور ہندسہ و ریاضی بھی داخل ہوئے۔ غالباً اسی لئے عیسائی آج اسلام اور مسلمانوں کا نامور میان سے محذوف کر کے اپنی تہذیب و ثقافت کا رشتہ براہ راست روم و ایران سے ملاتے ہیں۔ یہ ایک الگ علمی بحث ہے جس پر گفتگو کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے واسطے کو ازراہ تعصب محذوف کرنا ممکن نہیں۔ یورپ کو ریاضی کی بعض خالص ”اسلامی“ شاخیں مثلاً الجبرا، علم ہیت و نجوم، علم طب، تاریخ و جغرافیہ بالخصوص فلسفہ تاریخ کا فن مسلمان

سے ملا۔ آج بھی یورپ کے کتب خانے عربوں کی کتابوں سے چرچے میں مسلمان معنفین کی کتابیں صدیوں تک یورپ کی درس گاہوں میں داخل نصاب رہ چکی ہیں۔ بین الاقوامی اور بین الممالک کا قانون خالصاً مسلمانوں کا علم ہے۔ جو انہی سے یورپ کو ملا۔

آٹھویں صدی کے شروع سے لے کر سولہویں صدی عیسوی کے وسط تک کا دور عیسائی تاریخ میں قرون وسطیٰ — درمیانی ادوار — کہلاتا ہے۔ اس دور میں یورپ خانہ جنگی کی لپیٹ میں آگیا۔ ایک طرف پوپ کا اقتدار تھا تو دوسری طرف شاہان وقت کی سلطنت۔ نشیب و فراز میں سے گزر کر یہ زمانہ پوپ کی شکست اور مشنناہیت کی فتح پر منتج ہوا۔ اس زمانے میں عیسائیوں نے وحشت و بربریت کا وہ مظاہرہ کیا کہ عیسائی مسیح کی قیلم شرم کے مارے مندر و صائب کر پردہ نشین ہو گئی۔ پوپ کی قائم کردہ مذہبی عدالتیں

INQUISITION صرف غیر عیسائیوں پر ہی ظلم و ستم کی مرکب نہ ہوئیں بلکہ کفر و الحاد، سکے بہانے سے انہوں نے خود عیسائیوں پر بھی ناقابل تصور مظالم کئے۔ سزائوں میں زندہ جلانا، لٹاؤ، زبان کاٹ دینا، مڑوں کی قبریں اکھاڑ کر ہڈیوں کو چور چور کر دینا بھی شامل تھا۔ ان عدالتوں نے لاکھوں انسانوں کو قتل کیا۔ پوپ کے خود ساختہ مذہبی اقتدار اور غیر محدود قانون سازی کے اختیار کو جس کسی نے وہی زبان سے بھی چیلنج کیا اس پر بے پناہ مظالم توڑے گئے۔ مذہبی ٹیکس لگانا، بے شمار نذرین نیازیں وصول کرنا اور سزات کے پروانے فروخت کرنا، مذہبی اختیارات کو ذاتی منافع کے لئے استعمال کرنا، یہ وہ چیزیں تھیں جن کے خلاف اصلاح کی تحریکیں اٹھیں اور انہیں بڑی بے رحمی اور تشدد سے دبا دیا گیا۔

اسی دور میں مشرقی کیسا ہمیشہ کے لئے پوپ — رومن کیتھولک چرچ کا مقدس رہنما — کی غلامی کے بندھن سے آزاد ہو کر مقدس آرمنیوڈکس چرچ کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اس کا سبب ایک تو نظریاتی اختلاف تھا جو مسئلہ تخلیق کی تفاسیل میں واقع ہوا۔ آرمنیوڈکس چرچ کا عقیدہ یہ تھا کہ روح القدس کا انقنوم صرف باپ کے انقنوم سے بیٹے انقنوم کے واسطے سے نکلا تھا۔ اس کے برخلاف کیتھولک چرچ کے نزدیک روح القدس کا انقنوم باپ اور بیٹے دونوں سے نکلا تھا۔ آرمنیوڈکس چرچ کے نزدیک باپ کا رُتبہ انقنوم پر سے بڑا تھا۔ مگر کیتھولک چرچ کے نزدیک وہ دونوں برابر ہیں۔ اختلاف کا دوسرا سبب نسلی امتیاز تھا۔ کیتھولک چرچ میں اطالوی اور جرمن نسل تھی جب کہ آرمنیوڈکس میں یونانی اور ایشیائی نسل۔ تیسرا سبب سلطنتِ روم کی تقسیم تھی۔ جو مذہب اور عقیدے پر

میں اثر انداز ہوئی۔ اب قسطنطنیہ کا مشہور دم کا مذمقابل بن چکا تھا۔ پوپ نے بطریق کا اقتدار کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ آپس میں لعنت بازی اور سب و شتم کی صورت میں نکلا۔ اسی دور میں مشہور و معروف صلیبی جنگیں برپا ہوئیں۔ ان جنگوں کو پوپ نے مقدس مذہبی جنگ کا نام دیا۔ اور ان میں حصہ لینے والوں کو ہر قسم کی بد عنوانی اور بد معاشی کی کھلی چٹھ دیتے ہوئے بخشش اور جنت کا پروانہ دے دیا۔ ان جنگوں کا زمانہ طویل تھا۔ پوری عیسائی دنیا ایک طرف اور پہلے سلجوقی اور پھر ایوبی ترک دوسری طرف مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ یہ زمانہ عباسی سلطنت کی کمزوری کا تھا۔ اس لئے نام نہاد خلفاء نے ان جنگوں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ آخری جنگوں میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھا کر یورپ نے قدم پیچھے ہٹا لیا۔ اور یہ تاریخ جنگیں ہمیشہ کے لئے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان نفرت و عداوت کا گہرا نشان چھوڑ کر ختم ہو گئیں۔ عیسائیوں نے ان کی یاد کبھی نہیں مٹائی۔ جتنی کر زمانہ حال میں اسرائیل کا قیام اور اس کی سرپرستی میں اسی جذبہ انتقام کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں عیسائی دنیا میں مذہبی اصلاح کی کئی آوازیں اور کئی تحریکیں اٹھیں۔ مسیحیوں کے پیش نظر زیادہ تر پاپائی نظام کی اصلاح تھی تا کہ ان بد عنوانیوں کا خاتمہ ہو سکے جو اس ادارے میں راہ پا چکی تھیں۔ چودھویں صدی کے آواخر میں والی کلف نامی ایک مصلح نے کیسا کی بد عنوانیوں کے خلاف احتجاج کیا اور پاپاؤں کے باضابطہ انتخاب پر زور دیا۔ اس نے بائبل کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔ پاپاؤں نے کتاب مقدس کے ترجمے پر پابندی لگا کر اسے جرم قرار دے رکھا تھا۔ اس کے بعد جان ہس اور جیروم نے اصلاحی آوازیں بلند کیں مگر بچا بے دونوں زندہ جلا دیئے گئے۔ پاپائیت کے طاقتور جموں کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔

اس دوران میں عیسائیوں کی کئی کونسلیں بھی بلائی گئیں۔ ۱۵۴۷ء میں پیسا کے مقام پر کونسل کا اجلاس ہوا جس میں ۱۵۰۰ بپشپ شامل ہوئے۔ اس کونسل نے عیسائی دنیا کو ایک پوپ پر متفق کرنے کی کوشش کی۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے پاپائیت دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک حصہ فرانسیسی اور سپین وغیرہ پر اور دوسرا اٹلی، انگلینڈ اور جرمنی پر مشتمل تھا۔ کونسل نے دونوں پوپ محروم کئے اور ایگزٹیکٹر کو پانچواں پوپ نامزد کر دیا جو فوراً موت کا شکار ہو گیا۔ پھر ایک مشہور بحری ڈاکو جان سم کو پوپ بنایا گیا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اب دو کے بجائے تین پوپ مقرر ہونے لگے۔ ۱۶۱۵ء میں کانسٹنس میں پھر

کونسل ملائی گئی جو ایک ہی پوپ مقرر کرنے اور پاپائیت کے افراق کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اصلاح کلیسا کی تحریک کا سیلاب رگ نہ سکا تو ۱۹۳۲ء میں بائبل کی کونسل منعقد ہوئی جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

آخر کار پندرہویں صدی کے اواخر میں مارٹن لوتھر اٹھارہویں صدی کے پروسٹیسٹنٹ فرقہ کی بنیاد رکھ کر پوپ کے عالم گیر اقتدار کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس نے بخشش ناموں کی تجارت اور کیتھولک چرچ کی ایجاد کردہ تمام رسوم کو فضول اور من گھڑت بتا کر ختم کر دیا۔ اس فرقہ میں میتیمہ اور عشا کے ربانی کے سوا کوئی رسم ادا نہیں کی جاتی۔ لوتھر کی اولاد کو زونگلی اور جان کالون نے آگے بڑھایا اور آخر کار فرانس، جرمنی، انگلستان وغیرہ میں کیتھولک کے مقابلے میں ہمیشہ کے لئے پروسٹیسٹنٹ چرچ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا۔ آج کی عیسائی دنیا میں گو کیتھولک فرقہ کی تعداد زیادہ ہے۔ مگر پروسٹیسٹنٹ اور ارتھوڈوکس چرچ کی طاقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انگلینڈ اور دیگر کئی یورپی ملکوں کا سرکاری مذہب بھی پروسٹیسٹنٹ ہے۔

لوتھر کی تبدیلیاں

- ۱۔ عبادت مقامی زبان میں ہو۔
 - ۲۔ عبادت میں وعظ لازم ہے۔
 - ۳۔ گیت گانا لازم ہو گیا۔
 - ۴۔ قربانی وغیرہ یا دعا پڑھنا ضروری نہیں۔
- انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا

لوتھر نظم

$$\frac{447}{14}$$

عیسائی مذہب میں اٹھنے والی ان اصلاحی تحریکوں نے یورپ میں عقلیت کو بیدار کیا اور وہ دور شروع ہوا جسے نشاۃ ثانیہ RENAISSANCE کہا گیا ہے۔ یہ سائنس، ٹیکنیک اور علم و فن کی سرشاری میں یورپ کی ترقی و عروج کا زمانہ تھا۔ اہل مذہب کی تنگ دلی، خود غرضی اور شکم پرستی نے عوام کو مذہب سے متنفر کر دیا تھا۔ لہذا صرف پوپ اور مذہبی اجارہ داروں کے خلاف ہی آواز نہیں اٹھی بلکہ یہ نفرت ایک

سیلاب بن کر اٹھی اور اہل مذہب کے ساتھ مذہب کو بھی بہا لے گئی۔ اس میں عیسائیت کے ناقابل فہم اور خلاف فطرت عقائد مثلاً تثلیث، حلول، مجسم، عیسیٰ مسیح کے سولی چڑھ کر اولاد آدم کے موروثی گناہ معاف کر دینے کا بھی کافی حد تک دخل تھا۔ اس دور میں مذہب کی ہر چیز، کتاب مقدس اور رسوم عبادت وغیرہ ہر چیز پر ماتہ صاف کیا گیا اور ان کا کھلا مذاق اڑایا گیا۔ لوگوں نے تحقیق، علم، آزادی رائے اور فلسفہ و سائنس کے نام پر وہ کچھ کیا جس کے نتیجے میں کیونرزم کی لائڈ سہیت کا خطرناک بصورت نمودار ہوا۔ خدا پر تنقید کی گئی اور اس کے وجود کا انکار کر کے مذہب کا مفہم اڑایا گیا۔

یہ صورت حال دیکھ کر یورپ کے سمجھ دار اور اعتدال پسند طبقوں نے مذہب کو بچانے کی خاطر تجدیدِ جدیدیت کی تحریک اٹھائی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مذہب میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں تاکہ وہ سائنسی ایجادات اور نئے انکشافات کا ساتھ دے سکے قابل ہو سکے۔ اس کا بڑا باعث ہمارے خیال میں یہ تھا کہ عیسائیت یورپ میں عیسائی قوموں کے شیرازے کو باندھے رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اسے اگر ماتھے سے دے دیا جائے تو معاشرتی، تمدنی، فنی اور سیاسی بنیادیں ہل جائیں گی۔ پس ضروری ہوا کہ کسی مذہبی شکل میں اس مرکزی طاقت کو قائم رکھا جائے۔ یہی عیسائیت دنیا کے دوسرے مذاہب میں دخل اندازی کرنے اور انہیں غلام بنانے یا دیر تک بنائے رکھنے کا ایک موثر ہتھیار بھی تھی۔ یہ اگر جاتی ہے تو شہنشاہ مغرب کا وجود ہی خطرے میں پڑتا ہے۔ فرانس کا مشہور فلسفی روسو اور پروفیسر مارٹینک اس طبقے کے سرکردہ تھے۔

عقلیت پسندی کی تحریک کے مقابلے میں عیسائیت کے احیاء کی ایک تحریک بھی اٹھی جس کے پیش نظر خالص رومن کیتھولک مذہب کو اس کی اصلی اور ابتدائی شکل و صورت میں زندہ کرنا تھا۔ یہ انیسویں صدی کی مشہور تحریک ہے۔ مادیت جلد ہی اپنے ہنگام و پارے آتی تھی۔ اور اس کے تناور درخت نے انسان پر اپنے کڑے پھل گرانے شروع کر دیئے تھے۔ لوگ اب اس سے بھی گھبرا اٹھے تھے۔ لہذا اس تحریک کو بھی اپنے کڑے پھل مل گیا۔ اس وقت یہ تحریک عقلیت اور جہد کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ متوازن لائڈوں پر محو سفر ہے۔ یہ تینوں تحریکیں برسرِ عمل اور مصروفِ جنگ و جدل ہیں۔ مگر اسلام کے خلاف نفرت جو پھیلا دی گئی ہے وہ عیسائیوں کو اس کی طرف متوجہ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔

عیسائی لٹریچر سے ہماری مراد عام مذہبی کتابیں نہیں بلکہ وہ مقدس عیسائیت کا لٹریچر یا الہامی کتابیں ہیں جنہیں عیسائی دنیا میں "عبدالہمید" کے

نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بائبل کا دوسرا حصہ ہے۔ اس حصے میں ۷۷ کتابیں شامل ہیں (۱)۔ چار انجیلیں، متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی انجیل (۲) اعمال، اس میں حواریوں کے کارنامے لکھا اور پولس کے زیادہ تر درج ہیں۔ مصنف وہی لوقا ہے جو پولس کا شاگرد اور ساتھی تھا۔ (۳) پولس کے ۱۴ خطوط مختلف لوگوں کے نام (۴) بطرس حواری کے دو خط (۵) یعقوب کا خط (۶) یہود کا خط (۷) یوحنا کے تین خط (۸) یوحنا کا مکاشفہ۔ یہ مجموعہ پانچویں صدی عیسوی کے بالکل اواخر میں اس وقت کے پوپ کی طرف سے مستند قرار دیا گیا تھا۔ ان کتابوں کے علاوہ کم و بیش ڈیڑھ صد کتابیں وہ ہیں جو کبھی مستند مانی جاتی تھیں۔ مگر اب انہیں مقدس کتابوں کی فہرست سے خارج قرار دیا گیا ہے۔ اوپر کی کتابیں کتابوں پر بھی عیسائی عقیدت نے بڑی لے دے کی ہے۔ ان میں سے بعض اگر ایک کے نزدیک معتبر ہیں۔ تو دوسرے کے نزدیک غیر معتبر۔ بعض کتابوں میں ترمیم و اضافے کا بھی ثبوت دیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں سے چونکہ چار انجیلوں کو عیسائی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ لہذا ان پر ذرا تفصیلی گفتگو مناسب ہے۔ باقی کتابیں الہامی نہیں، مگر عیسائی لوگ انہیں بھی پولس یا دوسرے لوگوں کا الہام کہیں نیز ان پر اس قدر اعتراضات و شکوک خود عیسائی مصنفین کی طرف سے وارد کئے گئے ہیں کہ ان کی کوئی مستند حیثیت باقی نہیں رہتی۔

اناجیل اربعہ عیسائی کی سوانح عمری کی ہے۔ خدا کی نازل کردہ وحی کی نہیں۔ ان میں عیسائی کا نسب نامہ، بچپن، لوگوں، جوانی اور بخت اور پھر پیغمبرانہ کارنامے بیان کر کے آخر میں ان کی سولی، موت، دفن ہونے اور پھر قبر سے غائب ہونے تک کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ب۔ ان کے مصنف مجہول الحال اشخاص ہیں۔ اور زمانہ تصنیف بھی اندازے سے متعین کیا جاتا ہے۔ ج۔ یہ کتابیں عیسائی کی زبان — سرکاری یا آرامی — میں نہیں بلکہ یونانی میں لکھی گئیں اور مجہولونانی سے دوسری زبانوں میں ترجمے کئے گئے۔ یہ اصل یونانی انجیل بھی نہیں بلکہ اس کا ترجمہ در ترجمہ ہے۔ (د) عیسائی پر نازل شدہ ایک انجیل تھی۔ ان کے بعد بے شمار انجیلیں لکھی گئیں۔ جن میں سچو تھی صدی کی یقینہ کونسل نے ان چار کو منتخب کر لیا اور وہ بھی محض اصل اور قریب اندازہ کے ساتھ۔ مگر ان چاروں انجیلوں میں بے شمار اختلافات اور تضاد موجود ہیں۔ جب کہ خدا کی کتاب میں تضاد نہیں ہو سکتا۔ عیسائی کے نسب نامے پہاڑی کے وعظ اور صلیب کے واقعات تک میں اختلاف موجود ہیں۔ د۔ ان انجیلوں میں ہمیشہ تحریف ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے۔ ہر ایڈیشن میں کمی بیشی اور اصلاح کا

سلسلہ جاری رہتا ہے۔ زہر بنیاس حواری کی انجیل دلائل کے اعتبار سے ان سب سے معتبر ہے۔ مگر عیسائیوں نے اسے بلا دلیل مسترد کر رکھا ہے۔ شاید اس لئے کہ اس میں مسیح کے صلیب پائے سے انکار اور حضور رسولؐ آخر الزمان کا نام نامی کسی مرتبہ آیا ہے۔ ح۔ قرآن مجید نے جس انجیل کو خدا کا کلام فرمایا ہے یہ وہ انجیل نہیں جیسا کہ اؤپر بیان ہوا۔ خود عیسائی علماء و فضلاء کو بھی یہ حقیقت معلوم ہے۔ تعصب اور عناد اسلام کے باعث اظہار حقیقت نہ کریں تو دوسری بات ہے۔ ط۔ خدا کی کتاب نہ ہونے میں اور بعد کی ایجاد بندہ ہونے میں تورات اور زبور کا بھی یہی حال ہے۔ جن مسلمانوں نے اس کے خلاف کہا ہے لاعلمی کی بناء پر کہا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ عیسائی کی مشکوک و مترجم سوانح عمری تر خدا کی کتاب نہیں ہو سکتی اور خود عیسائی محققین نے چھان بین کے بعد بھی یقینہ نکالا ہے جو بیان ہوا۔ جی۔ بعض دیسی مسیحی پادری جو بائبل یا انجیل کے غیر محرف ہونے اور محفوظ ہونے کا پروپیگنڈا کرتے ہیں، یا ترجمان کی بناء پر کہتے ہیں یا حتی ملازمت کی خاطر۔ ورنہ سچے شام دلائل قاطعہ اُن کے قول اور زعم کے خلاف خود ان کتابوں میں اور پر پڑے لکھے عیسائیوں کی تصنیفات میں موجود ہیں۔ ک۔ تورات و زبور اور انجیل (موجودہ) کی حیثیت سند کے لحاظ سے ہماری حدیث کی صحیح کتابوں جیسی بھی نہیں۔ ان کی سند منقطع ہے۔ اُس میں مجموعی الحال اشخاص کے نام آتے ہیں۔ ان کتابوں کی روایت کی حیثیت تیسرے چوتھے درجے کی کتب حدیث جیسی بھی نہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی سند و روایت ہماری تاریخ و سیرت کی کتابوں جیسی ہے۔ بلکہ اُن سے بھی کم تر۔ کیونکہ تاریخ و سیرت میں بھی اہل اسلام میں سند متصل کا رواج ہے۔ سند میں انقطاع ہو یا مجموعی الحال یا غیر نقد راوی کا نام آجائے تو ایسی روایت کا وہاں بھی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ تفصیل کے لئے مولانا رحمۃ اللہ کی اظہار الحق اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی متحدہ و لقائیف کا مطالعہ مفید ہو گا۔

اب وقت آگیا ہے کہ انجیل اور تہ پر الگ الگ مختصر بات چیت کی جائے۔

۱۔ انجیل متی آیا یہ قدیم تر ہے یا مرقس کی انجیل۔ جن لوگوں نے اسے متی حواری کی طرف منسوب کیا ہے وہ اسے قدیم تر ٹھہراتے ہیں۔ اور اس بات کے قائل ہیں کہ یہ عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ مگر اس چیز کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ واقعی متی حواری کی تصنیف ہے۔ اس کے نویں باب میں متی حواری کا ذکر ایک غیر آدمی کی مانند آیا ہے، متی حواری یہ

نہیں لکھ سکتا تھا کہ: ”یسوع نے وہاں سے آگے بڑھ کر متی نامی ایک شخص کو موصول کی چوکی پر دیکھا“ (انجیل متی باب ۹) پس انجیل کا مصنف اور ہے اور متی حواری اور، جس کا ذکر ایک بیگانہ و نا آشنا شخص کی مانند وہ کرتا ہے۔ متی حواری نے جو کتاب لوجیا کے نام سے لکھی تھی وہ شاید عبرانی یا سُرّیانی میں تھی۔ آج کل وہ بالکل مفقود ہے۔ موجودہ انجیل متی کا مصنف کوئی گناہم شخص ہے جس نے اس کتاب کی تصنیف میں لوجیا سے بھی فائدہ اٹھایا ہو گا۔ اس انجیل کی کل ۲۸ آیتیں ہیں۔ جن میں سے ۲۷ مرقس کی انجیل سے لی گئی ہیں پس ان مسیحی علماء کا خیال درست ہے جو مرقس کی انجیل کو قدیم تر بتاتے ہیں۔ یہ مرقس بھی نہ حواری ہے نہ اُس نے مسیح کا زمانہ پایا تھا۔ انجیل متی کا زمانہ تالیف سنہ ۷۰ یا ۷۵ بتایا گیا ہے۔ پس یہ ایک جھوٹا الحال شخص کی روایت ہے۔ اور اس کی سند منقطع ہے۔ ایسی روایت کسی کے نزدیک لائق اعتماد نہیں ہوتی۔ متی کی انجیل میں یسوع مسیح کا نسب نامہ لوقا کی انجیل سے مختلف ہے۔ متی نے یسوع کو یوسف بنجار کا بیٹا معبرا کر اس کا نسب سلیمان بن داؤد سے ملایا ہے۔ اور لوقا نے یوسف کا نسب ناثن بن داؤد سے ملایا ہے۔ علاوہ انہیں متی لکھتا ہے کہ یوسف کے باپ کا نام یعقوب تھا اور لوقا کے نزدیک یوسف کا باپ عیسیٰ تھا۔ متی نے لکھا ہے کہ حواریوں کو تبلیغ پر روانہ کرتے وقت یسوع نے انہیں لائحہ عملی ساتھ رکھنے کی مخالفت کی تھی۔ مگر لوقا کہتا ہے کہ لائحہ عملی کی اجازت دی تھی۔ متی کے بیان کے مطابق یسوع مسیح کی پیدائش کے بعد اُسے یوسف بادشاہ کے خوف سے مصر سے لے گیا تھا۔ اور وہیں کچھ دیر اس کی پرورش ہوئی، مگر لوقا کا بیان ہے مسیح کو پیدائش کے بعد ناصرہ میں رکھا گیا تھا اور اس کی پرورش وہاں ہوئی۔

مرقس کی انجیل اس انجیل کا مؤلف مرقس بالاتفاق حواری نہیں تھا۔ بلکہ پطرس حواری اسی سبب سے اُسے پطرس کا ترجمان کہا گیا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس انجیل میں سے کون کون سے حصے واقعی پطرس حواری کے بیان کردہ ہیں۔ اور کون کون سے خود مرقس کے۔ لہذا اس انجیل کی سند بھی مشکوک ہے۔ خود مرقس نے اس امر کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس کا زمانہ تالیف ۷۰ء اور ۸۰ء کے درمیان تھا۔ بعض عیسائی علماء کے نزدیک مرقس کی انجیل کا اصل مسودہ لاطینی زبان میں لکھا گیا تھا۔ جو بعد میں یونانی میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا۔ اور ترجمے میں کئی غلطیاں ہو گئیں۔ اصل نسخہ ناپید ہے، صرف تراجم باقی ہیں۔ یہ انجیل روم کے شہر میں پطرس کی موت کے بعد

تصنیف ہوئی تھی۔

لوقا کی انجیل | اس انجیل کا مصنف حواری نہیں تھا۔ ہند میسج سے کبھی ملا تھا۔ یہ پولوس کا شاگرد تھا اور مسلم ہے کہ پولوس خود بھی حواری نہ تھا۔ نہ اس نے مسیح سے بغض حاصل کیا تھا۔ اس انجیل میں پولوس کے خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ پس اس انجیل کی سند بھی منقطع ہے۔ پولوس اور مسیح کا درمیانی رابطہ غائب ہے۔ خود لوقا بیان کرتا ہے کہ اس نے دوسروں سے غشی سنائی باتیں لکھی ہیں۔ یہ کتاب اُس کے رومی حکومت کے ایک عہدہ دار تھیوفیلس کے التماس پر اسے لکھ کر دی تھی۔ جیسا کہ اس کی پہلی آیت سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ مگر لوقا یہ نہیں بتاتا کہ وہ کون سے رومی تھے جن سے اُس نے روایت کی ہے۔ اس لحاظ سے لوقا مجہول اشخاص سے روایت کرتا ہے۔ اس کتاب کا سن تالیف خود عیسائی محققین کے مطابق ۸۵ء سے لے کر ۱۱۰ء تک ہے۔

یوحنا کی انجیل | اس کے متعلق عیسائی دنیا میں تو یہ شہرت ہے کہ یوحنا حواری کی کسی گنام یوحنا کی تصنیف ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۸۰ء سے لے کر ۲۰۰ء تک بتایا جاتا ہے۔ اس انجیل سے صاف نظر آتا ہے کہ مصنف ان یونانی فلسفیانہ خیالات سے سخت متاثر ہے جو پہلی صدی میں عیسائیوں میں پھیل گئے تھے۔ مصنف ایٹیکے کوپک کے شہر افنس کا باشندہ تھا۔ اس کا طرز بیان، فلسفیانہ طرز استدلال اور بیان واقعات کی ترتیب وغیرہ سب دیگر تین انجیلوں سے جدا گانہ ہے۔ شاید عہد جدید کی آخری کتاب مکابشفات یوحنا — جسے جعلی اور خلاف واقعہ یا وہمی و تخلیقاتی باتیں لکھنے کی بناء پر سخت تنقیدات کا نشانہ بنا پڑا ہے۔ — کا مصنف بھی یہی یوحنا ہو۔ اس کا پہلا فقرہ ہی فلسفیانہ اور غمیاتی طرز تحریر کا واضح ثبوت ہے۔ ”آجدار میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام ہی خدا تھا۔“ تحریریں اور بیانی الجھاؤ اس کتاب میں دوسری انجیل کی نسبت زیادہ ہے۔ لوقا کی مانند یوحنا نے بھی اپنی انجیل کو مسیح کی سوانح عمری قرار دیا ہے۔ اور تسلیم کیا ہے کہ یہ انجیل مسیح کے صرف چند کاموں کے بیان پر بطور نمونہ شے از خود اس کی حیثیت رکھتی ہے ورنہ پورے احوال لکھے جاتے تو دنیا میں سما ہی نہ سکتے۔ (بالک)

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ چاروں انجیلیں عیسائی دنیا کی تسلیم شدہ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی انجیلیں تھیں جنہیں رد کر دیا گیا اور قرعہ اندازی سے یہ چار

چھانٹ لی لیکن۔ پوپ کے احکام سے کئی کتابیں عیسائیوں کے لئے ممنوع رہی ہیں۔ جن میں سے انجیل برنیاس بھی ہے۔ اس کا مختصر بیان ضروری ہے۔

پہلی چاروں انجیلوں کے مصنف غیر حواری تھے۔ لیکن برنیاس حواری انجیل برنیاس

تھا۔ لوقا کی تصنیف کردہ کتاب اعمال میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اپنی انجیل میں اُس نے اپنے حواری ہونے اور اول سے آخر تک ساتھ رہنے اور عیسیٰ گواہ ہونے کا شد و مد سے ذکر کیا ہے۔ دوسری انجیلوں میں وہی گئی حواریوں کی فہرست میں اس کا نام درج نہیں ہے۔ عیسائی حضرات مقدس صحیفوں میں بے کھٹکے تحریف اور تغیر و تبدل کے عادی بلکہ فاکل ہیں۔ قیاس غالب یہ ہے کہ انہوں نے خاص مقاصد کے پیش نظر برنیاس کے بجائے اس فہرست میں تو ما کا نام لکھ دیا ہے۔ یہ انجیل اپنے حسی ادا، طرز بیان، ترتیب اور تاثر میں دوسری چاروں انجیلوں سے افضل ہے۔ برنیاس ہر واقعہ اپنا چشم دید اور اپنا ثنا ہوا بیان کرتا ہے۔ اس کتاب کے مضامین مثلاً توحید، شراک، توحید، کد، واضح تعلیم، صفات الہی، عبادات اور اخلاق، انبیاء کی تعلیم کے عین مطابق ہیں۔ یہ کتاب عیسیٰ علیہ السلام کی اصلی اور صحیح تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اس میں آنجناب کی شانوں، روزے اور دعاؤں کا ذکر اسی طرح آیا ہے۔ جس طرح قرآن نے شہادت دی ہے۔ اور جس طرح دوسرے انبیاء کی تعلیم اور عملی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ نمازوں کے اوقات تقریباً وہی پانچ ہیں جو اسلام نے بتائے ہیں۔ اس میں عیسیٰ کے وضو اور طہارت کا بیان بھی ہے۔ حضرت داؤد اور سلیمان کے نبی ہونے کا کھلا بیان بھی ہے حالانکہ یہودی کتابوں نے انہیں محض بادشاہ بنا کر پیش کیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی اصل حیثیت — عہدہ و رسول — کا صراحت سے بار بار ذکر ہے۔ صلیب مسیح کا انکار ہے۔ اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا نام کئی بار آیا ہے۔ یہ کتاب ہمیشہ عیسائیوں نے چھپا کر رکھی اور اسے گم شدہ لٹریچر میں شمار کیا۔ اس کا ایک نسخہ اطالوی زبان میں آسٹریا کے شاہی کتب خانے میں موجود ہے۔ اٹھارویں صدی میں ایک اور نسخہ ہنگری کے مقام پر ڈاکٹر جین کوٹلا جو ہسپانوی زبان میں ہے۔ یہ مشہور و مستشرق جارج یسلی کوٹلا اور اس نے ترجمہ قرآن میں اس کے حوالے دیئے ہیں۔ ہسپانوی ترجمہ کسی مسلمان مصنف غرنڈی نے کیا تھا۔ جو اس نے اصل اطالوی نسخے سے کیا۔ یہ نسخہ ایک عیسائی راہب فرامرنو نے پوپ سیکسٹس پنجم کے کتب خانہ سے چرایا تھا۔ اس کا انگریزی اور عربی ترجمہ شائع ہوا مگر کسی سازش سے اسے ضائع کر دیا گیا۔ اردو میں اس کا دو دفعہ ترجمہ

ہو چکا ہے۔ پہلا مولوی محمد حلیم انصاری نے کیا اور دوسرا پروفیسر آسی ضیائی نے یہ دوسرا ترجمہ غالباً لاہور سے مل سکتا ہے۔ انصاری صاحب کے ترجمہ کا ایک نسخہ ضلع سیالکوٹ میں پستور کے مقام پر مولانا بشیر احمد مرحوم کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ میں نے اسے پڑھا اور اقتباسات لئے ہیں۔ دوسرا نسخہ اسلامیہ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

مسیحی فریقے عیسائیت کی تاریخ کو پڑھنے والا اس حقیقت تک پہنچے میں کوئی مشکل محسوس نہیں کرتا کہ اس مذہب میں بے حد و حساب فرقے رہے ہیں۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ اگر کسی مقام پر دس مختلف الخیال عیسائیوں کا اجتماع ہو اور وہ ابھی اختلاف کو دور کرنے کے لئے بحث و مناظرہ کریں تو کوئی بات طے ہونے کی بجائے جب وہ مجلس کے اختتام پر اٹھیں گے تو گیارہ فریقے بن چکے ہوں گے جن میں سے ہر ایک دوسروں پر لعنت کرتا ہوا اٹھے گا۔ اسی شدید فرقہ بازی کا مقصد کرنے کے لئے مختلف زمانوں میں عیسائی کونسلوں کا انعقاد ہوتا رہا مگر اختلاف مٹ نہیں سکا۔ علامہ ابن عربیؒ نے ۳۵۵ھ میں سات فرقوں کا ذکر کیا ہے:- (۱) آپوسی فرقہ جو اسکندریہ کے قیس آریوس کا مقلد تھا۔ یہ فرقہ اللہ تعالیٰ کو ہی قدیم اور ازلی وابدی مانتا تھا۔ مسیحؑ کو اللہ کا مخلوق بندہ مانتا تھا، ہاں! اس کے نزدیک مسیحؑ کلمۃ اللہ اس معنی میں تھا کہ اس کلمے کے ذریعے سے اللہ نے کائنات کو پیدا کیا۔ ایک عیسائی فاضل جیمز میکنن نے اس پر اثنا اضافہ اور کیا ہے کہ اس کے خیال میں مسیحؑ خدا نہیں تھا بلکہ ایک کامل مخلوق تھا جس میں خدا کی اور انسانیت دونوں کا کچھ حصہ موجود تھا۔ (۲) پولس مشاطی *PART OF SAMOSAT* کا فرقہ، یہ شخص انطاکیہ کا بطریق تھا جس کا مذہب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صحیح توحید کا قائل تھا اور مسیحؑ کو اس کا بندہ اور رسول مانتا تھا۔ وہ انکما تھا کہ میں کلمۃ اللہ اور روح القدس کو نہیں جانتا کہ وہ کون اور کیا ہیں۔ (۳) مقدونی فرقہ، یہ لوگ قسطنطنیہ کے بطریق مقدونیوس کے مقلد تھے۔ یہ فرقہ بھی توحید عبقری کا قائل تھا۔ اس کے نزدیک عیسیٰ مخلوق بندہ تھا۔ اور نبی مرسل تھا۔ جیسا کہ تمام دوسرے نبی بھی انسان اور رسول تھے۔ اور عیسیٰ ہی روح القدس اور کلمۃ اللہ تھا جسے اللہ نے پیدا کیا۔ (۴) جیمز تاقہ فرقہ جو شکیت کے چکر میں پڑے بغیر سیدھی بات کہتے تھے کہ اللہ مسیحؑ اور مریمؑ یحییٰ الگ الگ خدا ہیں۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ یہ فرقہ اب مٹ چکا ہے۔ (۵) ملکانیہ فرقہ، حبشہ اور توہ کے بادشاہوں اور عوام کے علاوہ بقول

ابن حنبلہ شام عیسائی بادشاہ اور عوام ملکانید فرقت سے متعلق تھے۔ یہ افریقہ، سسلی، اندلس، اور شام کے جمہور عیسائیوں کا مذہب تھا۔ ان کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ یہ تینوں الٰہی وابدی ہیں۔ عیسیٰ پورا خدا اور پورا انسان تھا۔ اس میں خدائی اور انسانیّت ایک دوسرے سے جدا نہ تھی۔ اور جسے صلیب دی گئی وہ انسان عیسیٰ تھا نہ کہ خدا عیسیٰ۔ اور مریم نے جسے جنما تھا وہ بیک وقت خدا اور انسان تھا اور وہ دونوں ایک ہی چیز تھے۔ (۵) نسٹوری فرقہ، یہ لوگ قسطنطنیہ کے بطریق مسطوریوس کی طرف منسوب ہیں۔ ان کے عقائد معمولی فرق کے ساتھ ملکانیہ سے ملتے جلتے تھے۔ اختلاف صرف اس قدر ہے کہ مریم نے خدا کو نہیں بلکہ انسان کو جنما تھا۔ اور اس میں خدائی کا حصہ خدا کا مولود تھا نہ کہ مریم کا۔ حافظ ابن حزم کے بقول یہ فرقہ موصل، عراق، فارس اور خراسان کے عیسائیوں میں اکثریت رکھتا تھا۔ (۶) یعقوبی فرقہ جو مصر اور حبشہ و نوبہ میں پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مسیح بخود خدا نہیں تھا جو سولی پر مرا اور اس کی موت کے بعد جب تک وہ دوبارہ قبر سے نہیں اٹھا تین دن یہ جہان خدا کے بغیر رہا۔ تین دن کے بعد وہ دوبارہ زندہ ہوا تو دنیا کے انعام کو بحال لیا۔ مریم کے بطن میں بخود خدا تھا۔ اور وہی اس سے پیدا ہوا۔ یہ فرقہ یعقوب برذغانی کی طرف منسوب ہوا جو قسطنطنیہ کا ایک راہب تھا۔

علامہ ابو الفتح عبدالکریم شہرستانی **ارشاد** لعل لعل والغل میں لکھا ہے کہ نصاریٰ کے بہتر فرقے ہوئے ہیں۔ جن میں سے بڑے بڑے اور مشہور فرقے تین ہیں۔ ملکانیہ، نسٹوریہ اور یعقوبیہ۔ پھر ان کے فلسفہ معلول و نجمت اور تثلیث کی شرح بیان کی ہے۔ اس شرح میں ان کا بیان ابن حزم کے بیان سے کہیں کہیں مختلف ہے۔ اختلاف کا سبب یوں سمجھ میں آتا ہے کہ نصاریٰ کے عقاید میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ انتہی کے تقیہ کے لئے مجالس کا انعقاد ہوا اور فرقہ بندی بڑھتی رہی۔ تثلیث کا عقیدہ چونکہ عیسیٰ کے بعد پیدا ہوا اور اس میں بہت کچھ فلسفہ یونان اور مشرکانہ عقاید کی آمیزش تھی، لہذا جو کسی کے جی میں آیا کہتا رہا۔ ایک ہی فرقے کے لوگ باہم اختلاف میں لگے رہے۔ ہر زمانے میں اس کی نئی نئی تعبیرات اور نئے نئے دلائل پیدا ہوتے رہے۔

ہمارے ملک کے مشہور اہل قلم عالم مولانا فی عثمانی بیچ و فاتی شرعی عدالت نے کچھ اور فرقوں کا بھی ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

پولسی فرقہ اس فرقے کے عقیدے کے مطابق مسیح خدا نہیں بلکہ فرشتہ تھے۔ جو دنیا کی اصلاح کی خاطر مریم کے بطن سے انسانی شکل میں پیدا ہوئے۔ وہ ابن اللہ اس شخصیت کی وجہ سے کہلائے۔ کہ خدا نے انہیں اپنا مخصوص جلال عطا کیا تھا۔ یہ فرقہ آرمینیا اور ایٹائے کوچک میں پایا جاتا تھا۔ مگر اس کے ماننے والے بہت کم تھے۔

آج کل دنیا بھر میں بہت سے عیسائی چرچ عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف ہیں۔ مغربی ممالک چونکہ خالصاً مادہ پرست ہو چکے ہیں لہذا اب ان میں مذہبی احساس زیادہ نہیں رہا۔ عیسائیت ایک قومی بنیاد کی حیثیت سے زندہ ہے مگر اکثر لوگ منجھ اور دہیے ہو چکے ہیں۔ جو عیسائی ہیں بھی بس برائے نام ہیں۔ سیاسی، خالص دنیوی اور مادی مسائل مذہب پر غالب آچکے ہیں۔ اس وقت تین بڑے بڑے عیسائی فرقے موجود ہیں۔ کیتھولک فرقہ پروٹسٹنٹ اور آرمقوڈکس فرقہ۔ بنیادی مسائل یعنی تثلیث و حلول اور مصلوبیت و کفارہ میں یہ لوگ بالعموم متفق ہیں۔ اختلاف صرف مرکزی اقتدار اور پوپ کے اختیارات میں ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ جو انگلستان کی طرح کئی اور ممالک کا بھی سرکاری مذہب ہے۔ پوپ کے خدائی اختیارات کو نہیں مانتا اور پسمند اور عیشائے ربانی کے سوا اور کسی مذہبی رسم کا قائل نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بت پرستی اور عیسوی و مریم کی مجسمہ سازی کے بھی خلاف ہے۔ کیتھولک فرقہ یا پائے روم کو اپنا واحد مذہبی پیشوا اور عیسوی مسیح کا شمارندہ سمجھتا ہے۔ ان کے گرجا گھروں میں عیسوی و مریم کے مجسمے اور تصویریں ہوتی ہیں۔ جنہیں جاہل عوام بت پرستوں کی مانند پوجتے ہیں۔ آرمقوڈکس فرقے کا اپنا الگ نظام ہے۔ ان کا سب سے بڑا دینی پیشوا بطریق کہلاتا ہے۔ اور ان کا مرکز قسطنطنیہ ہے۔ تثلیث کے عقیدے کی تفصیل میں ان کا کیتھولک فرقے سے یہ اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک روح القدس کا اتنوم صرف باپ (خدا) کے اتنوم سے نکلا ہے۔ اور بیٹا اس عمل میں محض ایک واسطہ ہے۔ کیتھولک فرقے کے نزدیک روح القدس کا اتنوم باپ اور بیٹے دونوں سے نکلا ہے۔ علاوہ انہیں آرمقوڈکس کے نزدیک بیٹا رتبے میں باپ سے کم ہے مگر کیتھولک کے نزدیک دونوں برابر لحاظ سے اور ہر صفت میں برابر ہیں۔ آرمقوڈکس فرقہ نیقہ کی کونسل کے فیصلے کو مانتا ہے مگر اس کے نزدیک اس کی عبادت میں کیتھولک چرچ نے اپنی مرضی سے اضافہ کر لیا تھا۔

مسیحی رسوم عبادت عیسائیوں کے نزدیک اصول عبادت چار ہیں (۱) عبادت اُس قربانی کا شکل ہے جو مسیح نے سولی پر چڑھ کر بندوں کے گناہ معاف کرانے کی خاطر دی تھی۔ (۲) صحیح عبادت صرف روح القدس کے عمل سے ہو سکتی ہے۔

(۳) عبادت ایک اجتماعی فعل ہے جو کلیسا ہی انجام دے سکتا ہے۔ بوقت ضرورت کلیسا کا رکن انفرادی عبادت بھی کر سکتا ہے۔ (۴) عبادت کلیسا کا بنیادی کام ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ ”مسیح کا بدن“ بن کر دنیا کے سامنے پیش ہوتا ہے۔

۱۔ اگر جاگھروں میں جمع ہو کر زکوٰۃ کے حدیث بچھون گانا، گانے کے دوران حاضرین عبادات | کھڑے رہتے ہیں اور اختتام پر گھٹے ٹھیک کر دعا کرتے ہیں۔ (۲) بپتسمہ (اصطبلغ) جو برائے عیسائی ہونے والے کو دیا جاتا ہے۔ اور اس کے بغیر کوئی شخص عیسائی نہیں بن سکتا۔ عیسائیوں کے عقیدے میں بپتسمہ کے غسل سے انسان مر کر دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔ اس غسل سے پہلے عیسائیت میں دخول کے امیدوار کو ایک عبوری دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ عیسائی تعلیمات سیکھتا ہے۔ اور بپتسمہ پانے تک عیسائی نہیں بلکہ کیٹ چوٹن کہلاتا ہے۔ وہ بپتسمہ سے پہلے عشا کے ربانی کی رسم میں شامل نہیں ہو سکتا۔ ایلیٹ یا پینٹی کو سٹ کی عید سے کچھ پہلے اسے بپتسمہ دیا جاتا ہے۔

بپتسمہ دینے والے مخصوص لوگ ایک مخصوص کمرہ میں یہ کام انجام دیتے ہیں۔ اس کمرے میں امیدوار کو مغرب کی طرف منہ کر کے لٹا دیتے ہیں۔ وہ مغرب کی طرف ہاتھ پھیل کر کہتا ہے اے شیطان میں تجھ سے اور تیرے ہر عمل سے دستبردار ہوتا ہوں۔ پھر وہ مشرق کی طرف منہ کر کے زبان سے عیسائی عقاید کا اعلان کرتا ہے۔ بعد ازاں اسے ایک اندرونی کمرے میں لے جا کر ایک خاص قسم کے دم کئے تیل کی مالش کپڑے اتروا کر تمام بدن پر کرتے ہیں۔ اور پھر بپتسمہ کے حوض میں ڈال دیتے ہیں۔ اس موقع پر بپتسمہ دینے والے اس سے تین مرتبہ پوچھتے ہیں کہ کیا وہ باپ بیٹے اور روح القدس پر مقررہ تفصیل کے مطابق ایمان رکھتا ہے۔ ہر بار وہ جواب دیتا ہے کہ ہاں میں ایمان رکھتا ہوں۔ اس کے بعد اسے حوض سے نکال کر پیشانی، کان، ناک، اور سینے پر دم کئے ہوئے تیل کی دوبارہ مالش کرتے ہیں۔ بعد میں اسے سفید لباس پہنا دیتے ہیں۔ گریبا اب وہ گناہوں سے پاک صاف ہو گیا ہے۔ اس طرح بپتسمہ پانے والوں کو جلوس کی شکل میں گرجے میں لے جاتے ہیں۔ اور عشا کے ربانی میں شامل کرتے ہیں۔

ج۔ عشا کے ربانی | یہ رسم عبادت بقول عیسائی حضرات جناب مسیح کی قربانی کی یاد دہانی میں منائی جاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ انوار کو گرجا گھر میں رکھا جائے اور غیر کے بعد حاضرین ایک دوسرے کا ہوس لے کر انہیں مبارکباد دیتے ہیں۔ پھر روٹی اور شراب لائی جاتی ہے۔ پادری باپ، بیٹے اور روح القدس سے برکت کی دعا کرتا ہے اور سب لوگ آمین کہتے ہیں پھر یہ شراب اور روٹی سب میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ کہ وہ اسے کھا پی کر مسیح کے کفار سے کا عقیقہ تازہ کریں۔ یہ روٹی مسیح کے بدن میں اور شراب اس کے خون میں تبدیل ہو جاتی ہے

(معاذ اللہ منہ) انجیل متی میں ہے کہ حضرت مسیحؑ نے گرفتاری سے ایک دن قبل حواریوں کے ساتھ رات کا کھانا کھایا: ”جب وہ کھا رہے تھے تو یسوع مسیح نے روٹی لی اور برکت دے کر توڑی اور شاگردوں کو دے کر کھا لو کھاؤ یہ میرا بدن ہے۔ پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور ان کو دے کر کہا تم سب اس میں سے پئے کیونکہ یہ میرا وہ عہد کا خون ہے جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی معافی کے واسطے بہایا جاتا ہے“ (متی ۲۶) لوقا نے یہ الفاظ اور بڑھائے ہیں کہ ”میری یادگاری کے لئے بھی کیا کرو“ (لوقا ۲۲)

پروٹسٹنٹ فرقہ کے نزدیک روٹی اور شراب مسیح کے بدن اور خون میں تبدیل نہیں ہوتی (گویا یہ مسیح کا معنی ایک عباد راقی کلام تھا!) صرف یہ مسیح کے کفارے کی یادگار ہے۔ دوسرے عیسائی۔ مثلاً کیتھولک فرقہ۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ روٹی اور شراب واقعی مسیح کا بدن اور خون ہو جاتی ہے۔

یہاں تک بیان شدہ عبادتیں عیسائیوں میں متفق علیہ ہیں۔ پانچ رسمیں اور ہیں جنہیں کیتھولک عیسائی ادا کرتے ہیں۔ اور پروٹسٹنٹ من گھڑت اور جھوٹ سمجھتے ہیں۔

اتوار کا دن عیسائی حضرات اتوار کو مقدس جانتے اور اس دن گرجاؤں میں عبادت تیمو مار کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ دراصل یہ دن یونانی مشرکوں کے ہاں سورج دیوتا کی پوجا کے لئے مقرر تھا۔ جیسا کہ اس کے نام SUNDAY سے ظاہر ہے۔ ہندوؤں میں بھی ایت وار سورج دیوتا کا دن تھا۔ بہر صورت مشرکوں کو خوش کرنے کی خاطر یہ دن مقرر کیا گیا تاکہ وہ عیسائیت کو بیگانہ چیز جان کر بدک نہ جائیں۔

ب۔ کرسمس ۲۵ دسمبر کو یوم میلاد مسیح مناتے ہیں۔ یہ دن بھی دراصل رومی مشرکوں کے ایک دیوتا کی یادگار تھا۔ انہیں خوش کرنے کی خاطر اس دن کو یوم میلاد مسیح منایا گیا حالانکہ مسیح موسم گرما میں پیدا ہوئے تھے۔ انجیل میں لکھا ہے کہ مریم نے بچہ کو جن کی چھتری میں ڈال دیا۔ اگر یہ دسمبر کا مہینہ ہوتا تو نہ مریم باہر جاسکتی نہ بچے کو چھتری میں ڈالا جاسکتا تھا۔

ج۔ ایسٹر یہ دن عیسائی کے مرکز دوبارہ زندہ ہونے کی یاد میں ۲۱ مارچ کو مناتے ہیں۔ اور بھی ایرانیوں کا عید نوروز تھا جنہندوؤں کی بنست اور آریکینڈ والوں کے ہاں موسم بہار کی دیوی آسٹو کی پرستش کا دن تھا۔ نام بدل کر ایسٹر بنالیا گیا۔ اور اسے اپنا لیا گیا۔ یہ دیوی بقل دیوتا کی بیوی عسارات ہے جس کی یہودیوں نے بھی پوجا کیا اور انبیاء نے انہیں اس پر موعون کیا تھا۔ اس کا ذکر یہودی مذہب کے بیان میں گزر چکا ہے۔

اسلام

تعریف لفظ اسلام کا مادہ سلم ہے جس کا معنی ہے صلح و سلامتی، پس اسلام کا معنی ہوا: صلح و سلامتی اور امن و آشتی کو پھیلانا، اللہ کے احکام کے آگے گردن جھکانا، حق و صداقت کو تسلیم کر کے اپنے آپ کو خالق و معبود کی ناراضگی سے بچانا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین برحق صرف اسلام ہے۔

اِنَّ الْيَدَيْنِ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ
جو کوئی بھی اسے چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے گا۔ وہ دنیا و آخرت میں خائب و خاسر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اسلام کے سوا اور کسی دین کو ہرگز اس سے قبول نہ کرے گا: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ
تمام انبیاء و رسل اسلام کے داعی تھے۔ اُن کی امتوں نے اپنا نام مسلم کے سوا کچھ اور رکھا تو پیغمبروں کے بعد اور ان کی تعلیم سے ہٹ کر رکھا تھا۔ ابراہیم اور ان کی ذریت کی دونوں شاخیں "حنیف" (موجد) تھیں۔ انبیائے بنی اسرائیل نے اسحاقؑ و یعقوبؑ سے لے کر موسیٰؑ و عیسیٰؑ تک اسلام ہی پیش کیا تھا۔ آخری بنی اسلام کو ہر قسم کی آمیزش سے جدا کر کے اور اُس کی تکمیل کر کے آخری دین کے طور پر دنیا میں پیش کرنے کے لئے آئے تھے۔
اَللّٰهُمَّ اكْمِلْ لَكَوَدِيْنَكَوَاَتْمِمْ لِعَلِيْكَوَدِيْنَكَوَدِيْنِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

اُپ کی تشریف آوری سے قبل دنیا والے اسلام کے سبب کو مجھل چکے تھے۔ آپ اسی دین حق کو سرفراز کرنے اور ظاہری و باطنی لحاظ سے اسے غالب کرنے کو مبعوث ہوئے تھے۔
هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَنَا بِالْحَقِّ وَدِيْنُ الْحَقِّ يُظهِرُہٗ عَلٰی الدِّيْنِ كُلِّہٖ
(التوبہ، الفتح)

اسلام کا پس منظر صحرائے عرب سے آفتاب اسلام کے طلوع سے قبل دنیا والے شرک و کفر کی دلدل میں گھس چکے تھے۔ یورپ اور روم و یونان تفتیش و محول کے گرداب میں چکر کھا رہے تھے۔ ایران و عراق اور ایشیائے کوچک میں آتش پرستی کا جلن تھا۔ ہندوستان میں کروڑوں فرضی دیوتاؤں کے بت بچ رہے تھے۔ مشرقی اڈی کے ممالک چین و جاپان وغیرہ شجر و حجر اور ارواح عجیبہ کے پجاری تھے۔

عرب کا تو حال ہی بڑا ہتر تھا۔ جتنے قبیلے اتنے مذہب اور ان سے بھی زیادہ خدا۔ پتھروں، جانوروں، درختوں، سسوج چاندستاروں کی پوجا ہوتی تھی۔ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے تھے۔ شرک و بت پرستی کی نئی صورتیں ایجاد ہوئیں، اللہ کے گھر کعبہ کو بت خانہ بنا دیا گیا تھا۔ ان کی بت پرستی کی داستانیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے۔ لیکن انسان ضعیف الاعتقادی میں یہاں تک بھی جاسکتا ہے! ایک پتھر کو پونچھ پانچھ کر صاف کر لیا اور سامان سفر میں ساتھ رکھ لیا۔ اُسے پوچھتے رہے اور جب اس سے زیادہ صاف اور خوبصورت پتھر مل گیا تو پہلا پھینک کر دوسرے کو خدا بنا لیا۔ چوہا بنانے کی ضرورت پیش آئی تو اُسی خدا کو چلے میں استعمال کر لیا۔ کھانا پاک گیا تو پھر پتھر کو صاف کر کے خدا بنا لیا۔ پتھر ملا تو ریت کی ڈھیری پر بکری کا دودھ ڈھ کر اُسے ذرا سخت بنا لیا اور اُس کی پوجا کر لی، پانی یا دودھ نہ ملا تو ڈھیری پر پیشاب کر کے اُسے ذرا سخت کر لیا اور خدا بنا کر پوج ڈالا۔ قسمت معلوم کرنے، قریب اندازہ لگانے یا کوئی اہم کام کرنے سے پہلے بتوں سے مشورہ لینے کے لئے تیر بنا کر بتوں کے ہاتھوں میں دے دے رکھتے تھے۔ ضرورت مند شخص پجاری کو نذر دے کر فال نکھوتا۔ تیروں پر ہاں یا نہیں لکھا ہوتا۔ جس قسم کا تیر نکلتا اسی کے مطابق عمل درآمد کرتے۔ وہم و خرافات اور بھوت پریت پر ایمان یہاں تک تھا کہ آج کا عقل مند انسان انہیں پڑھنے کے بعد شاید ہنسی کو ضبط نہ کر سکے۔ عجیب و غریب خرافاتی چیزوں پر ایمان تھا۔ پرنسے اڑا کر خیر یا شر کا فیصلہ کرتے تھے۔ اوروں خبیثہ اور بھوت پریت کی بنیاد لینا، انہیں مدد کے لئے پکارنا، جنوں کی دہائی دینا دن رات کا شغل تھا۔ یہ صحرائی لوگ جو علم و فن اور تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے، جہالت کی آخری سرحد کو چھو چکے تھے۔ قتل و غارت روز کا مشغلہ تھا۔ جوا بازی اور شراب خوری لازمہ سعادت و شرافت بن چکے تھے۔ اپنے تجارتی سفروں میں دوسرے ممالک میں جو نئی شریکہ رسوم دیکھتے انہیں اپنے ہاں رائج کر کے قابل فخر جانتے تھے۔ عورتوں پر ظلم و ستم ہوتا تھا۔ تقدیر انواج کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ لڑکی کی پیدائش کو باعث شرم و بدنامی جانتے اور لوگوں سے چھپتے پھرتے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے؟ بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج بھی تھا۔ بعض دنوں، جنگوں، مکالوں یا جانوروں وغیرہ کو بلا سبب منحوس جانتے تھے۔ انہی اور اس قسم کی بے شمار مذہبی و معاشری برائیوں کے باعث یہ دور جاہلیت کا زمانہ کہلا یا۔

سیاسی طور پر یہ لوگ اتنے پسماندہ تھے کہ ساری شجاعت و جرأت خانہ جنگی میں

صرف کرتے تھے۔ کوئی مگر کوئی نظام موجود نہ تھا۔ قبائلی زندگی تھی۔ ہر قبیلے کا اپنا سردار اور اپنا نظام ہوتا تھا۔ البتہ صحرائی زندگی کے باعث اپنے غلبہ کردہ سردار کے سوا کسی کو صاحب اقتدار نہ جانتے تھے۔ جمہوریت کی روح ان میں ضرور زندہ تھی۔ انہوں نے کسی بیرونی اقتدار کو کبھی پسند نہیں کیا۔ باہر کے بادشاہوں کو بھی شاید ان باورئے نشینوں پر حکومت کرنا کچھ زیادہ نفع مند نظر نہ آتا تھا۔ لہذا انہیں ان کے حال پر چھوڑے رکھنے تھے۔ چند شہروں اور قبضات کے سوا عام زندگی بدویانہ اور خانہ بدوشی کی تھی۔ زراعت بہت کم تھی۔ لوگوں کا پیشہ بالعموم تجارت تھا۔ میدانی اور پہوار علاقوں میں البتہ کچھ سرسبزی اور شادابی بھی تھی۔ طاقت کا علاقہ سرسبز تھا۔ اور یثرب والوں کا پیشہ زراعت تھا۔ ساحلی علاقوں میں ادھر ادھر چھوٹی چھوٹی سلطنتیں بھی تھیں جو روم یا ایران کی بادشاہتوں کے زیر اثر تھیں۔

عرب کے جنوبی علاقے میں ہیں شاہ حبشہ کی سرپرستی میں ایک عیسائی سلطنت قائم تھی جس کے سربراہ ابراہم نے حضور کی پیدائش کے سال مکہ پر سامعہ ہزار فوج کے ساتھ۔ جس میں نوے ہاتھی بھی تھے۔ چڑھائی کی تھی تاکہ بیت اللہ کو مسمار کر دے اور عربوں کی توجہ اس سے ہٹا کر یمن کے ایک لوجہ کنیسہ کی طرف پھیر دے۔ بخران میں بھی ایک عیسائی سلطنت قائم تھی۔ اور لسی قسم کا ایک کلیسا وہاں بھی بنایا گیا تھا۔ عرب بیت پرست ہونے کے باوجود اپنے موروثی ابراہیمی مرکز کعبہ کو چھوڑنے پر بالکل آمادہ نہ تھے۔ اس کی بدولت انہیں بے شمار سیاسی و معاشی فوائد بھی حاصل تھے۔ جن پر ان کی زندگی کا دارومدار تھا۔

ولادت نبوی سے بعثت تک | حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مکہ میں قبیلہ قحطان کے محرز ترین خاندان بنو ہاشم میں ۹ ربیع الاول

کو بروز منیہ بوقت صبح صادق مطابق ۲۳ اپریل ۵۷۰ء ہوئی۔ اس سے کچھ دن — ۵۰ دن — قبل امیاب القیل کا واقعہ پیش آچکا تھا۔ جس کے نتیجے میں ہزارگان قریش نے آپ کے دادا عبدالمطلب کی سربراہی میں کعبۃ اللہ کے پرے پڑ کر وہ مشہور دعا کی تھی جسے ابن ہشام نے سیرت میں نقل کیا ہے:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْعَبْدُ يَمْنَعُ دَحْلًا فَا مَنَعُ دَحَالًا

و اے اللہ زندہ اپنے ڈیرے کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے گھر کا خود دفاع کر،

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کا دفاع کیا۔ کئی سال تک مکہ میں بتوں کی پرستش کا سلسلہ موقوف رہا اور صرف خدا کے واحد کی پرستش ہوتی تھی۔ یہ اس بات کی تمہید تھی

کہ بت پرستی اور شرک کو ترک کرنے والا دنیا میں تشریف لا چکا۔ اس کا استقبال اس طرح ہونا چاہیے کہ خدامتے واحد کی عبادت کے ذریعے بلند ہوں اور بت سرنگوں کو جائیں۔ چند دن تک آپ نے اپنی والدہ ماجدہ آمنہ کے علاوہ اپنی کھلائی اُمّ امین اور ابو لہب کو لڑکھی تو یہی کا دودھ پیا۔ پھر اہل مکہ کے شرفاء کے رواج کے مطابق قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ بنو سعد کی ایک خاتون خلیمہ نے آپ کی رضاعت کی ذمہ داری لے لی۔ آپ پیدائشی یتیم تھے۔ والدہ خیرم آپ کی ولادت سے چار یا پنج ماہ قبل فوت ہو چکے تھے۔ اسی لئے آپ کی پرورش عبدالمطلب — آپ کے دادا — کی زیر نگرانی ہوئی۔ کم و بیش ۵ سال کی عمر تک آپ بنو سعد میں رہے پھر مکہ لائے گئے۔ مگر اس کے بعد جلد ہی ہی آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور آپ سر اسر عبدالمطلب کی گود میں آ گئے۔ ۸ سال کی عمر میں دادا فوت ہوئے تو پرورش کا ذمہ ابو طالب — آپ کے چچا — نے لیا۔ اپنی کے ساتھ آپ نے آبائی کاروبار تجارت میں حصہ لیا اور جوان ہو کر آزادانہ بھی کاروبار کرتے رہے۔ کاروبار سلسلے میں آپ نے شام، یمن اور بحرین کے علاقوں کا سفر کیا۔ مکہ بلکہ سارے عرب میں پھرتے لیکن کسی کو کوئی رواج نہ تھا۔ آپ بھی اُمتی — ان پرچہ — تھے۔ مکہ کی ایک رئیس خاتون خدیجہ غطف لوگوں کے ساتھ شراکت کا کاروبار کیا کرتی تھیں۔ آپ کے صدق و امانت کی شہرت سن کر اس نے آپ کو شراکت کی دعوت دی جسے آپ نے قبول فرمایا اور یہی کاروبار آخر کار رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے کا باعث بن گیا۔ آپ کی عمر اس وقت ۲۵ سال اور خدیجہ کی عمر چالیس برس تھی۔ آپ کی ساری اولاد — دو بیٹے اور چار بیٹیاں — انہی کے بطن سے تھیں، صرف ابراہیم مستثنیٰ ہیں جو مادرِ قبیلہ کے بطن سے مدینہ میں پیدا ہوئے۔ خدیجہ اور فاطمہ زہرا زیدہ رہیں۔

آپ کا بچپن، بزرگی اور جوانی نہایت پاکیزہ تھی۔ عوام، خواص میں صادق و امین کے لقب سے مشہور تھے۔ شروع سے ہی بت پرستی، شراب نوشی اور ہر قسم کی برائی سے نفور تھے۔ میلیون عقیلوں، ناچ رنگ کی مخلوق اور لہو و لب کے مشاغل سے اجتناب کرتے تھے۔ اچھائی کے انفرادی و اجتماعی کاموں میں لگے رہتے تھے۔ قوم کے بڑے لوگ آپ کو اہم معاملات میں مشورہ کیے لئے شریک رکھتے اور آپ کی اصابت رائے پر لوگوں کو اعتماد تھا۔ چالیس برس کی عمر تک پہنچے ہوئے آپ تنہائی پسند ہو گئے اور غاروں میں اکیلے بیٹھ کر غور و فکر کیا کرتے تھے۔ مکہ کے مشہور پہاڑ حرام کی ایک تنگ و تاریک

غارِ آپ کی تنہائیوں کا مرکز تھی۔ آخر ۱۸ رمضان کو اسی غارِ حرا میں پہلی وحی یعنی سورہ اقرار کی پانچ پہلی آیتیں نازل ہوئیں:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ ۝ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ
پھر اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو جسے ہونے سے پیدا کیا۔ پڑھا اور پڑھا
رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ساتھ تعلیم دی۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا
نہ تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ فرشتہ آپ کے روبرو ہو کر یہ پیغام دے گیا تھا۔ اس سے قبل سچے خواب تو آپ کو دکھائی دیتے تھے۔ لیکن یہ غارِ حرا والا تجربہ بالکل نیا تھا۔ بتقاضائے بشوئیت اس منفرد واقعہ سے آپ کا گہرا نا لازم تھا۔ چنانچہ آپ لرزتے کانپتے گھبرہٹے۔ خود بخود نئے تسلی دی اور اپنے چچا زاد بھائی و زرقہ بن نوفل سے آپ کو طویا۔ اُس نے واقعہ سن کر آپ کی نبوت و رسالت کی شہادت دی اور خدا کے کام میں مدد و نصرت کا بیجختہ وعدہ کیا، مگر افسوس و زرقہ کا بہت جلد انتقال ہو گیا۔

حضور کی ملی زندگی پہلی وحی کے بعد پیغامِ الہی کا سلسلہ کچھ دیر تک منقطع رہا شاید اس لئے کہ یہ سبق اچھی طرح اذہر ہو جائے۔ تو پھر اگلا سبق دیا جانا مناسب سمجھا گیا، یا شاید اس لئے کہ آپ آہستہ آہستہ خدائی پیغام سے مانوس ہو کر آنے والے احوالِ ظرفیت کے لئے پوری طرح تیار ہو جائیں۔ اس ارضانی مہین سال کے وقفے میں آپ کو جب کبھی نظر آئے اور تسلی دیتے کہ: ”اے محمد! آپ اللہ کے برحق رسول ہیں“ شجر و حجر سے رسالت کی گواہی ملتی رہی۔ آخر دوسری وحی آئی:

لَا تَتَّبِعِ الْاُمِّيَّةَ ۚ قَدْ فَازَنُودَ ۝ وَ رَبُّكَ فَكَتَرُ ۝ وَلَا تَتَّبِعْ فِطْرَةَ الْاُمِّيَّةِ
اسے کیل اور تھ کر سوتے والے! اٹھ اور ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر اور اپنے
کپڑے صاف کر، پہلی وحی میں اگر اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اللہ تعالیٰ اگر قلم عیسیٰ بے جان
چیز کو ذریعہ تعلیم بنا سکتا ہے۔ تو ایک اُمی کو قاری و عالم کیوں نہیں بنا سکتا؟ تو اس
دوسری وحی میں آپ کو کمرِ محبت باندھ کر فریضہ انداز ادا کرنے، اللہ تعالیٰ کی عظمت و
مجسّم کر واضح کرنے اور ظاہری و باطنی طہارت و نظافت کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ
نے باہر الہی اللہ کا پیغام چپکے چپکے اپنے اعزہ و اقربا اور دوستوں کو سنا نا شروع
کیا۔ خواہن میں سے خود بچہ، بالغ آزاد مردوں میں سے ابو بکر صدیق، بچوں میں سے علی

اور غلاموں میں سے زبید بن حارثہ نے سب سے پہلے لبیک کہا۔ اس کے بعد رشتہ داروں کو کھلی تبلیغ کا حکم ملا اور آپ نے انہیں دعوت دے کر پیام حق سنایا، مگر لوگ ہنستے اور مزاح کرتے ہوئے اٹھ گئے۔

پھر تبلیغ عام کا حکم ہوا اور آپ نے پہاڑ پر چڑھ کر سب قبائل کو نام بنام پکار کر بلایا۔ لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے پہلے ان سے اپنے صادق و امین ہونے کا برملا اعتراف کرایا اور پھر توحید الہی کا پیغام پہنچایا۔ اشاعت اسلام کی رفتار بہت سست تھی، مگر جو لوگ آئے وہ پھر ہمیشہ کے لئے اسلام کی خاطر وقف ہو جاتے۔ عوام کے لئے آبائی دین اور شرکیہ رسوم ترک کرنا شاق تھا۔ خواص کو اس پیغام میں مساوات انسانی کا سبق دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ وہ کجۃ اللہ کے عباد رہنے کے باعث آل اللہ کہلاتے تھے۔ دور و نزدیک ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ ریاست و حکومت کی گدیوں چھوڑنا انہیں مشکل نظر آتا تھا۔ چند ایک کو چھوڑ کر ایمان لانے میں سبقت کرنے والے بالعموم غلام، باہر سے آکر مکہ میں بسے ہوئے لوگ اور ”عوامی طبقوں“ سے تعلق رکھنے والے افراد تھے۔ جو جن مسلمانوں کی تہ لوہ طبعی رہی قریش کی مزاحمت و مخالفت بھی ترقی کرتی گئی۔ فوجیت یہاں تک پہنچی کہ مخالفت نے عداوت اور شدید اجتماعی مزاحمت کا رنگ اختیار کر لیا۔ لوگ اپنے آبائی عقائد اور عبادات، و رسوم کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ رعیتیں اور سیاسی مراعات یافتہ طبقہ اس نئی آواز میں اپنی نفی تصور کرتا تھا۔ پہلے لوگ انفرادی طور پر مخالفت کرتے تھے پھر یہ مخالفت جماعتی رنگ اختیار کر گئی اور آباؤ اجداد کے طور طریقے کو بچانے کی خاطر ان کی عزت و ناموس اور بزرگی کے واسطے دیتے جانے لگے۔ تمام قبائل نے اپنے اپنے نو مسلموں کو ستانا اور اسلام سے پھرنے کی کوشش کرنا اپنا فریضہ قرار دے لیا۔ دین کی آواز دھیرے دھیرے اذہان و قلوب کو فتح کرتی رہی۔ عمر بن الخطاب عدوی اور حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کے اسلام لانے سے اہل اسلام کو تقویت ملی تو کفار تملاک رہ گئے۔ جہاں اور جس پر بس چلتا، مسلمانوں کو تندیب کا نشانہ بناتے۔ حضورؐ کے شکایت ہوتی تو آپؐ نے صبر و تحمل کی تلقین کے ساتھ ملک حبش کو ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ مسلمان چپکے چپکے حبشہ کو جانے لگے۔ کفار نے راستہ روکا مگر ہجرت کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ شاہ حبشہ نجاشی کو قریشی سفارت نے مسلمانوں کو واپس کرنے پر آمادہ کرنا چاہا مگر ناکام رہی اور اٹھا شاہ حبشہ خود مسلمان ہو گیا۔ اس واقعہ سے قریشی عداوت اور

میں بڑے اور انہوں نے مسلمانوں کو ناقابل تصور ذیہنس پہنچا دیں۔ کسی کو پانی میں ڈبوایا کسی کو گرم کوکوں پر لٹا دیا کسی کو در سرکش ڈھکوں سے باندھ کر چیر ڈالا، بعض کو دور رخسوں کے تنوں سے باندھ کر چھوڑ دیا کہ جسم کس جہے اور اسی حالت میں وفات پزیر ہو سکے۔ مسلمانوں کا بائیکاٹ ہوا۔ خاندان نبوی باشم سے قطع نفاق کیا گیا اور حضور چند مسلمانوں اور بنو ہاشم سمیت ایک گھاٹی میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

نبوت کے یہ اوصاف سال حضرت حدیجہ کی وفات ہو گئی۔ حضور پر بظاہر اور دواہیں آپڑیں اور بچوں کے باعث شدید پریشانی کا سامنا ہوا۔ اسی سال آپ کے چچا اور خاندان کے سربراہ ابوطالب کی وفات ہو گئی۔ جو آپ کا دفاع کیا کرتے تھے۔ یہ واقعہ مزید پریشانی کا باعث بنا۔ اسی سال معراج کا واقعہ پیش آیا۔ اہل مکہ سے مایوس ہو کر حضور نے گھوم پھر کر قبائل عرب سے تعاون حاصل کرنے اور انہیں اسلام لانے کی ترغیب دینے کا کام شروع فرمایا۔ سب قبائل نے ایمان لانے یا تعاون و نصرت کرنے سے انکار کیا۔ طائف میں تشریف لے گئے تو وہ لوگ سخت بدسلوکی سے بلکہ بدقیمری سے پیش آئے۔

اسی کوششیں میں اس سال حج پر آنے والے قبائل سے ملے اور اللہ کی رسالت پہنچانا شروع فرمایا۔ مدینہ کے چند اشخاص نے جو آئے تو اہل مکہ سے ایک مشورے کے لئے گئے، اسلام قبول کر لیا۔ اور یوں اسلام کی آواز مکہ سے باہر دور تک جا پہنچی۔ ان لوگوں کی تلقین و تبلیغ سے مدنی قبائل اوس و خزیم کے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے اور آئندہ سال موسم حج میں سو کے قریب انصار مدینہ جمع کرنے اور آپ سے بیعت ہونے کو حاضر ہوئے۔ ان لوگوں نے آپ کو اپنے ہاں چلے آنے اور ہر قسم کی نصرت و امداد کرنے کا وعدہ کیا۔ آپ نے حکم خداوندی کے انتظار کا عذر کیا اور اپنے اصحاب کو اکاؤ کا ہجرت کا حکم دیا۔ یوں ہجرت مدینہ کا آغاز ہوا۔ جب مکہ میں سوائے عورتوں، بچوں اور ضعیف و معذور مسلمانوں کے سوا اور کوئی نہ رہا تو آپ نے بھی محبتت یا رِغار ابو بکر صدیق ہجرت فرمائی۔

ہجرت مدینہ کے بعد کا دور رسالت مدنی دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں مدنی زندگی اسلامی عقائد کی بعض تفصیل نازل ہوئی۔ (اصل عقائد اور کچھ اخلاقی تعلیمات کا نزول مکہ میں ہو چکا تھا) یہ دور اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں اسلام کو ایک اپنا وطن، اپنی سلطنت و حکومت اور اپنا خالص اسلامی معاشرہ پیش کیا۔ اس دور میں عبادات کے علاوہ معاشرتی، معاشی، اخلاقی، سیاسی اور صلح و جنگ کے احکام نازل ہوئے۔ مکہ میں مشرکین کی حکومت تھی لیکن دشمن صرف انہی

مکہ محدود تھے، مدینہ میں ان کے علاوہ اہل کتاب اور منافقین سے بھی معاملہ پیش آیا۔ جنگ بدر سے تنوگ تک کا ایک طویل سلسلہ غزوات پیش آیا۔ مشرکین مکہ نے یہود مدینہ اور منافقین کے ساتھ ساز باز کر کے بار بار اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو جہنم نہیں کرنے کی کوششیں کیں۔ جنگ بدر میں ۳۱۳ غیر مسلح مسلمانوں کو ایک ہزار سے زائد مسلح کفار پر پہلی مرتبہ میدان جنگ میں فتح حاصل ہوئی۔ اور اسلام کی دھماک ہر طرف بیٹھ گئی۔ جنگ احد میں پہلے پہل کفار کو شکست ہوئی مگر چند مسلمانوں کی غفلت اور عجلت کے باعث کفار کے دوبارہ اچانک حملے کے باعث کافی نقصان ہوا۔ جنگ خندق میں قبائل عرب کی متحدہ قوت مدینہ پر چڑھ آئی مگر آخر کار محاصرہ اٹھا کر ناکام واپس لوٹی۔ صلح میں حدیبیہ کا صلح نامہ مرتب ہوا جس میں پہلی مرتبہ کفار مکہ نے مسلمانوں کو ایک فریق مقابل تسلیم کر کے ان سے دس سالہ معاہدہ صلح کیا۔ اگلے سال جنگ خیبر ہوئی۔ اور یہودی قوت منتشر و مفتوح ہو گئی۔ اس سے پہلے یہ لوگ مدینہ میں بار بار عہد شکنی کر چکے تھے۔ دو قبائل بنو قینقاع اور بنو نضیر خیبر میں جلا وطن ہوئے تھے۔ اور تیسرا قبیلہ بنو قریظ اپنے مقرر کردہ ثالث کے فیصلے کے مطابق قتل اور غلامی کی سزا برداشت کر چکا تھا۔ صلح میں کفار مکہ کی عہد شکنی کے نتیجے میں حضورؐ نے مکہ پر فوج کشی کی اور خون خرابے کے بغیر مکہ کو فتح کر لیا۔ اگلے سال رومیوں نے بے سبب حدود عرب کو بار کیا اور مقابلے کے لئے حضورؐ کو خود ایک لشکر ہمار سمیت حدود ختم تک پہنچے۔ مگر رومی پیچھے ہٹ گئے۔ اور یہ علاقہ جنگ کے بغیر مفتوح ہو گیا۔ اسی سال حج فرض ہوا اور حضورؐ نے پانچ مسلمانوں کو ابو بکر صدیقؓ کی امارت میں حج کے لئے روانہ فرمایا۔ اگلے سال آپؐ خود حج پر تشریف لے گئے۔ اور سوالا لکھ مسلمانوں سمیت ارکان حج ادا فرمائے۔ اسی موقع پر میدان عرفات میں خطبہ نبویؐ کے بعد تکمیل دین کی بشارت نازل ہوئی۔

اَيُّوَهَا كُفَرَاكُمُ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَ اَيُّوَهَا اَشْكُمُ عَلَيْنَكُمْ دِيْنُكُمْ وَ اَيُّوَهَا اَسْلَامُ دِيْنَا (المائدہ) آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اللہ تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین پسند کیا؟

صلح حدیبیہ کے بعد سکون و اطمینان کا ایک وقفہ ملا تھا۔ جس میں حضورؐ نے وقت کے بادشاہوں اور سلطنتوں کے سربراہوں کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے۔ شاہ ایران نے نامہ مبارک کو چاک کر دیا اور گستاخانہ کلمات زبان پر لایا۔ آپؐ کو اطلاع ملی تو فرمایا کہ اس نے اپنی سلطنت کو چڑے چڑے کر ڈالا ہے۔ (چنانچہ عہد خلافت فاروقی میں

یہ بیس گویا حرفِ بحرف پوری سہولت اور عہدِ عثمانی میں شاہِ ایران اپنی سلطنت سے باہر کابل کی حدوں میں بحالتِ جلا وطنی مارا گیا، شاہِ روم ایمان تو نہ لایا مگر حضور کی نبوت کی تصدیق کی۔ شاہِ مقرر نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور تحفے روانہ کئے۔

آخری حج کے بعد ۱۲ ربیع الاول ۱۱۰۰ھ کو بروز سوم بوقتِ جاہشت آپ نے ایک مختصر علالت کے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

اسلامی تعلیمات ۱۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتی و صفاتی توحید کا عقیدہ جو خاصائصِ اسلام میں سے ہے۔ اسلام کے سوا دوسرے موجودہ ادیان و مذاہب میں یہ عقیدہ انہی وقتِ احت و صراحت کے ساتھ نہیں ملتا۔ جب۔ رسالتِ نبی اللہ کے سب انبیاء و رسل پر از آدم تا محمد رسول اللہ خاتم النبیین ان کی صداقت و عصمت سمجھتے ایمان لانا۔ جن کا نام کتاب و سنت میں آجکا ہے۔ ان پر نام پر نام تفصیلی ایمان لانا اور باقی پر اجمالی ایمان رکھنا۔ ۲۔ کتبِ الہیہ جو انبیاء و رسل پر نازل ہوئیں ان کی صداقت اور اپنے اپنے اوقات میں واجب العمل ہونے پر ایمان لانا۔ ۳۔ ملائکہ اللہ پر ایمان لانا کہ وہ خدائی مسنن کے خادم اور کارکن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض ان کے ذمہ کئے ہیں۔ مثلاً وحی لانا جبریل کے سپرد کیا۔ وہ بے چون و چرا بلا کم و کاست انجام دیتے ہیں۔ وہ تذکیر و تانیث اور افروختن و نسل و تولید سے ممتاز ہیں۔ ۴۔ یومِ آخرت پر ایمان لانا کہ اس کائنات کو ایک دینی اجتماعی فنا کا شکار ہونا ہے۔ اور اگلے پچھلے سب حساب و کتاب اور جزاء و سزا کے لئے اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے۔ اور اپنے اپنے فیصلے کے مطابق جنت یا دوزخ میں جائیں گے۔ ۵۔ دنیا میں سب کچھ اللہ کے ارادے اور قدرت اور علم ازل کے مطابق ہوتا ہے مگر انسان کو نیک و بد میں اختیار کرنے اور اس کے مطابق چلنے کا اختیار حاصل ہے۔ نیا۔ موت کے بعد از سر نو زندگی شروع ہوگی جس میں اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

۲۔ عبادات ۱۔ دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ جن کی ادائیگی ہر عاقل و بالغ مسلمان پر ناگزیر ہے۔ فرائض کے علاوہ کچھ سنت و فرائض بھی ہیں جن سے فرائض کی تکمیل ہوتی اور قربِ خداوندی کا حصول ہو سکتا ہے۔ ۲۔ صاحبِ نصاب مسلمانوں پر سال کے بعد از کوثر فرض ہے جو نقدی کے علاوہ اموالِ تجارت اور مالِ مولیٰ پر بھی مقرر کی گئی ہے۔ ہر جنس اور نوع کے مختلف نصاب

ان عبارات کے علاوہ تلاوت قرآن اور حصولِ علم دین پر مسلمان پر فرض کیا گیا ہے۔ ضروریاتِ وقت کے لحاظ سے ہر قسم کے علوم و فنون کو حاصل کرنا بھی لازم گردانا گیا ہے۔ جیسا کہ حضور کی سنت اور خلفائے راشدین کے عمل سے واضح ہوتا ہے۔

۴۰۔ معاشی احکام | کسبِ حلال کی فضیلت کے ساتھ ساتھ تمام حرام اور ناجائز ذرائعِ معاش کو کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ دھوکا، خرب، خیانت، غصب، چوری، ڈاکہ، سود جیسی لعنتوں کی مذمت و تحریم وارد ہوئی ہے۔ حرام پیشوں کی وضاحت، بیان کی گئی ہے۔ بیع و شراء، تجارت، صنعت و ملازمت، ہزن زندگی کے سبھی معاملات کو مراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ سیاسی احکام | احساسِ ذمہ داری کا حکم دیا گیا ہے۔ کوئی خاص طرز حکومت، اتحاد، نظم و ضبط، صف بندی، مشورہ، اطاعت، امیر اور

واضح طور پر نہیں بتایا گیا تا کہ مسلمان ہر قسم کے حالات میں اور ہر زمانے میں مناسب انتظام خود کھلیں۔ مناسب حد بندی قائم کر دی گئی ہیں۔ اور راعی و رعایا کے حقوق و فرائض بتا دیئے گئے ہیں۔ نمونے کا نظم ممالک اور طرز حکومت، وہ قرار دیا گیا ہے جو آپس کے اولین شاگردوں نے قائم کیا۔ جو نظام اس سے جتنا قریب، تو ہو گا۔ اتنا ہی بہتر ہو گا۔ اور جتنا اس سے بعید ہو گا، اتنا ہی بُرا ہو گا۔ مقاصد حکومت، بتا دیئے گئے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے ہر دور کے مسلمانوں کو نظم و ضبط اور حکومت، خود قائم کرنا لازم ہے۔

۴۔ **جہاد اور صلح و جنگ کے احکام** اسلام کے دفاع اور سر بلندی کی خاطر غیر فرض مٹھایا گیا ہے۔ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے بے شمار فضائل بتائے گئے ہیں۔ شہادت کی موت کو حیات جاودانی قرار دیا گیا ہے۔ دو مستقل سورتوں یعنی الانفال اور التوبہ کے علاوہ اکثر مئی سورتوں میں جہاد و قتال اور حرب و ضرب کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ غیروں کے ساتھ مناسب حالات میں صلح و معاہدے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور پابندی عہد پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ عہد شکنوں کے خلاف اعلان جنگ کا حکم ہے۔ اسلحہ تیار رکھنا، فنون جنگ سیکھنا، ہر قسم کی قوت مہیا کرنا مسلم جماعت کے فرائض میں داخل ہے۔ اسلام کے دفاع اور حق کی سر بلندی کی خاطر ہر وقت تیار رہنے کا حکم قرآن مجید میں بڑی وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے علاوہ دین میں عدالتی نظام کی بھی تفصیل آئی ہے۔

دین و شریعت یہ دونوں لفظ بعض دفعہ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے مفہوم میں فرق بھی ہے۔ دین کا مطلب ہے حیات، دنیوی گزارنے کا انفرادی و اجتماعی نظام۔ اسلام اللہ تعالیٰ کے احکام و نواہی کے اس مجموعے کا نام ہے جو اس کے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دنیا والوں کی رہنمائی کی خاطر اتارا گیا۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس طریقے کے مطابق گزاریں۔ تاکہ دنیا و آخرت کی صلاح و فلاح حاصل ہو۔ ہر پیغمبر دین اسلام کا داعی تھا۔ اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران) ”بے شک دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے“

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران) ”اور جو اسلام کے سوا کوئی طرز جہاد چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ اور وہ کچھل زندگی میں نقصان پائے گا۔ ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو دین اسلام

پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی۔

يَا بَنِي آدَمَ اتَّقُوا اللَّهَ أَصْطَفَىٰ لَكُمْ آلَآدَمَ فَلَا تَمُوتُوا ۖ اَلَا وَانْتُمْ مُّسْلِمُونَ ۝
(البقرہ) ”میرے پیارے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے یہ دین چن لیا ہے سو تم صرف اسی مال میں رہنا کہ مسلمان ہوؤ دین کے بنیادی حقائق، عقائد، اخلاق اور بنیادی عبادات، ہمیشہ ایک رہی ہیں۔ وقتی ضروریات کے لحاظ سے قانون (شریعت) میں رد و بدل ہونا رہا۔

بَلْ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شُرَٰعَةً وَفُرُجًا ۚ (القرآن) ”ہم نے تم میں سے ہر امت کے لئے قانون شریعت اور راہ عمل مقرر کی“ پس شریعت اسے مراد دین کے قانونی احکام ہیں۔

اسلامی شریعت کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے۔ مگر اس میں ہر زمانے پر عمل درآمد کے لئے اجماع واجتہاد اور قیاس کی کافی لچک رکھی گئی ہے۔ اس لئے اسلامی فقہ (قانون و شریعت) کے چار ماخذ مٹھائے گئے ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ اس کی ضرورت یہ تھی کہ ہر دور کے احوال و ظروف میں شرعی احکام پر عمل کیا جاسکے۔ شریعت میں بالعموم عدالتی نظام، عدل و انصاف کے احکام اور طریقے، جرائم و حدود، قانون شہادت، مدعی و مدعا علیہ کے احکام، قاضی کے صفات و احکام بیان کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ معاملات باجمہک ہر وہ مقدمہ جس میں نزاع پیدا ہوئے انکے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل کے لئے حدیث و فقہ کی کتابوں کے ابواب و فصول کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔

نوع نبوت اسلامی عقیدے کی رُو سے قرآن ایک مکمل اور دائمی و آفاقی دستور العمل ہے۔ اسلام خدا کا آخری دین ہے جو اعلانِ خداوندی کے مطابق اکمال و اتمام کے مراحل طے کر چکا ہے۔ حلال و حرام کے ضوابط، قوانین شرع، اللہ اور بندے کا تعلق اور بندوں کے باہمی تعلقات کو آخری شکل میں آمار دیا گیا ہے۔ اب کسی جدید قاعدے قانون یا کتاب و دستور کا نہ انتظار ہے نہ ضرورت۔ انہی حقائق کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کا لقب عطا فرمایا ہے۔ اسلامی عقائد کی فہرست میں جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان کا بیان آتا ہے تو اس سے مُراد آپؐ کو اس حیثیت سے رسول اللہ ماننا ہوتا ہے کہ آپؐ آخری نبی اور آخری مامور من اللہ ہیں۔ اب ان روئے اسلام کی جدید رسالت و نبوت کا انتظار نہیں۔ یہی سبب ہے کہ صحابہؓ نے جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف قتال کیا۔ اور انہیں کیفرِ کدار تک پہنچایا۔ بعد کی صدیوں میں بھی جب اور جہاں کہیں

کوئی شخص نبوت و رسالت کا مدعی بن کر اٹھا اُسے کذاب و جال قرار دیا گیا اور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو حکومت کے باغیوں سے کیا جاتا ہے حضور کے بعد کسی جدید نبوت و رسالت کا دعویٰ دوسرے الفاظ میں حضور کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ہے۔ ایسے شخص کو رائج الوقت قوانین کے مطابق جو باغی کی سزا ہے اس سے بھی شدید تر سزا ملنی چاہیے۔ وہ اسلام کی مرکزیت عقیقہ رسالت کا باغی ٹھہرتا ہے۔

قرآن مجید قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری، مکمل اور ہمیشہ تک محفوظ کتاب ہے جو ۲۳ سال کے عرصے میں وقتاً فوقتاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریل کی معرفت اُنری۔ یہ بے کم و کاست اپنی بالکل اصلی شکل میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے پاس لاکھوں کروڑوں مصاحف کی صورت میں موجود ہے۔ اور سر زمانے میں ہر مسلم ملک و قوم کے اندر اس کے بے شمار حافظ موجود رہے ہیں۔ آج دنیا بھر کی مذہبی کتابوں میں صرف یہی وہ کتاب ہے جو صحیح معنی میں بعینہ محفوظ ہے۔ اس کے بے شمار تراجم و تفاسیر لکھی گئیں اور آئندہ بھی لکھی جائیں گی مگر بے شمار زبانوں کی یہ کتابیں قرآن کے ترجمے اور تفسیر کہلاتے ہیں، قرآن صرف وہ کتاب ہے جس کی ہم نمازوں، خطبوں، جلسوں، گھروں اور مسجدوں میں تلاوت کرتے ہیں۔ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے کسی ملک میں کسی پریس میں بھی یہ کتاب چھپے، ایک ہی ہوگی۔ اس میں سرسبز فرق نہیں آئے گا۔ اس کی جس قرأت پر حضور کے پہلے شاگردوں نے اسے جمع کیا تھا، اُسی پر ڈیڑھ ہزار برس سے پڑھی جاتی اور لکھی چلی آئی ہے۔ بعض الفاظ کے لب و لہجے کی ادائیگی میں جو فرق ہے اسے بھی محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کا رسم الخط بھی محفوظ ہے۔ اس کے الفاظ، حروف، نقطے، آیات، ہر چیز کو شمار کیا گیا ہے۔ جتنا کام اس کتاب پر ہوا ہے دنیا کی اور کسی کتاب پر نہیں ہوا۔ اس کو سمجھنے سمجھانے اور پڑھنے پڑھانے کے لئے بہت سے علوم و فنون ایجاد ہوئے ہیں جو آج مسلم عوام میں مشہور و معروف ہیں۔ غرض یہ کتاب ہر پہلو اور ہر لحاظ سے دنیا کی بے مثال کتاب ہے۔ اسلامی عقیدے کی دوسرے اس کے الفاظ و معانی اور قرأت و تجوید ہر چیز خدا کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوئی تھی اور ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

اعجاز القرآن پیغمبر اکرم اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ہزار ہا معجزات نازل ہوئے مگر ان میں سب سے بڑا اور زندہ و پائیدہ معجزہ قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کو پہلے اس جیسی کتاب بنانا سنے کا چیلنج دیا۔ اور فرمایا کہ تم لوگ قرآن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دیتے ہو لہذا

قُلْ لَّيْنِ اجْتَمَعَتِ الْجُنُودُ وَالْإِنْسُ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَكَوْنًا بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ۝

”کہیے اگر اس قرآن کی مثل لے آئے ہر جن و انس بھی اکٹھے ہو جائیں تو ایک دوسرے کے مددگار ہونے کے باوجود وہ اس کی مثل نہ لاسکیں گے“ جب اس متحدہی پر کچھ وقت گزر گیا۔ اور کوئی مرد میدان سامنے نہ آیا تو اس کی شرائط میں نرمی کر دی گئی۔ اور اس قرآن جیسی دس سورتیں لانے کو کہا گیا۔ **فَاتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مُّقْتَرِبَاتٍ ۝** اس جیسی دس خود ساختہ سورتیں لے آؤ، جب اس پر بھی کوئی مد مقابل نہ اٹھا تو آخری غیر مشروط دائمی چیلنج یوں دیا گیا۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهِ
وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

(البقرہ) ”اور یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری اگر تمہیں اس میں کوئی شک ہے تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے سب گواہوں مددگاروں کو بلاؤ، اگر تم سچے ہو تو کر کے دکھاؤ“ اس آیت میں کسی قوم، کسی زمانے یا ملک کی کوئی شرط نہیں۔ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت انکو تر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بھلا اس جیسے تین جلد ہی بنا کر لے آؤ۔ پھر مخالفین کو غیرت دلانے کے لئے یہاں تک فرما دیا گیا کہ:

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَكِنْ تَفْعَلُوا فَتَقْوُوا النَّارَ الَّتِي دَقَّوْهُ هَآلِ النَّاسِ
وَالْحِجَارَةُ ۝ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝

”پھر اگر ایسا نہ کرو اور اور ہرگز کبھی نہ کر سکو گے تو دوزخ کی آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پھر ہوں گے۔ وہ منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے“ مگر دشمنوں کو سائب سو نگہ کیا۔ وہ گالیاں دیتے رہے۔ اسلام کو مٹانے کی تدبیریں کرتے رہے۔ سازشیں کرتے رہے۔ فوجی کارروائیاں کرتے رہے۔ مگر یہ چیلنج جو ان کے لئے پیغام موت ہے۔ اسے قبول نہ کیا اور نہ کبھی کریں گے۔ اس سے بڑھ کر قرآن کی صداقت کا اور کون سا عملی و عملی ثبوت ہو سکتا ہے؟ گو اس کی صداقت کے ہزاروں دلائل اور بھی موجود ہیں!

عقیدہ ایمان بالآخرت کی تفصیل میں جنت و دوزخ کا عقیدہ بھی **جنت و دوزخ** شامل ہے۔ جنت کا فعلی معنی باغ ہے وہ رضائے الہی کا گھر ہے

جس میں ان لوگوں کو ہمیشہ کی زندگی کے لئے داخل کیا جائے گا جو میدانِ شہر کے حساب و کتاب میں کامیاب نکلیں گے اور جن کی نیکیاں برائیوں پر غالب ہوں گی۔ اگر ایمان سلامت

ہو، تو گنہ گاروں کو یا تو الہی فضل سے یا پیغمبر اور ان کے فرماں برداروں کی شفاعت سے بخش دیا جائے گا۔ کچھ ایسے بھی ایماندار ہوں گے جنہیں کچھ وقت کے لئے سزا کی خاطر — تاکہ وہ گناہوں سے پاک و صاف ہو جائیں — دوزخ میں بھیجا جائے گا۔ اور سزا ختم ہونے پر یا بذکرہ شفاعت یا رحمت خداوندی سے دوزخ سے رہا کر کے جنت میں بھیجا جائے گا۔ جنت کی نعمتیں بے حد و شمار ہوں گی اور دنیا میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جہنم — دوزخ — خدا کے عذاب اور ظہور عدل کا مقام ہے۔ مشرک و کافر اور منافق تو اس میں اپنے اپنے درجے اور مرتبے کے مطابق ہمیشہ رہیں گے مگر اہل ایمان کے لئے وہ ایک مقام سیاست و ظہارت ہوگا، کہ انہیں گناہوں کی میل پھیل سے صاف کر کے جنت جیسے پاک مقام میں لے جایا جائے۔ جس طرح جنت کے بے شمار درجے ہوں گے اسی طرح جہنم اور اس کے عذاب کے بھی درجے اور مراتب ہوں گے۔ *نحوذ باللہ منہا*۔

جمع قرآن دشمنان اسلام کے تمام مخالفانہ پروپیگنڈے کے باوجود حقیقت و واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی جمع و ترتیب کا کام اس کتاب کے نزول کے پہلے دن سے شروع ہو گیا تھا۔ جو اختتام نزول کے ساتھ اتمام کو پہنچ گیا۔ حسب وعدہ خداوندی: *إِنَّا عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقَدْ آتَيْنَاهُ الْقِيَامَةَ* ”اسے جمع کرنا اور پڑھوانا خود ہمارے ذمہ ہے“ ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ: ”اُمی جمعنا فی صدورک“ یعنی اے رسول! اسے آپ کے سینے میں جمع کرنا اور پھر آپ کی زبان سے پڑھوانا اللہ کے ذمہ ہے“ پس جمع قرآن کا پہلا خزانہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک تھا۔ جوں جوں قرآن اُترتا گیا آپ کے سینے میں حفظ ہوتا گیا۔ ہر نئی آیت والی سورت یا آیت اعجازی رنگ میں سب سے پہلے جو بول سے سنی کہ آپ کو یاد ہو جاتی تھی۔ سورت لمبی ہو یا چھوٹی، اس معاملے میں کوئی فرق و امتیاز نہ تھا۔ پھر آپ نے قرآن کو لکھوانے اور کئی اصحاب کو اس کے معائنہ تیار کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ ان لوگوں کو کاتب وحی کہا جاتا تھا۔ خلفائے راشدین کے علاوہ کم و بیش دو درجن لوگ وحی کے کاتب رہے ہیں۔ آپ انہیں بلوا کر اپنے سامنے لکھواتے، پڑھوا کر سنتے، ہر آیت اور سورت کا محل وقوع بتاتے تھے۔ لکھنے کا سامان یہ تھا: جوڑی چوڑی ٹہیاں، پتھر کے طویل و عریض ٹکڑے، لوسہ کی تختیاں، ہرن کی کھال کی جھلی، ان چیزوں پر لوسہ کی کیل سے کھود کر لکھا جاتا تھا۔ قلم و وات بھی استعمال ہوتی اور ان چیزوں کے علاوہ بعض دفعہ اور سامان کتابت بھی کام میں لایا جاتا تھا۔ کاتبین وحی کو حکم تھا کہ بالعموم آپ

کے قریب رہیں تاکہ بوقت ضرورت بلا کر یا اگر مجلس میں موجود ہوں تو بھی وہی لکھوائی جاسکے بہت سے لوگ حافظ قرآن بھی تھے۔ ویسے بھی نزول قرآن کی رفتار بہت سست تھی کہ ۳۰ برس میں تمام و کمال کو پہنچا، لہذا اس کا یاد کر لینا بہت سہل تھا۔ آج کل تو ہمارے نیچے تین چار سال میں حافظ ہو جاتے ہیں۔ آپ نمازوں کے علاوہ خطبوں میں، وعظ و تقریر کی مجلسوں میں، غیر مسلموں کو تبلیغ کے وقت قرآن کی تلاوت فرماتے رہتے تھے اور ہر وقت لوگوں کی یادداشت تازہ ہوتی رہتی تھی۔ مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ کی محلہ دار مساجد میں اور دور دراز مہات، و صحراء میں قرآن کی تعلیم و تلاوت کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا۔ مردوں کے علاوہ یہ سلسلہ بچوں اور خواتین میں بھی چلتا رہتا تھا۔ غزائین حضور کے گھروں میں یا دوسرے مقامات پر جمع ہو کر مذاکرات و مکالمات اور مسائل شریعہ کے تعلیم و تعلم کے علاوہ قرآن کی تلاوت و حفظ میں بھی کوشاں رہتی تھیں۔ اُس دور میں ریاست و حکومت کا عہدہ اُن لوگوں کو ملتا جو دوسری اہلیتوں کے ساتھ ساتھ علم قرآن میں بھی کافی دسترس رکھتے تھے۔ یہ گونا گونا گویا قرآن کی ابک علی ترغیب تھی۔ کاتبیہ وہی کے علاوہ اور لوگ بھی اپنی اپنی یادداشت کے طور پر قرآن لکھتے اور اسے زبانی یاد رکھنے کے علاوہ کتابت کے ذریعے سے بھی محفوظ رکھتے تھے۔ حضور جمعہ و عیدین کے خطبوں میں قرآن کا کوئی نہ کوئی حصہ تلاوت فرماتے رہتے تھے۔ فجر اور عشاء کی فرض نمازوں کے علاوہ نماز تہجد میں آپ اور آپ کے اصحاب لمبی لمبی سورتوں کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ کتب حدیث اس قسم کے بے شمار واقعات سے پُر ہیں۔ حضور کے زمانے میں آپ کی زیر نگرانی نہ صرف قرآن مجید کا جمع ہونا اور بہت سے لوگوں کے پاس اس کے مکتوب مصحف کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اس کی ترتیب، سورت و آیات بھی آپ ہی نے صحابہ کو بتائی تھی۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب ریل جب قرآن کا کوئی حصہ لے کر آئے تو آپ کو یاد کرانے کے ساتھ یہ بھی بتاتے تھے کہ اسے فلاں مقام پر فلاں سورت سے پہلے اور فلاں کے بعد فلاں آیت سے قبل اور فلاں کے بعد وحی کیا جاسے۔

حضور کے حین حیات میں آخر وقت تک کسی حکام یا انبی کے نزول کا امکان باقی تھا۔ دین کی تکمیل ہو چکی تھی، مگر بعض احکام و لواہی کی وضاحت ممکن تھی یا کسی اخلاقی تعلیم کا نزول ہو سکتا تھا۔ اس معلومت کے پیش نظر حضور نے ان مختلف جموعوں اور یادداشتوں کو جو کاتبین وہی کے پاس موجود تھیں کسی ایک صحیفہ یا کتاب کی شکل نہیں دی۔ اگر ایسا حکم دیا جاتا تو کسی نئی آیت یا سورت کے نزول کے بعد پھر اس کتاب کو توڑنا اور از سر نو مرتب کرنا پڑتا۔

یہ کام خلیفہ رسول ابوبکر صدیقؓ نے انجام دیا۔ جنگ یدامر میں شہید ہونے والے صحابہؓ میں بہت سے حفاظ قرآن بھی تھے۔ جب اس کی اطلاع دار الخلافہ میں پہنچی تو حضرت عمر فاروقؓ کی غفلت طبیعت اور نگاہ دور رس نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اب قرآن کو ایک مصحف میں سرکاری نگہبانی میں جمع کرنے کا وقت آچکا ہے۔ چنانچہ ان کے مشورے سے خلافت صدیقیؓ میں یہ اہم کام سرانجام پایا۔ اس میں جلیل القدر فقہاء و علمائے صحابہؓ اور حفاظ قرآن سے مدد لی گئی۔ اور تقریباً چھ ماہ کے عرصے میں ایک مصحف تیار ہو گیا۔ جو مصحف امام کہلایا۔ یہ نسخہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تحویل میں رہا پھر جناب عمر فاروقؓ کے پاس رہا۔ ان کی شہادت کے بعد اہم المؤمنین حضرت عثمانؓ نے اسے اپنی تحویل میں رکھا۔ حضرت عثمانؓ ذوالنورین کے دور خلافت میں کچھ لوگوں میں قرأت قرآنی میں اختلاف ہوا۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر انہوں نے مجبرہ کا کام اُسی پہلی جماعت کے سربراہ کیا جو خلافت صدیقیؓ میں جمع قرآن کا کام کر چکی تھی۔ اس کمیٹی کے ناظم کا نسب دوجی زید بن ثابتؓ تھے۔ انہوں نے حضرت حفصہؓ سے اصل نسخہ منگوا کر اس کی سات نقلیں لکھیں اور سلطنت کے تمام صوبوں میں بھیجا دیں۔ یہی اختلاف کے لئے حکم دیا گیا کہ اس کے علاوہ اگر کسی کے پاس کوئی اور یادداشت ہو تو اسے ضائع کر دیا جائے۔ اس طرح قرآن شائع ہوا اور مشرق و مغرب میں ہر طرف ایک ہی نسخہ پر سب مسلمان متفق ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ غنیؓ کو اس سبب سے جامع القرآن کہا گیا۔ ان مختلف نقول کی اصل کا پیمانہ ترکی، تاشقند، مدینہ منورہ کے علاوہ بعض اور مقامات پر بھی بتائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ پنجاب، ہسلک، لاہر، برہنہ لاہور میں حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ بنا یا جاتا ہے جس میں موجودہ مصاحف سے سبب تفریق نہیں ہے۔

جمع قرآن پر عالم اسلام کے مشہور عقیق ڈاکٹر حمید اللہ کا خطبہ موجود ہے جو خطبات بہاولپور نامی کتاب کی زینت ہے۔

تاریخ اسلام میں ہر مسلم کے گھر میں قرآن مجید کے متعدد نسخے موجود ہیں۔
وہ خود اسے پڑھتا اور اولاد کو پڑھاتا ہے۔ ہر مسلم آبادی میں کئی حافظ قرآن ہوتے ہیں جو نماز تراویح میں ہر سرعام پورا قرآن کم از کم ایک مرتبہ ربانی سنتے ہیں۔ ہر اچھا مسلمان اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ میری اولاد یا ان میں سے ایک آدمہ ضرور حافظ ہو۔ پس قرآن کا حرف، بحرف محفوظ و محفوظ ہونا ہر خاص و عام پر واضح ہے۔ یہی سبب ہے کہ اعداء اسلام کو قرآن پر اس پہلو سے اعتراض کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ اعتراضات، اور شکوک و شبہات، کا نشانہ بنانے کے لئے انہوں نے حدیث کو چننا ہے۔

مستشرقین کی جماعت نے اس موضوع پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ کیونکہ حدیث کی تعلیم و تعلم اور اس کے مختلف علوم و فنون پر گفتگو کرنا علماء کا کام رہا ہے۔ اعداء اسلام کی دیکھا دیکھی بعض محدثین نے بھی حدیث کو نقد و جرح کا نشانہ بنایا ہے۔ اس وجہ سے اس موضوع پر مدلل اور ذرا مفصل گفتگو کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں پہلا سوال یہ ہے کہ آیا دور نبوی میں حدیث کا لکھا ہوا ذخیرہ موجود تھا یا نہیں؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہاں موجود تھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و اجازت بلکہ بعض حالات میں حکم سے احادیث کی کتابت و حفاظت کی گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکہ، قبائل عرب اور یہود سے کسی تحریری معاہدے کے بغیر جنہیں باقاعدہ ضبط تحریر میں لایا گیا۔ اور ان پر فریقین کے دستخط اور مہر میں ثبت ہوئیں۔ حدیث کی تعریف کی رود سے سب مواد حدیث ہی کا حصہ ہے۔ اور حدیث و سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ ان معاہدوں میں سے صلح حدیبیہ، میثاق مدینہ اور دیگر کئی معاہدے مشہور ہیں۔ ابن عبد ربیع نے العقد الفرید میں بہت سے اشخاص اور قبائل عرب کو بخشنے کے مواثیق و معاہدات کو کئی صفحات میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح حضور نے غیر مسلم امراء و رؤسا اور ملوک و حکام کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے جو محفوظ ہیں۔ سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے آپ نے بہت سے لوگوں سے خط و کتابت کی، بہت سے گورنروں اور حکام کو فرامین جاری کئے، یہ سب حدیث کا حصہ ہیں۔ جنگ بدر سے قبل آپ نے عبداللہ بن جحش کو ایک مختصر جماعت کے ہمراہ ایک سربراہ خط درے کر بھیجا اور حکم دیا کہ فلاں مقام پر پہنچ کر اسے کھولنا اور اس پر عمل درآمد کرنا۔ محصلین زکوٰۃ کو آپ نے نصاب زکوٰۃ کی تحریریں بھیجیں تاکہ ان کے مطابق مختلف احوال کی زکوٰۃ وصول کریں۔ آپ کے زمانے میں کئی بار مردم شماری ہوئی اور اس کی رپورٹیں حضور کے حکم سے مرتب کی گئیں۔ کئی صحابہ نے مثلاً عبداللہ بن عمر و ابن عباس — آپ کے امراء اور وزراء — احادیث کا ذخیرہ آپ کی مجلس میں بیٹھ کر مرتب کیا۔ فتح مکہ کے موقع پر جو خط آپ نے ارشاد فرمایا تھا اسے ایک صحابی ابو شامہ عینی نے تحریری شکل میں طلب کیا تو حضور نے فرمایا: اکتبوا الابی شامہ ابو شامہ کو یہ خط لکھ کر دے دو۔ تعبیل ارشاد ضرور ہوئی تھی، اس میں تو بحال گفتگو ہی نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمر کے علاوہ دوسرے کئی اصحاب مثلاً علی بن ابیطالب، اش بن مالک، ابو موسیٰ اشعری، جابر بن عبد اللہ انصاری اور عبداللہ بن عباس نے حضور کے عہد میں احادیث لکھیں۔

عرب میں ظہور اسلام سے قبل قبائلی و بدوی زندگی کے باعث لکھنے پڑھنے کا رواج

بہت کم تھا۔ ابتداء اسلام میں قرآن کے علاوہ اور کچھ لکھنے پر پابندی لگا دی گئی تاکہ خدا کی کتاب کے ساتھ کوئی اور چیز خلط ملط نہ ہونے پائے۔ جب بہت سے لوگ پڑھ لکھ گئے اور یہ خدشہ نہ رہا تو آپؐ نے کتابت حدیث کی اجازت دے دی۔ خود ایک شخص کی اس شکایت پر کہ اس کا حافظہ راجحانہ تھا اور آپؐ کی باتیں یاد نہ رہتی تھیں، ارشاد فرمایا **اَسْتَمِعُ بِمِثْلِكَ** ”اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو۔“

سفر ہجرت میں آپؐ کا عطا کردہ امان نامہ سراقہ بن مالک کے پاس محفوظ تھا۔ کئی لوگوں کو جاگیریں بخشیں اور تحریر لکھ کر دی۔ قبائل عرب کو بہت سے خطوط لکھوائے۔ غیر مسلموں، بالخصوص یہود کے ساتھ خطوط لکھا بہت رہتی تھی۔ اور چونکہ ان کی دیانت و امانت پر بھروسہ نہ تھا لہذا خطوط کو پڑھنے اور جواب دینے کی خاطر آپؐ نے — جیسا کہ صحیح بخاری میں روایت موجود ہے — **ذی بَیِّن ثَابِت** کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے بہت محنت سے عربی میں عبرانی میں جہارت پیدا کر لی۔ اور اس کے بعد یہ خدمت انہی کے متعلق رہی۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کے یہ خطوط بھی ذخیرہ حدیث ہی میں شامل ہیں۔ علامہ ابن عبد البرؒ نے اپنی مشہور کتاب جامع بیان العلم میں حضورؐ کا یہ حکم درج کیا ہے کہ: **قَبِذُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ** ”علم کو لکھ کر محفوظ کر لو۔“ اس دور میں علم حدیث کا یہ سارا مواد منتشر یادداشتوں کی صورت میں لوگوں کے پاس موجود تھا۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ کسی شخص کے سوال پر اپنی تلوار کی نیام سے ایک تحریر نکال کر دکھائی تھی جو حضورؐ نے انہیں قعاص اور خون بہانے کا حکام پر لکھوائی تھی۔

عجیبہ صحابہؓ میں روایت حدیث کا مدار عموماً زبانی یادداشتوں پر رہا لیکن بہت سے بزرگوں کے پاس اپنے اپنے مجموعے بھی موجود تھے۔ روایات میں حضرت ابو بکرؓ صدیق کے پاس بھی اس قسم کی ایک یادداشت کا پتہ چلتا ہے۔ لوگ روایت حدیث میں عموماً بڑی احتیاط کرتے تھے۔ کیونکہ ایک متواتر حدیث **مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعِدًّا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ** (جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے وہ جہنمی ہے۔) انہیں اس احتیاط پر مجبور کرتی تھی۔ تاہم حسب ضرورت حدیث، بیان کی جاتی تھی۔ صحابہؓ میں زبانی یا بعض دفعہ تحریری روایت حدیث زیادہ تر ان حضرات نے کی ہے: ابو ہریرہؓ، ابو سعیدؓ، جابر بن عبد اللہؓ، انس بن مالکؓ، اُمّ المؤمنین عائشہؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، عبد اللہ بن عمروؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، خلفائے راشدین کو خلافت کے معاملات سے کم فرصت ملی لہذا ان کی روایات ان بزرگوں سے کم رہیں۔ ایک سے لے کر سو تک، احادیث بیان کرنے والے صحابہؓ بہت ہیں۔

تابعین کے دور میں منتشر یادداشتوں سے ابتدائی کتب مرتب ہوئیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دور خلافت میں سرکاری اہتمام سے جمع حدیث کا کام شروع کر لیا مگر زندگی نے ہمت کم دی اور یہ کام سرکاری سرپرستی سے محروم رہ گیا۔ اس دور میں حجاز کے علاوہ عراق، شام اور یمن بھی روایت و تدوین حدیث کے مرکز بن گئے۔ تبع تابعین کے دور میں مؤطا امام مالک مؤطا امام محمد مسند شافعی، کتاب الآثار ابی یوسف، کتاب الآثار محمد بن الحسن مرتب ہوئیں۔ کچھ اور کتابیں بھی ہیں جو بالعموم شائع نہیں ہوئیں۔ ان کے بعد معنف عبدالرزاق صنعانی مسند یحییٰ بن خالد اندلسی وغیرہ کا زمانہ آیا اور پھر مسند احمد بن حنبل جیسی جلیل القدر کتاب مرتب ہوئی۔ اور پھر صحاح کی مشہور کتب بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ پیچھے ذخیروں کو چھانٹ کر لکھی گئیں۔ تیسری صدی جمع حدیث کی نہیں بلکہ تدوین کتب حدیث کی صدی ہے۔ جسے ازراہ شرات و عداوت اعداء اسلام نے "حدیث بنانے کی صدی" قرار دے رکھا ہے۔ آخر میں ایک حقیقت کا اظہار ضروری ہے۔ نقد و جرح حدیث پر علمائے اسلام نے جتنی محنت کی ہے اور جس قدر علوم اس متن میں مدون ہوئے ہیں۔ غیر مذاہب کی آسمانی کتابوں کی حفاظت و روایت میں اس کا سواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی کام نہیں ہوا۔ بائبل کی کتابوں میں کوئی متعلق مرقعہ سند نہیں ہے۔ راویوں کو پرکھنے کے کوئی اصول و ضوابط نہیں ہیں۔ قرآن تو ایک معجزہ نبوی ہے ہی، ہماری حدیث و سنت کی کتابیں بھی دوسروں کی آسمانی کتابوں سے زیادہ مستند اور معتبر ہیں۔ اناجیل اربعہ کے مصنف گناہ میں، معلوم نہیں کون اور کیسے لوگ تھے۔ ہماری کتب حدیث کے جامع مشہور و معروف فقہ اور عادل و ضابط ہیں۔ وہ اپنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہر حدیث کی سند بیان کرتے ہیں۔ راویوں کو جانچتے پرکھتے ہیں۔ کوئی راوی اگر مشکوک نظر آئے تو اس کی حدیث کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ راویوں کے احوال، ان کے اساتذہ اور پھر ان کے اساتذہ در اساتذہ کے احوال کتب بحال میں جمع ہیں۔ علم جرح و تعدیل کی مدد سے ہر شخص کی قدر و قیمت اور اس کی روایت کا درجہ متعین ہے۔ یہ احتیاط اور محنت کہیں اور نظر نہیں آتی۔

تدوین فقہ و مکاتب فقہ فقہ کا لفظی معنی ہے سمجھ، فوجہ، عقل و فکر کی گہرائی۔ اصطلاح میں ان مسائل و احکام کے بیان کا نام ہے جو کتاب و سنت میں متعدد مقامات پر بکھرے ہوئے تھے۔ انہیں سمیٹ کر ایک خاص ترتیب سے سجا دینا اور جہاں یہ دلوں خاموش ہوں وہاں اجتہاد قیاس سے کام لے کر حکم نکالنا۔ اس

سے معلوم ہوا کہ فقہ کتاب و سنت ہی سے نکلی ہے۔ ان کے خلاف یا برعکس کسی تفسیری چیز کا نام نہیں۔ قرآن وحدیث میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ **فَلَوْلَا نَفَسٌ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ** (التوبہ)
 (التوبہ) ”سو ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ان میں سے ہر گروہ میں سے ایک جماعت، پیغمبر کے پاس آکر رہے تاکہ دین کی گہرائی حاصل کر سکے“

مَنْ يُؤَدِّبِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفْقَهُوا فِي الدِّينِ (الحمدیث) ”اللہ جس کی مجالانی چاہتا ہے اُسے دین میں فقاہت عطا کرتا ہے“ یہ سنہاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے۔

فقہائے اسلام نے اپنی فقہی وقانونی زبان میں فقہ کی یہ تعریف کی ہے: ”فقہ وہ علم ہے جس میں ہمارے افعال کے بارے میں واجب حرام، مستحب، مکروہ یا مباح ہونے کی حیثیت سے احکام الہی کو معلوم کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام کے قانونی احکام و قوانین کا نام فقہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد کی اجازت دی، بعض مسائل میں خود بھی اجتہاد کیا۔ آپ کے اصحابؓ میں وہ لوگ فقہا کہلائے جو خدا داد سمجھ اور علمی استعداد کے مطابق کتاب و سنت سے احکام نکالتے تھے۔ اور جہاں ان سے فیصلہ کن حکم دینے والے اجتہاد بھی کرتے تھے۔ حدیث و فقہ کی کتابوں سے ان کے یہ نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ چاروں خلفائے راشدین، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ام المومنین عائشہ صدیقہ، ام المومنین آمنہؓ، انس بن مالکؓ، ابوہریرہؓ، ابوسیدہ خدریؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، سلمان فارسیؓ، جابر بن عبداللہؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، عمران بن حصینؓ، ابوبکرؓ، ثقیف، عبادہ بن صامتؓ، ابوالدرداءؓ، معاویہؓ بن ابی سفیانؓ۔ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ چونکہ عرب میں پڑھنے لکھنے کا رواج کم تھا لہذا پڑھا لکھا اور صاحب فتویٰ ہونے کے باعث پہلے علماء کا نام قرآن رکھا گیا، آگے چل کر یہی نام فقہاء سے بدل گیا۔

خلافت راشدہ کے بعد اموی و عباسی دور میں بوجہ فقہائے امت نے سرکاری سرپرستی سے بے نیاز ہو کر شرعی احکام کی تدوین اور اجتہاد و قیاس کا کام آزادانہ طور پر کیا۔ ان ادوار میں تین اسلامی ممالک میں بہت سے فقہ نظر آتے ہیں۔ مگر جن فقہاء کے مسائل فقہ کو تدوین و ترتیب اور شہرت و دوام نصیب ہوئی وہ ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ تھے۔ فقہ سے ان حضرات کے شغف کا بڑا باعث سلطنت کی وسعت اور منت سے مسائل کا پیدا ہونا تھا۔ ہر قسم کے احوال میں ہر نئی مشکل کا حل تجویز

کرنا ضروری تھا کیونکہ اسلام خدا کا آخری دین، قرآن آخری کتاب اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر تھے۔ اب کسی آسمانی ہدایت کا انتظار نہ تھا۔ کتاب و سنت اور اجماع و قیاس سے ہی مسائل کو حل کرنا ضروری تھا۔ غیر مسلموں کو اعتراف ہے کہ مسلمانوں نے شرع و قانون کے سلسلے میں ایسا کام کیا ہے جو بے مثال ہے۔ کسی دوسری قوم کے ہاں — یہودیوں میں بھی — فقہ و قانون پر وہ کام نہیں ہوا جو اہل اسلام کر سکے۔ ہر علاقے اور سرور کی کچھ منفرد قسم کی ضروریات بھی ہوتی ہیں۔ فقہائے اسلام نے تدوین فقہ اور مکاتب فقہ کے قیام کی صورت میں ایسا بے نظیر کام کیا ہے جو کسی بھی مہذب سلطنت کو چلانے کے لئے ہر زمانے میں مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں تشریح و قانون سازی کے ضمن میں ایک کارنامہ ایسا بھی ہے جس کی داد غیر مسلم علماء بھی دیتے بغیر نہیں رہ سکے، وہ کام ہے فن اصول فقہ کی ایجاد و اختراع۔ کتاب و سنت کے مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے دلائل کو جمع کر کے ایک مدلل و منضبط علم و فن کی صورت گری کرنا واقعی جان بوجھوں کا کام تھا۔ یہ اسے فقہا کا یہ قابل فخر کارنامہ ہے۔ المواقفات، اصول بزدہی اور ان جیسی دوسری جلیل القدر کتابوں میں ایسے قواعد و ضوابط منضبط کر دیئے گئے ہیں کہ قیامت تک ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے قانون کا وضع کر لینا اتنا مشکل کام نہیں، سوال یہ تھا کہ قانون سازی کی بنیادیں اور اس کے قواعد و ضوابط کیا ہوں جنہیں اس مشکل کام میں مد نظر رکھا جائے۔

یوں تو امت مسلمہ میں دور تابعتین سے لے کر اب تک بے شمار فقہ پیدا ہوئے مگر چار حضرات ایسے تھے جن کے نام پر مستقل مکاتب فقہ وجود میں آئے اور وسیع ذخیرہ کتب تیار ہوا۔ حنفی مکتب فکر امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے۔ انہوں نے بہت سے مختلف علوم و فنون کے ماہروں کی ایک جماعت تیار کی اور اپنی نگرانی میں ان سے بے شمار قانونی مسائل پر فیصلے کرائے۔ ان فیصلوں اور آراء کا مجموعہ فقہ حنفی کہلایا۔ ان کی جماعت میں ابو یوسف جیسے لوگ بھی تھے جو ہارون الرشید کے دور حکومت میں چیف جسٹس بلکہ وزیر عدلیہ کے عہدے پر فائز تھے۔ محمد بن الحسن شیبانی نے فقہ حنفی کو کتابوں کی صورت میں مدون کیا۔ اس فقہ پر عقل و فکر اور شان اجتماعیت کا غلبہ ہے۔ شاید سب سے سالیبا سال تک غلام عباسی حکومت کا قانون رہ چکی ہے۔ حنفی کہلانے کے باوجود اس فقہ میں شاید ۱۵ فیصد سے زائد اجتہادات ابوحنیفہ کے نہیں ملیں گے۔ جو اصول حنفی جماعت نے وضع کئے تھے ان کی بنیاد پر جو بھی اجتہاد جب بھی

کیا جائے حنفی کہلا سکتا ہے۔ مالکی فقہ امام مالکؒ بن انس مدنی رحمہ اللہ ابھی کی طرف منسوب ہے۔ وہ حدیث وفقہ کے عظیم امام تھے۔ اُن کے اصول کی رُو سے کتاب وسنت کے بعد عمل ابن مدینہ کو شانِ اولیت حاصل رہی ہے۔ ان کی مشہور کتاب موطا ہے جس میں مرفوع احادیث کم اور ان کے فتویٰ کے ساتھ صحابہؓ و تابعین کے آثار زیادہ ہیں۔ یہ فقہ زیادہ تر افریقہ و اندلس میں پھیلی اور سلطنت کا دستور رہی ہے۔ اس فقہ کا طرہ امتیاز مصلحت عامہ (مرسوم) کا مسئلہ ہے جسے ہر زمانے میں اجتہاد کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ تیسرا مکتب فکر شافعی ہے جو امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے۔ امام شافعی نے امام مالکؒ اور محمد بن الحسن سے علم حاصل کیا۔ ان کے زمانے میں حدیث کا ذخیرہ پہلے کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ صورت میں موجود تھا۔ ہر عبادت اور محاکم اسلامیہ کے ہر حصے کی احادیث جمع ہو چکی تھیں۔ امام شافعی نے اس سارے مواد اور فقہ حنفی و مالکی کو پیش نظر رکھ کر بہت سے مسائل میں جدید اجتہاد و استنباط کئے۔ ان کی فقہ کا مرکز زیادہ تر مصر رہا ہے جہاں انہوں نے ایک عرصہ مقیم رہ کر وفات پائی۔ ان کا بڑا کارنامہ کتاب الائم کے بعد ائمہ کی کتاب اور سادہ ہے۔ اس رسلے میں انہوں نے اجتہاد و استنباط اور قیاس کے اصول بیان کئے ہیں۔ بعد کے سب فقہاء اس کتاب کی ولایت اور انصیات کے معترف رہے ہیں۔ چوتھا مکتب فکر حنبلی ہے جو مشہور محدث و فقیہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے۔ امام احمد نے عباسی معتزلی علماء و مائتوں مضطرب اور وثائق کے دور میں ان کے ایجاد و کردہ مسئلہ خلق قرآن کے مسئلے میں حکومت کا بڑی پامردی اور استقامت سے مقابلہ کیا اور آخر کار غالب آئے۔ اس بناء پر انہیں امام اہل سنت کہا گیا ہے۔ وہ امام شافعی کے واسطے سے مالکی و حنفی فقہ سے مستفید ہوئے اور ان کا اپنا ایک منفرد مسلک بنا جو حنبلی کہلاتا ہے۔ اس مسلک میں اجتہاد و استنباط کی نوبت کم آتی ہے اور ضعیف حدیث کے مقابلے میں اجتہاد و قیاس نہیں کیا جاتا۔ اس مسلک کو ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے عظیم علماء و فقہاء میں سے انہوں نے اس مسلک کو چار چاند لگائے۔ اور اس اعجاز کو عمل دفع کیا کہ حنبلی مذہب کوئی حقیقی مسلک نہیں ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خلفائے علم الکلام اور اس کا ارتقائے امام راشدین کے عہد میں اسلامی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ جن جن نئے نئے ممالک فتح ہوئے گئے، ان میں اسلامی تعلیمات کچھ تو اپنی سادگی اور فطرت انسانی کے قریب تر ہونے کے باعث اور کچھ حکمران قوم کا دین و مذہب

ہونے کی وجہ سے پھیلتی رہیں اور لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ یہ لوگ اپنے آبائی مذاہب کے بعض عقاید و رسوم اور اپنی تہذیب و ثقافت کے مظاہر سماعتہ لائے۔ اسلام اس معاملے میں خاصا لچکدار دین ہے۔ کہ جب تک کوئی عمل، عقیدہ یا رسم اس کے مبادی و اصول سے نہ ٹکرائے وہ لوگوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ نئے آنے والوں میں عجمی، رومی، مجوسی، پارسی، صابئی، یونانی، ہندو، لاندہب ترک، مالوی، مزدکی، غرض مختلف اقسام و اجناس اور مذاہب و ادیان کے لوگ تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کے اختلاف سے زندگی و اتحاد کی تحریکیں اٹھیں۔ ان اقوام کے غلام اور لونڈیاں شاہی عملات اور امرار کے گھروں کی زینت بنیں۔ لونڈیاں بعض تو اپنے اصل دین پر رہیں۔ اور بعض نے اسلام قبول کر لیا۔ ان سے جو نسل پیدا ہوئی وہ آگے چل کر سیاست و معاشرت پر چھا گئی۔ سہم دیکھتے ہیں کہ خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کی اکثریت لونڈیوں کی اولاد تھی۔ اور کوراور علی بن ابی طالب (یعنی زین العابدین) جو علماء و ائمہ دین میں ایک بلند مقام رکھتے تھے وہ بھی ایک ایسی ذاتی خاتون شہرہ مالو کے بطن سے پیدا ہوئے۔ یہ خاتون خلافت فاروقی میں مال غنیمت میں آئی تھیں۔ اسی طرح کئی ائمہ فقہ و حدیث عجمی و نسل تھے۔ بنی امیہ میں خالد بن یزید بن معاویہ کو یونانی فلسفے، ریاضی، ہیئت اور علم نجوم سے خاصی دلچسپی تھی۔ ابو جعفر منصور عباسی نے یونانی، ہندی، رومی اور عجمی فلسفے اور ادب و ثقافت کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرایا۔ اس طرح مسلمان دیگر اقوام کے علوم و فنون اور حکمت و فلسفے سے آشنا ہوئے۔ سلسلہ چلتا رہا اور مامون عباسی نے اسے بہت وسعت دی۔ اس سنی یونانی، رومی اور عجمی ثقافت و ادب کی سرپرستی میں اپنے سب پیش روؤں کو مات کر دیا۔ مختلف تہذیبوں کے ملاپ، مختلف مذاہب کے میل جول، دیگر اقوام کے علوم کی وسیع اشاعت نے مسلمانوں میں نئے نئے خیالات کی ترویج کی اور بہت سے نئے فرقے پیدا ہو گئے۔ ان میں جبریت، قدریت، کرامیہ، معتزلیہ، خوارج، روافض زیادہ مشہور ہوئے۔ ہر فرقہ بھر کئی اور فرقوں میں بٹ گیا۔ اور ہر طرف مذہبی اور فرقہ دارانہ بحثیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بعض فرقے محض سیاست کی پیداوار تھے۔ مگر روئے آہام سے انہوں نے مذہبی جامہ اوڑھ لیا۔ مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک میں فارسی عنصر کے علاوہ کچھ تعداد یہودی اور کافی تعداد نصاریٰ کی بھی تھی۔ ان لوگوں کے اپنے مدارس تھے۔ اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی روایات تھیں۔ ان کے پاس اپنے مذہبی لٹریچر کا بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ یہودی تو ذرا کم امیز نظر آتے ہیں مگر نصاریٰ مسلمانوں میں گھلے رہتے تھے۔ ان کے

میں مشہور فرستے تھے۔ جن میں ثعلبک، حلولی و اتحاد، مجسم، الوحیت و اہدیت، مسیح پر ہر وقت بحث و مناظرہ جاری رہتا تھا۔ ان فرقوں کے نام یہ ہیں: یعقوبی، فسطوری اور ملکانی۔ مہر و اسکندریہ، شام و فلسطین، نوبہ و حبشہ، افریقہ، اسی، بلیسن، موکل، عراقی اور فارس میں ان کی بڑی تعداد آباد تھی۔ مسلمانوں کا ان کے مناظرات و مباحثات اور فلسفیانہ الہیاتی مسائل سے متاثر ہونا بالکل قدرتی امر تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے متعدد فرقوں کی مانند مسلمانوں میں بھی ذات و صفات، خداوندی، حشر و نشر، روح اور مادہ، جبر و قدر، اور انہی جیسے دیگر فلسفیانہ مسائل میں شدید اختلاف اور نزاع برپا ہوئی۔

عیسائیوں میں سن مسیح کی ابتدائی صدیوں سے اسکندریہ کے مقام پر پر جبید افلاطونیت کے نام سے ایک فلسفی مذہب قائم چلا آتا تھا۔ اس مذہب کے الہیاتی فلسفیانہ خیالات سے بھی مسلمان خصوصاً معتزلہ اور صوفیہ شدید متاثر ہوئے۔ اس مذہب کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے: عالم کی ابتداء کیسے ہوئی؟ عالم قدیم ہے یا حادث؟ روح کی حقیقت کیا ہے؟ جسم کے ساتھ اتصال سے پہلے روح کہاں تھی اور جدائی کے بعد کہاں جاتی ہے؟ اس مذہب میں یونانی شرک و پجنت پرستی کے عناصر شامل ہو گئے اور اس نے عیسائیت کا مقابلہ کیا۔ عیسائیت کے قبلے کے ساتھ ہی اس افلاطونی مذہب کے کچھ لوگ عیسائی ہو گئے اور انہوں نے یہ فلسفہ عیسائی مذہب کا جزو بنادیا۔ اسلام آیا تو مسلمان بھی اس فلسفی مذہب سے متاثر ہوئے جس کی مثال ہمیں اخوان الصفا اور معتزلہ اور بعض صوفیہ کے افکار و مبادی میں ملتی ہے۔

جبید افلاطونی فلسفے کا ترجمہ سریانی زبان میں بھی ہوا اور اسلامی مفسرین و ممالک میں سے گرجا، نصیبین، انطاکیہ اور جندلیس اور اس لٹریچر کے مرکزہ چلے گئے۔ اسی لٹریچر کے ایک بڑے حصے کو عربوں نے عربی کا جامہ پہنایا اور اس طرح یونانی افلاطونی مذہب کے خیالات مسلمانوں میں پھیلے۔ علاوہ ان میں منطق، طبیعیات، طب اور ریاضی کی بہت سی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں اور مسلمانوں میں ان علوم و فنون کا شغف ترقی پذیر رہنے لگا۔ سریانی عنصر میں سے سب سے زیادہ جو لوگ مسلمانوں میں مشہور ہوئے وہ ابن دھیمان اور سر جیس تھے۔ ابن دھیمان ایک نئے مذہب کا بانی بھی تھا جو نصرانیت اور ثنویت کا مخلوط نظر آتا ہے۔ حافظ ابن خزم لے اپنی مشہور کتاب الفصل میں بار بار اس کا ذکر کیا ہے۔ اس سریانی لٹریچر نے بھی مسلمانوں پر گہرے اثرات ڈالے۔ کئی مسلم فرقوں اور صوفیہ میں ان کے فلسفے کی بلاوٹ نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ فارسی و عجمی ادب و شعر

نے مسلمانوں کو کافی متاثر کیا ہے، گویا نافی ادب سے عرب کم متاثر ہوئے۔

اموی اور عباسی خلفائے کئی عیسائیوں کو شاہی طبیب مقرر کیا تھا۔ ان اطباء میں ہمیں ایسے لوگ دکھائی دیتے ہیں جو بیک وقت طبیب اور فلاسفر تھے۔ شاہی محلات میں ان کی اکثر آمد و رفت دہتی تھی۔ امراء اور وزراء بھی ان سے طبی مشورے لیتے تھے۔ اس طرح ان کا سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں پر اثر انداز ہونا قابل تعجب نہیں۔ ان لوگوں میں مشہور تر ابن اثال، عبد الملک بن الجبرکائی اور بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، اور سرخوبہ بہت مشہور غالی رافضی اور باطنی فرقے اپنے مذہبی عقاید میں یہودیت، مجوسیت، جدید افلاطونیت اور بعض نصرانی و یونانی تعلیمات سے بھی شدید متاثر ہوئے۔ ان میں بھی حل و اختار، تجسیم جیسے عقاید پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ابن حزم کی الفحل، شہرستانی کی بلبل والنحل اور احمد امین تھری کی کتب کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ سنی و شیعہ اور خوارج کا اختلاف دیکھ کر ایک اور فرقہ پیدا ہوا جسے مرجئہ کہا جاتا ہے۔ اقول اول یہ بھی ایک سیاسی نظریہ تھا مگر بعد میں خوارج و رافضی کی مانند ایک مذہبی فرقہ بن گیا۔ انہوں نے بھی ایمان، کفر، مومن و کافر کے بارے میں فلسفیانہ نظریات اختیار کر لئے۔ فوجت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے نجات آخرت کے لئے صرف ایمان کو کافی قرار دیا اور کہا کہ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ایمان صرف قلبی اعتقاد کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص دل سے مومن ہے تو بظاہر یہودی و نصرانی یا مجتہد پرست بھی ہو جائے تو بھی نجات پائے گا۔ یہ عقیدہ خوارج کے اس عقیدہ کے بالکل برعکس تھا کہ گناہ کیوں سے آدمی کافر و مرتد اور ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے۔

قدریہ فرقہ جو بالفاظ دیگر معتزلہ بھی کہلایا، اس بات کا قائل تھا کہ انسان پورا مختار ہے۔ اللہ تعالیٰ شر کا خالق نہیں بلکہ شر کی انسان خود تخلیق کرتا ہے۔ اس فرقے کا پہلا بیج معبد جنینی اور غیلان و مشقی نے بویا۔ رافضہ کے عقاید میں بھی قدریہ و معتزلہ کا واضح اثر نظر آتا ہے۔ ان کے بالمقابل ایک دوسرا فرقہ اٹھا جو جبریہ کہلایا۔ ان کے قول کے مطابق انسان مجبور محض ہے، کائنات کا سارا نظام جبر پر قائم ہے، انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اس فرقہ کا بانی جہم بنی صفوان تھا۔ اس نے صفات خداوندی کی نفی کی، قرآن کو مخلوق بتایا، جنت و دوزخ کا ثواب و عذاب دائمی نہیں ہوگا۔ بلکہ ان پر بھی خا خاری ہو جائے گی۔ یہ دونوں فرقے بعد میں ناپید ہو گئے مگر ان کے عقاید و تعلیمات مسلمانوں کے کئی فرقوں میں پھیل گئیں مثلاً معتزکہ و غیرہم۔

معتزلہ کے اولین امام داصل بن عطار اور عمرو بن عبیدہ تھے۔ معتزلہ بھی کی طرح یہ بھی حضرت حسن بصری کے شاگرد تھے۔ لیکن ان کا حلقہ درس چھوڑ کر ملک ہو گئے اور اپنے نئے خیالات (مثلاً یہ کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہے نہ کافر، بلکہ ان دونوں کے بین ہیں) کی اشاعت کرنے لگے۔ ان کا نام معتزلہ اس لئے رکھا گیا کہ یہ لوگ کبیرہ گناہ کرنے والے کو اسلام اور کفر دونوں سے الگ (معتزل) قرار دیتے تھے اور اسی مسئلے پر حسن بصری نے انہیں اپنے حلقہ درس سے نکال دیا تھا۔ ایمان و کفر کے مسائل میں معتزلہ کا مسلک خوارج اور مرجئہ کے وسط میں تھا۔ تاریخ نے ہمیں بتایا ہے کہ مرجئہ و جبریہ کی طرح خوارج بھی آہستہ آہستہ اپنی انتہا پسندی اور خانہ جنگی کے باعث تقریباً ختم ہو گئے، لیکن فرقہ معتزلہ کو عروج حاصل ہوا اور آگے چل کر عباسی دور میں یہ لوگ مشہور فتنہ خلیفہ قرآن کو اٹھانے اور اس کی خاطر وسیع قتل و غارت اور ظلم و تشدد کا سبب ثابت ہوئے۔ انہیں خاص مذہبی عقاید کی بناء پر اٹھویں دور میں بھی سرکاری رکاوٹ یا نارا منگی کا نشانہ نہیں بننا پڑا۔ مگر عباسیوں نے توان کی کھلی سرپرستی کی۔ خلیفہ ابو جعفر منصور کا عمرو بن عبیدہ کا معتقد اور اس کے علم و فضل کا معتقد ہونا انہیں اسلمش ہے۔ بعد کے حکمرانوں میں سے مامون معتصم اور واثق کھلے معتزلی تھے۔ معتزلہ اہل العدل والتوحید کہلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے تھے، انسان کو عتبار مانتے تھے۔ خلق قرآن کے قائل تھے۔ اور مرتکب کبار کو نہ کافر نہ مومن بلکہ بین بین شمار کرتے تھے۔ اٹھویں خلفاء میں سے یزید بن الولید اور آخری خلیفہ مردان بن محمد دونوں معتزلی تھے۔

معتزلہ نے فلسفہ یونان سے استفادہ کیا اور اسے اپنے بحث و مناظرات میں خوب خوب استعمال کیا۔ ان کے عظیم ائمہ میں ابو الہذیل تلاف، نظام اور ابیاحظ زیادہ مشہور ہوئے۔ ان لوگوں نے فلسفہ یونان کو اپنے عقاید کے رنگ میں ڈھال کر ایک نیا فلسفہ ایجاد کیا جسے علم الکلام کا نام دیا گیا۔ اسی علم کلام کے بل پر انہوں نے اپنے مسلم مخالفین کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور ہر سیرے و مجوس کو زیر کیا۔ یہ غیر مسلم اپنے فلسفیانہ خیالات سے مسلم عوام و خواص کے لئے باعث پریشانی تھے۔ انہوں نے اسلام کے خلاف شکوک و شبہات اور اعتراضات کا انبار لگادیا۔ معتزلہ نے ان کا شدید مقابلہ کر دیا مگر مسلمانوں میں بھی افسران و تشدد کا گہرائیچ لویا۔ ان کے خاص عقاید اور فلسفی آراء کے باعث مسلم عوام ان سے متنفر تھے۔ مسلمانوں کا ادب (نظم و نثر) بھی اس فلسفیانہ فرقہ بازی سے متاثر ہوا۔ عباسیوں نے بنی امیہ کا تختہ الٹنے کے لئے جن عناصر سے زیادہ تر کام لیا وہ عجمی تھے۔

انقلابِ حکومت کے بعد ایک طرف عباسیوں اور باشمیوں میں شدید چھٹکش شروع ہو گئی تو دوسری طرف جمعی، ہندسی اور یونانی تہذیبوں نے مسلم عوام و خواص پر اپنے دور رس اثرات ڈالنے شروع کر دیئے۔ عباسیوں نے اپنی ہوشیاری سے باشمیوں کے ساتھ اپنی اندرونی سیاسی کشمکش کو شدید رشتی رنگ دے دیا۔ یوں باشمیوں پر ان کے مظالم (جو وہ اصل بنی امیہ کے مظالم سے کسی طرح کم دیتے) اندہ سب کے پردے میں چھپے رہے۔ جمعی عناصر نے اپنی سیاسی مایوسی و ناراضگی کو فرض و تشیع کے پردے میں چھپا لیا۔ یوں ایک خالص سیاسی جنگ نے "خالص مذہبی" رنگ اختیار کر لیا۔ اموی دور کی فلسفیانہ مناظرہ بازی نے اس دور میں غلبہ ترقی کی۔ فرقہ و منتقل کو پسپا کرنے اور نشوونما پانے کا کھلا موقع ملا۔

اس دور میں علم و فن، تہذیب و ثقافت اور فلسفہ و منطق کی ترقی کے ساتھ اتحاد اور زندگی بھی ایک فترت میں گزری۔ فلسفہ یونان اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔ اور ہر طرف بحث و مناظرہ کی مجالس برپا تھیں۔ بہر اسلامی و غیر اسلامی فرقہ فلسفہ و منطق کے اسلوب سے لیس تھا۔ عالم اسلام کے مرکزی شہر مختلف اور متضاد تہذیبوں کے سنگم بن چکے تھے۔ ان حالات میں اتحاد اور زندگی کا کھلا نظریہ قابلِ تعجب نہیں تھا۔ ابوالعلاء مرقی نے اپنے رسالہ الفخران میں کئی شعراء و ادباء، سیاستدانوں، حکومت کے عہدیداروں اور صوفیوں کا نام زندہ و متواتر میں شمار کیا ہے مثلاً و حبل شاعر، بشار بن برد، ابوالواس، صلح بن عبدالقدوس، ابو مسلم خراسانی (دولت عباسیہ کا اصل بانی، ہاک خرمی، افشین اور حلاج صوفی۔ مرقی کی اس فہرست میں ہر نام کے ابن المقفع اور کئی دوسرے لوگوں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

اسلامی ثقافت کے ہندسی ثقافت کے ساتھ میل جول کے باعث کئی مسلم فرقوں میں ہندوؤں کے فلسفیانہ عقاید کا اثر نظر آتا ہے۔ مثلاً احمد بن حنبل، ابو مسلم خراسانی، قرطبی، ابن زکریا و زہری تنازع ارواح کے قائل تھے۔ بہت سے شیعہ فرقے جن کا ذکر ابن خزم اور شہرستانی نے کیا ہے۔ تنازع ہمایمان رکھتے تھے۔ عبداللہ بن سبائہ یہودی کا بھی — جو اس دور سے پہلے ہو چکا تھا، تنازع پر قوی ایمان تھا، نصیر یہ فرقہ بھی تنازع کا قائل تھا۔ جریر بن حازم ازہری ہندوؤں کے سونائی فرستے جیسے عقاید رکھتا تھا۔ مختار بن عبید تقفی نے یہود کا عقیدہ بداء اختیار کر لیا تھا۔ اس کے بعد اہل تشیع کے کئی اور فرقے اس کے قائل رہے ہیں معلوم رہے کہ نسخ جو ہمارے ہاں بعض احکام میں ہوا ہے اس کا باعث بداء نہیں تھا۔ بداء کا عقیدہ موجود بیل کی پہلی کتاب میں طوفان فوج کے سلسلے میں یوں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کا شرک و کفر دیکھا تو وہ تخلیق آدم پر کھنسا یا اور اپنے پہلے فیصلے بدل ڈالے۔ اسی طرح

رجعت کا عقیدہ جو یہود و نصاریٰ میں مشہور ہے یہ بھی بعض مسلمان فرقوں — مثلاً غالی شیعوں — نے اختیار کر لیا۔

خلق قرآن جو معتزلہ کا مشہور عقیدہ ہے اس کی تاریخ علامہ ابن الاثیر نے یوں بیان کی ہے کہ امام محمد بن ابی داؤد (جو مامون کا قاضی القضاۃ تھا) نے خلق قرآن اور معتزلہ کے دیگر عقاید بشری سے حاصل کئے، بشر نے جہم بن صفوان سے (جس کا ذکر ادب پر گزرا) جہم نے جعد بن درہم سے، جعد نے ابان بن سحائس سے، ابان نے طاووت سے جو لبید بن اعصم کا بھانجا اور داماد تھا، طاووت نے یہ عقیدہ لبید بن اعصم یہودی سے لیا جو خلق تورات کا قائل تھا اور جس نے بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا۔ ابن عبد ربیع نے العقد الفرید میں امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ امام معتزلہ کا عقیدہ یہود کے عقیدہ مسیح مناظر سے ماخوذ ہے۔ علی بن ابی طالب نے ان غالی ردیوں کو آگ میں جھونک دیا تھا۔ لیکن جبرٹ ہے وہ انہیں خدا تک ماننے سے باز نہ آئے۔ یہود کے نزدیک مسیح منتظر کے خروج تک جہاد فی سبیل اللہ منقطع ہے یہی عقیدہ غلاوہ و افاض کا بھی ہے کہ جب تک امام مہدی منتظر نہ خروج کرے جہاد فی سبیل اللہ بند ہے۔ اسی طرح یہود کی مانند غلاۃ بھی تحریف قرآن کے قائل ہوئے ہیں۔ یہود نے جبریل کو اپنا دشمن قرار دیا تھا ان غالی و افاض نے بھی کہا کہ جبریل غلطی سے وحی غلطی کے بجائے محمد پر لاتا رہا معاذ اللہ منہ علی هذا القیاس خدا کے ساتھ مخلوق کی تشبیہ کا عقیدہ بھی یہود سے بعض مسلمان فرقوں میں داخل ہوا۔

یہود کی مانند نصاریٰ بھی بعض مسلمان فرقوں پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یونانی فلسفے کے ماہر تھے۔ اور انہوں نے یونانی و رومی ثقافت، اور مشرک مذاہب سے متاثر ہو کر شکیست و تبہیم، حلول و استحار، اہلیت والوہیت مسیح کے عقاید اختیار کر لئے تھے۔ اسکندریہ، شام و عراق اور فلسطین میں ان کے کئی مدارس موجود تھے۔ جن میں طب و نجوم کے علاوہ فلسفہ ریاضی، منطق و حدیث کی تعلیم ہوتی تھی۔ فرقہ معتزلہ اپنے قدرتی عقاید میں نصاریٰ سے متاثر ہوا ہے۔ اسی طرح صفات الہیہ کے مسائل میں بحث و تجسس بھی ان میں اسی راہ سے داخل ہوئی۔ اسی طرح بعض صوفی فرقوں میں رعبانیت کے رجحان کا بفتح بھی نصراہیت تھی۔

اس تمام گفتگو کے بعد قاری کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہو گا کہ اموی و عباسی سلطنت میں فلسفی و منطقی علوم کی اس شہرت، و اشاعت، ماننے والے فرقوں کے ظہور معتزلہ وغیرہ کی ان ترکنہ نیوں سے کیا عامرہ اصل اسلام بے خبر تھے؟ مسلمانوں میں ہمیشہ اہل سنت و جماعت کی عظیم کثرت رہی ہے ان کے علماء دائمہ کیا کہتے رہے؟ اس کا جواب بڑا آسان

ہے۔ علمائے اسلام نے دینی علوم — تفسیر، حدیث، فقہ، اصول تفسیر، اصول حدیث اور اصول فقہ — کو مرتب کیا۔ مدارس و جماعات میں ان کی تعلیم دی۔ جہاں ضرورت پیش آئی دوسرے فرقوں سے بحث و مناظرہ بھی کیا۔ بڑے بڑے ائمہ فقہ خود متکلم ہوئے ہیں۔ مثلاً امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت نے علم فقہ کی طرف توجہ کرنے سے قبل علم کلام و عقائد میں مہارت حاصل کی۔ ان کے علاوہ دوسرے اکثر مجتہدین کلامی مسائل سے پوری طرح آشنا تھے مگر انہوں نے مختصر اور دیگر فرقوں کی مانند سارا زور صرف بحث و جدل پر صرف نہیں کیا بلکہ اس کی طرف بلا ضرورت کم ہی توجہ کی۔ ویسے ہم تفاسیر میں مختصر کا رد بڑی تفصیل سے پاتے ہیں۔ اسی طرح علم عقائد پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کی فرست بہت طویل ہے۔ کلامی مسائل پر زیادہ تر کلام ہمیں امام ابوالمعالج اشعری، امام ابوالمصنوع ماتریدی، امام غزالی، امام ابن عساکر اندلسی اور علامہ عبدالحکیم شہرستانی کے ہاں ملتا ہے۔ امام غزالی نے بھی اس سلسلے میں خاصا ضخیم کام چھوڑا ہے۔ آخر میں سیم علامہ ابن عابدون کے مشہور مقدمہ تاریخ سے علم الکلام پر ایک جامع مگر مختصر نوٹ پیش کرتے ہیں (محض بطور خلاصہ)

علامہ لکھتے ہیں کہ علم الکلام سے مراد وہ علم ہے جس میں دینی عقائد کا اثبات اور بدعتی فرقوں کا رد عقلی دلائل سے کیا جاتا ہے۔ بدعتی وہ لوگ ہیں جو عقائدات میں سلف صالحین اور اہل سنت کے طریقے سے منحرف ہو گئے تھے۔ دین کا سب سے بڑا بنیادی عقیدہ توحید ہے۔ بدعتی فرقوں نے یہود و نصاریٰ اور دیگر مذاہب باطلہ سے متاثر ہو کر اسی عقیدے میں گڑبڑ کی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور اک میں عقل و ذہن حیران ہو جاتا ہے۔ وہ ذات اعلیٰ و برتر کو اپنی صفات و افعال سے دنیا و کائنات کے ذرے ذرے سے ظاہر و ہویا ہے مگر انسانی حواس کی گرفت سے بالاتر ہے۔ ہماری عقل رہنمائی کرتی ہے کہ دنیا کی ہر چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ہے۔ ہم ایک سبب سے دوسرے پھر تیسرے تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ جب دینی و دنیوی اسباب کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو لازماً ہمارے دریافت کے ہوئے آخری سبب کا بھی کوئی اور سبب ہو گا اور پھر ان تمام اسباب کا ایک مسبب ہونا لازم ہے جو از خود موجود ہو حتیٰ و قیوم ہو اور کسی دوسرے خالق کا محتاج نہ ہو۔ پیغمبروں نے اس سے آگے بحث و تمحیص سے منع کر دیا کیونکہ کوئی فلسفہ یا سائنس ہمیں اس سے آگے نہیں لے جا سکتی۔ ہاں؛ پیغمبروں کا صدق و امانت، ان کا علم و عمل اور تقویٰ مان لینے کے بعد منزل آسان ہو جاتی ہے۔ جو بات ہماری عقل سے بالاتر ہو اسے پیغمبروں کے بھروسے پر مان لیا جائے۔ توحید الہی کی مانند رسالت، آخرت، بعثت بعد الموت، حشر و نشر، عذاب و ثواب قبر اور جنت و

دفعہ ایسی چیزیں ہیں جن کے اور اداک کو کوئی مادی ذریعہ نہیں۔ یہاں لازماً اس علم و فن کے ماہرین — انبیاء و رسل پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ جو باتیں ہماری عقل و فکر سے بالاتر ہوں ان کا خلاف عقل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اسلامی عقاید مشاہدے اور حس کے خلاف نہیں ہیں نہ عقل سلیم کے خلاف ہیں۔ ساری دنیا سے زیادہ عاقل و فہیم نبی اور رسول ہوتے تھے۔ ان کی عقل و فہم ان کی کتابوں، تعلیمات، اقوال و افعال اور انسانیت کی صلاح و فلاح کے لئے کی گئی ان کی خدمات سے ظاہر و باہر ہے۔ پس جو بات ایک کمزور عقل والے کی سمجھ میں نہ آئے وہ اسے اپنے سے اعلیٰ تر عقل والے سے سن کر مان لے تو نہیں کہا جائے گا کہ اس نے خلاف عقل بات مانی ہے۔

فلسفہ یونان کی نشر و اشاعت اور غیر مذہب والوں سے میل جول کے باعث بہت سی خلاف اسلام باتیں مسلمانوں میں رائج ہو گئیں۔ بہت سے بدعتی فرستے پیدا ہو گئے۔ ان کا رد کرنے کے لئے علماء اسلام نے اپنی ہتھیاروں سے کام لیا۔ جن سے وہ باطل پرست متسلح تھے۔ یہ ہتھیار اسلام کی سان پر چڑھ کر اور بھی تیز اور کارآمد بن گئے۔ علماء اسلام نے صفات خداوندی کا مسئلہ اپنی دلائل و براہین سے ثابت کیا جن کو اسلام کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا۔

صفات خداوندی کے مسئلے میں وارد ہونے والی بعض آیات، واحادیث متشابہان میں داخل تھیں۔ انہی کو گمراہ فرقوں نے اپنی فطانت کے ثبوت میں پیش کیا جیسا کہ کلمۃ اللہ، روح اللہ وغیرہ کے الفاظ سے اور عیسیٰ کی بن باپ، پیدا کس سے نصاریٰ نے انبیت و الوہیت مسیح کا استدلال کیا تھا۔ حالانکہ رب اللہ، تاقۃ اللہ، کتاب اللہ، لقیۃ اللہ کے الفاظ اس کی صحیح تشریح میں کافی ہیں۔ اسی طرح آدم کے بارے میں: وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ کا لفظ موجود ہے۔ اور آدم کی بلا والہین پیدا کس پر سب کا اتفاق ہے۔ پس علماء اسلام نے عقلی دلائل سے نقلی مسائل کو ثابت کیا اور ضلالت زدہ لوگوں کے شکوک و شبہات اور اعتراضات کو رد کیا۔

خود قرآن و حدیث میں اسلامی عقاید کا عقلی اثبات موجود تھا۔ جس سے فہما د کو جرات پیدا ہوئی کہ مخالفین کے رد کے لئے خود انہی کے فلسفے کو استعمال کریں۔ آئمہ سلف نے ان آیات متشابہات پر گفتگو نہیں کی تھی لیکن جب گمراہ فرستے اٹھے اور انہوں نے عقلی دلائل سے اپنے مذموم مقاصد پر سے کرنے کی کوشش کی تو علم الکلام و العقائد ایجاد ہوا کہ تاکہ دشمن کا جواب اس کے دلائل و شواہد اور فلسفے اور منطق سے دیا جائے۔

امامت کا مسئلہ جن محنوں میں گمراہ فرقوں نے پیش کیا وہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔
لیکن چونکہ بہت سے اہل بدعت مثلاً اخباریج، دوافض اور معتزلہ وغیرہ اس پر بحث، ومنظرہ
کرتے تھے لہذا علم عقائد کی کتابوں میں اس پر بھی مفصل اور مدلل بحثیں کی گئیں۔ علم کلام کے
امام ابو الحسن اشعری، قاضی ابوبکر باقلانی، امام الحرمین ابوالحسن علی، امام ابوالعلاء الغزالی، ابن
الکثیر وغیرہ تھے۔

علامہ ابن عسکرون کی فہرست میں امام ابوالحسن ماتریدی اور امام طحاوی حنفی کا باستانی
اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور نام ہم نے اوپر گنوائے ہیں۔

تصوف اور اس کا نشوونما جس طرح فلسفے کی دو قسمیں ہمارے اوپر کے بیان سے واضح
ہوئیں، ایک اسلامی فلسفہ جو علم الکلام والفقائد کے نام سے
ہوا اور دوسرا غیر اسلامی فلسفہ مثلاً یونانی فلسفہ، ایرانی فلسفہ، ہندو فلسفہ وغیرہ۔ اسی
طرح تصوف کو بھی دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ پہلی قسم خالص اسلامی تصوف
ہے۔ جو حدیث نبوی میں وارد ہونے والے لفظ احسان سے ثابت ہے۔ اس کو غلو ص و
تقویٰ، حب فی اللہ اور شرع محمدی پر چلنے کا طریقہ۔ طریقت و حقیقت۔ کا نام بھی دیا جا
سکتا ہے۔ پہلے تصوف نے مسلمانوں میں رعبانیت، اتحاد اور باطنیت پھیلانی اور اس کے
بطن سے کئی جدید فرقے پیدا ہوئے۔ دوسرا تصوف، کتاب و سنت پر عمل کرنے والوں کا ہے۔
اس نے مادہ پرستی، محبت دنیا، خواہشات نفس کا اتباع اور بیوقوفوں سے درآمد ہونے والے
غیر اسلامی عقائد و اعمال کا شدید رد کیا۔

تصوف کا لفظ کتاب، و سنت یا آثار صحابہ و تابعین میں ہمیں نہیں ملتا۔ اس کا مادہ
مصفا یا صفتہ بنایا گیا ہے مگر اس صورت میں لفظ کی شکل کچھ اور ہونی چاہیے تھی۔ دراصل یہ
لفظ صوف (یعنی آدن) سے ماخوذ ہے۔ صوف اہلبار، صحابہ، تابعین اور صلحاء کا
لباس رہا ہے۔ صوفی چونکہ صرف کا لباس پہنتے اور سادہ زندگی گزارتے تھے۔ لہذا وہ
صوفی کہلائے اور اس سے لفظ تصوف بنایا گیا۔ حدیث جب جلیل میں حضور نے احسان کی
تعریف یوں فرمائی ہے :

”احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اتنے خلوص اور عاجزی سے کرے گویا اللہ کو سامنے
دیکھ رہا ہے کیونکہ اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو دوتو تجھے دیکھتا ہے“ گویا حضور قلب، خلوص
خشوع و خضوع اور استغفار کے ساتھ عبادت۔ کا نام احسان (بالفاظ دیگر تصوف) ہے۔
یہی باعث تھا کہ اصلی صوفیوں۔ مثلاً خواجہ حسن بصری، جنید بغدادی، بایزید بسطامی

عبدالقادر جیلانی، شہاب الدین سہروردی اور بہاؤ الدین نقشبند نے تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب و روح کو تصوف اور مغز شریعت قرار دیا ہے۔ ہر عظیم ہندو پاکستان میں بڑے بڑے صوفیاء و علماء گزرے ہیں جنہوں نے اسلامی تعلیم و تربیت کا فریضہ سرانجام دیا۔ اشاعت اسلام میں ان لوگوں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف کے علاوہ یہاں شیخ احمد سرسہندی، خواجہ باقی باللہ دہلوی، علی بن عثمان ہجویری، بابا فرید جیسی قدامت شخصیتیں نظر آتی ہیں جو اسلامی شریعہ اور دینی علم و عمل کی علمبردار تھیں۔ شیخ احمد سرسہندی تو بہر حال مجدد الف ثانی تھے۔ اور ان کا کارنامہ تجدیدِ رواد و اہل باطنیت اور اصلاح تصوف کو محیط تھا۔ مگر شاہ ولی اللہ کے علاوہ اس ملک میں صحیح اسلامی تصوف کے علم برداروں میں ہمیں سید احمد شہید رائے بہلوی، سلطان الاولیاء خواجہ نظام الدین دہلوی، خواجہ معین الدین چشتی، شیخ بہار الدین زکریا ملتانی، سید جلال الدین بخاری جیسے بزرگوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔

اسلام میں ہندوؤں کے وحدت الوجود، لوگ اور ربیائیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ کتاب و سنت کی تعلیمات اس ضمن میں بالکل واضح اور صریح ہیں۔ صوفیوں میں ہمیں تیسری صدی کی ایک مشہور متنازعہ فیہ شخصیت حسین بن منصور حلاج کی ملتی ہے۔ ان کی کتاب "طواسین" سے ان لوگوں کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ جنہوں نے حلاج کو شعبہ باز، جادوگر اور باطنی فرستے کا داعی قرار دیا ہے۔ اسی جرم میں اسے قتل بھی کیا گیا۔ احمد ابن مصری کی تحقیق کے مطابق حلاج نے ہندوستان کا سفر کیا اور جادو کی تعلیم حاصل کی۔ امامبر کے مرکز حکم کی زیارت کی اور اپنے آپ کو امام منظور کا دیل قرار دیا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی گیا زندہ و احوال کی تہمت اس کے ساتھ ساتھ گئی۔ شیعہ امامیہ کے باطنی فرستے کی دعوت کو پھیلانے کے لئے اس نے کئی سفر اختیار کئے تھے۔ مگر حیرت ہے کہ شیخ فرید الدین عطار اور مولانا جلال الدین رومی جیسے صوفی بزرگوں نے حلاج کی طرف سے یہ معذرت پیش کی ہے کہ غلبہ شوق اور وجد و شکر کی حالت میں خلاف شرع الفاظ اس کی زبان سے نکل گئے تھے۔ ان کی اگر تائید کی جاتی تو بہتر ہوتا۔ لیکن ان حضرات کی دلیل اگر تسلیم کر لی جائے تو مسلمانوں کے مسئلہ متشرع صوفیوں — بانیہ بطائی اور جنبہ بلخاؤی — سے بھی وجد و شوق اور شکر کی حالت میں بعض خلاف شرع الفاظ کا صدور ثابت ہوتا ہے۔ پھر کیا سبب ہے کہ ان حضرات کو نہ تو ملحد و زندقہ قرار دیا گیا اور نہ ان کے قتل کا فتویٰ صادر کیا گیا؟ حلاج کی طرف طواسین کے علاوہ نصف درجن کے قریب کتابیں منسوب ہیں مثلاً

کتاب العدل والموتیہ، علم البقاء والبقاء، کتاب طوق وغیرہ۔ ان کتابوں میں حلول و اتحاد اور توحید و یگانگی جیسے ہندو دھرم اور ملحدانہ خیالات پائے جاتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے یکسے خلاف ہیں۔ جس شرک کے رد اور جس توحید کے اثبات کے لئے لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتابیں انباری گئیں۔ بے پناہ تکالیف و مصائب پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں پر آئے، بے شمار انسان قتل ہوئے۔ کیا وہ شرک کا رد اور وہ توحید فرکان و حدیث سے اخذ کی جاتے گی یا ان کتابوں سے جن میں حلول و اتحاد اور وحدت، اویان کی تعلیم پائی جاتی ہے؟ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم توحید تو بالکل صاف اور واضح ہے۔ اس میں ہمیں ان عقاید و اوہام کے رد کے سوا اور کچھ نہیں ملنا جو حلاج کی طرف منسوب ہونے والی کتب میں درج ہیں۔

شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی کی شخصیت اور ان کا تصوف و حکمت بھی مسلم علماء و فقہاء بلکہ خورشید بہار میں بھی غنا و غفرہ پہلے آتے ہیں۔ ان کی تصانیف، فتوحات مکیہ اور خصوص الحکم برہے گہرے رموز و کنایات، اور دقیق و غامض خیالات سے پُر ہیں۔ ان کے خلاف جس مسئلے کے باعث سب سے زیادہ شور و غل اٹھا وہ ان کا وحدت الوجود کا مسئلہ ہے۔ یہ کوئی اسلامی مسئلہ نہیں۔ کتاب و سنت اور انبار صحابہ و تابعین کے علاوہ علم عقائد و کلام کی کتابوں میں توحید الہی کا جو صاف اور واضح بیان ہے۔ یہ مسئلہ اس کے یکسر خلاف جاتا ہے۔ اس مسئلے کا وجود ہمیں ہندو تعلیمات میں ملتا ہے۔ اور علمائے اسلام نے اس کا ہمیشہ کھلوا کر کیا ہے۔ ابن عربی کا رد کرنے والے علماء، فقہاء اور محدثین میں ہمیں حافظ ابن تیمیہ، علامہ ابن خلدون اور امام بن حجر عسقلانی کے چمکدار نام بھی نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف ان کی طرف سے معذرت کرنے والے اور کھینچ تان کر بندرینہابی ابن عربی کے خیالات، اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنے والے حضرات ہیں امام فخر الدین رازی اور علامہ جلال الدین سیوطی کے بڑے بڑے نام بھی ملتے ہیں ایک بات تو بالکل واضح اور ناقابل انکار ہے کہ ابن عربی نے رموز و کنایات کی فلسفیانہ زبان استعمال کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا ہے۔

ہمارے ناقص خیال میں اسلامی تصوف کا مقصد مادہ پرستی اور نفس پروری کی مخالفت، باطن کا تزکیہ، اخلاق و آداب کی صفائی، دنیا پرستی سے گریز اور دوزخ و صحابہ کی اسلامی سادگی کا اجبار تھا۔ مسلم سلطنت کے وسیع و عریض سوجانہ نہیہ مسلمانوں میں عیش پسندی اور دنیا سے رغبت پیدا ہو گئی۔ اس کا مقابلہ کرنے کی خاطر صوفی حضرات

نے نامہادہ زندگی اختیار کی اور اسی کا درس دیا۔ عوام کے باطنی تزکیے کی خاطر انہوں نے آداب کیوں سے دریا سے پڑاؤ رکھے اور نہ انہا میں بنائیں جن میں اپنے شاگردوں اور مریدوں کو اپنی زیر نگرانی رکھ کر شوقِ آخرت، حبِ خداوندی، حبِ رسول اور پاکیزگی عقیدہ و عمل کی مشق کرائی۔ پھر ان شاگردوں کو دور دراز علاقوں میں تبلیغِ دین اور تربیتِ عوام کے لئے روانہ کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی عوام کو دھوکہ دینے اور اپنے خلاف اسلام مقاصد کی خاطر کچھ دوسرے لوگوں نے تصوف کا جامہ اڑھ لیا۔ عوام ان لوگوں کی دسیبہ کاریوں سے ناواقف تھے، انہوں نے پھلکے کو مغز سمجھ لیا اور کچھ لوگ ان جھوٹے صوفیوں کے ہمرنگ بن جال میں چھنس گئے۔ دین کی اصل اور بنیادی تعلیمات محفوظ رہیں اور رہیں گی لہذا ہر دور میں ان جھوٹے تدعیان تصوف کو بالعموم وہی مقام حاصل رہا جس کے وہ دراصل حقدار تھے۔ آخر میں ہم صحیح صوفیوں کے کچھ نام پیش کرتے ہیں: اُدیس قرنی، حسن بصری، مالک بن دینار، ابراہیم بن ادیم، شعیب ثعلبی، رابعہ بصریہ، معروف کرخی، جنید بغدادی، سمرقانی، ابوسلمہ دارانی، دوالنون مصری، سہیل تہجدی، ابومعین بدستامی، ابوبکر شبلی، امام غزالی ابن تیمیہ، ابن القیم، سید عبدالقادر جیلانی، عمر بن عبد اللہ سہروردی، ابوالحسن شاذلی، جلال الدین رومی، عبدالوہاب شمرانی، سید عبدالعزیز دہلوی، برصغیر پاکستان و ہند کے مشہور صوفی بزرگوں کے نام اوپر گزرنے لگے ہیں۔

تجدید و احیائے دین کی تحریکیں **اسلام اللہ تعالیٰ کا دائمی و کامل دین ہے جسے خاتم النبیین**
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پانچ تکمیل تک
 پہنچایا گیا۔ اب ہدایتِ رہبان کے لئے کسی جدید پیمانہ کی ضرورت نہیں۔ زندگی ہر دم رواں دواں اور متحرک عمل کا نام ہے۔ انسان نے بے شمار مادی انکشافات و ایجادات کی ہیں اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔ مبرور و اور ہر ملک میں انسانی تجربہ پر ضروریات کا ساتھ دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فتنہ و تجدید کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ فقہاء و مبرورین اپنے اجتہادات کے ذریعے زندگی کی ضروریات پوری کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ باطل قوتیں شروع سے ہی پورے ساز و سامان اور پورے عزم و حزم کے ساتھ اسلام پر حملہ آور رہی ہیں۔ دین حق کو مینہ پھونکنا کھانا بنانے کی ہر دور میں کوشش ہوتی رہی ہے۔ اس امت میں اللہ تعالیٰ نے بدعات و ایجاد کی طاقت سے دین کو پاک و صاف رکھنے کے لئے دربابِ عزیمت و تجدید کی موجودگی کا اہتمام فرمایا ہے۔ یہ شجاع انسان جذبہ حق سے محور تھے اور بڑی ہی ہمت اور صبر و استقامت کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے رہے ہیں۔

احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک برس سرتی جماعت کی ہمیشہ موجودگی کی خبر دی ہے جو باطل سے لڑتی اور غلبہ پاتی رہے گی۔ یہ بھی فرما دیا ہے کہ ہر قرن میں (ہر صدی میں) مجتہدین ملت دیں کہ ترمذی، شافعی اور سرسبز و شاداب رکھنے کی سعی کرتے رہیں گے۔ اس جماعت کے افراد میں مفسرین، محدثین، فقہاء، صوفیاء، مشککاتین اور ارباب سیف و قلم میں ہر زمانے اور ہر ملک میں اپنا فریضہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاریخ ان کے کارناموں سے مزین ہے اور امت نے ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اس عنوان کے تحت ہمیں احیائے اسلام کی کوششوں اور تجدید دین کے زندہ جاوید کارناموں کا مختصر تعارف کرنا ہے۔ تجدید و احیاء کا کام اشخاص انفرادی طور پر بھی انجام دیتے رہے ہیں اور منظم جماعتیں بھی۔ عموماً ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک قدادور اور صاحبِ عزم و استقلال شخصیت اٹھتی ہے اور اس نے تاریخ کا وسار ابدل دیا ہے۔ اس کی زندگی ہی میں یا اس کے بعد اس کی آواز ایک زندہ تحریک بن گئی ہے اور اس سے الحاد و بے دینی اور بدعت و شرک کا بھار جھٹکا و جسد ملت سے الگ کر کے پرے چھینک دیا ہے۔

اس قسم کی پہلی تحریک خلیفہ راشد عمر ثانیؓ عبدالحی بن اموی کی ذات والا صفات میں ظاہر ہوئی۔ انہوں نے ظلم و ستم، دولت پرستی، خاندانی تقوق، جنبہ واری، اقربا پروری، بنی امیہ کے خاندانی شاہی حقوق، خوشامد پرستی، امرار و خلفاء کی بے جا مدح سرائی، عربی و غیر عربی کی تفریق، اموی و یاشمی رقابت غرض ہر اس چیز کا قلع قمع کیا جسے دور نبوی اور دور خلافت راشدہ کے خلاف پایا۔ اسلامی علوم و معارف بالخصوص حدیث کی سرپرستی کی اور اسے سرکاری نگرانی میں ملازمت کرانے کا اہتمام کیا۔ غیر مسلموں پر جو زیادتیاں حکام اور ”شاہی خاندان“ کے افراد کی طرف سے ہوتی تھیں انہیں ملایمیت کیا۔ تبلیغ و اشاعت اسلام کا انتظام کیا۔ اسلامی سادگی کا احیاء کیا اور اس کی ابتداء اپنی ذات اور اپنے گھر سے کی۔ زندگی کا کوئی گوشہ، سعادت کا کوئی حصہ، رعایا کا کوئی طبقہ ان کی اسلامی اصلاحات سے فیض یاب نہ ہوئے بغیر نہ رہا۔ اگر سازش سے انہیں زہر نہ دلوادیا جاتا اور ان کی عمر طویل ہوتی تو تاریخ ہمیشہ کے لئے مختلف ہو جاتی۔ بنو امیہ کا یہ فرزند اپنی برادری کی پھیلائی ہوئی بہت سی بدعات میں ایک، روشن سورج کی طرح تاریخ کے صفحات پر چمک رہا ہے۔ کاش بنو عباس بھی اس طرح کا کوئی انسان منصف شہود پر لا سکتے!

عمر ثانی کی وفات کے بعد حکومت و سیاست ایک دفعہ پھر دور جاہلیت کی طرف لوٹ گئی۔ تابعین کی مقدس جماعت نے سرمایہ سرپرستی اور پیش پسندی کی وہار کا راستہ

روکنے کی پوری کوشش کی مگر یہ سیلاب امنڈنا ہی چلا گیا۔ اس سبیل بے پناہ کے لئے نیند باندھنے میں جس شخص نے سب سے بڑھ کر اپنی علمی و عملی صلاحیتوں کو کھپا یا وہ حسن بصری کی قد آور شخصیت تھی۔ وہ علم و فضیلت اور تقویٰ و خلوص کا پیکر تھے۔ اولیاء اللہ کے تقرباً سارے مسئلے انہی تک ملتے ہوئے ہیں۔ وہ بیک وقت مفسر، متکلم، فقیہ، محدث، واعظ، صوفی، مدرس اور بے نظیر خطیب تھے۔ ان کے خطبے آگ لگا دینے، زبان شعلے اُگتی، و عطر سٹھنے والے تڑپتے رہ جاتے۔ ان کی فصاحت و بلاغت، اور طرز بیان مثالی تھا۔ کیوں نہ ہو انہوں نے ام المؤمنین اُم سلمہؓ کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ اور ان کی گود میں پلے تھے بعض دفعہ المؤمنین کا رودھ بھی چوسا تھا۔ شاید اس پاک دودھ کے کچھ قطرے حلق سے اُتر گئے ہوں جن سے ان کی زبان و بیان سیفِ قاطع بن گئی تھی! انہوں نے اپنے حلقہ درس میں بڑے بڑے فقہاء و محدثین اور علم و فن کی سرشاخ کے ائمہ کی تربیت کی تھی۔ حسن بصری زہد و تقویٰ اور خلوص اسلامی کا پیکر تھے۔ انہوں نے وقت کی پھیلتی ہوئی مادہ پرستی پر بڑی زوردار ضربیں لگائیں۔ سادگی، بے تکلفی، دنیا کی بے ثباتی اور دارِ آخرت کا شوق، یہ تاثرات ان کی مجلس میں آنے والا ہر شخص ساتھ لے کر جاتا تھا۔ وہ تمثیل و محاوروں کی زبان میں حکومتِ وقت کی بے راہ روی اور حکام کی بے لگامی پر چڑھیں کیا کرتے تھے۔ عوام ان کے عاشق و دلدار تھے۔ ان کی ہر دل عزیزِ مری اور بے لاگ تنقید سے اموی حکومت کا نپ کانپ جاتی تھی۔ حتیٰ گوئی و بے باکی ان کا شعار تھی۔ صوفیوں کے سبھی خاندانے حسن بصری کو تاریخ اسلام کا پہلا صوفی۔ یعنی بعض صحابہؓ مثلاً ابو ذر غفاریؓ کے بعد۔ قرار دیتے ہیں مگر افسوس ہے کہ بعد کا تصوف کچھ گدلا ہو گیا تھا۔۔۔ بھلا وہ کتنے صوفی تھے جنہوں نے بائستنا سے چند اتنی بلند آہنگی اور بے خوفی سے حکامِ وقت کی بے راہ روی پر کھلی تنقید کی تھی؟ اور اپنے گرد مردانِ کار کا ایسا بے مثال حلقہ تیار کیا تھا جس میں ہر علم و فن اور ہر طبقہ کے لوگ زیرِ تربیت رہتے تھے؟

اس کے بعد عباسی دور آیا، بنی امیہ کی سلطنت کو زوال آ گیا اور کئی تختیاں ابھار کر اور قسم قسم کے عوامی دلچسپی کے نعرے بلند کر کے حکومت کو تو بدلا دیا گیا مگر اب نینمی حکومت اموی دور سے بھی گئی گوری تھی۔ موردِ فی بادشاہت قائم ہو چکی تھی۔ افرادِ حکومت میں ہاشمی ہونے کے علاوہ کوئی خاص خوبی نہ تھی، بلکہ ہیں اموی دور کے بعض حکمران ان سے بدتر جہاں بہتر نظر آتے ہیں۔ بنی امیہ کو جن جن کو ختم کر دیا گیا تھا۔ مقابلے میں علویوں کے سوا کوئی مددِ حکومت نہ رہا تھا۔ مگر انہوں نے بھی اصلاح احوال کی صحیح کوششوں کے

بجائے فرقہ بندی کا سہارا لے کر انقلاب لانا چاہا اور اس میں کمی بار کا کام ہوئے۔ مادہ پرستی، عیش پسندی، سرمایہ داری زوروں پر بھتی۔ ان حالات میں سہیں چند مردان با صفا کی صوفی جماعت کے افراد نظر آتے ہیں جن کا ہدف صحیح تھا اور تنقید ذاتی اغراض سے بالاتر تھی۔ یہ جماعت سفیان ثوریؒ، فضیل بن عیاضؒ، معروف کرخؒ اور بشیر حافیؒ پر مشتمل تھی۔ انہوں نے اپنی خدا ترسی، زہد و اتقا، ایشاروں بے غرضی، بے لوث خدمتِ خلق اور بے لاگ آوازہ حق کے ذریعے حق کی شمع روشن رکھی۔ سفیان ثوریؒ صوفی با صفا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم محدث اور بڑے قدآور فقیہ بھی تھے۔ حکومت اور بابِ حکومت کو کبھی خاطر میں نہیں لائے۔ قال اللہ وقال الرسولؐ سے کام تھا۔ بے شمار لوگ ان سے فیض یاب ہوئے اور اونچے طبقوں کی آوارہ مزاجی اور رنگینی طبع کے باوجود حق کا بول بالا رہا۔

امام ابو حنیفہؒ اور مالکؒ ابن انسؒ اپنی ذات میں ایک تحریک تھے۔ انہوں نے آزادانہ کسی حکومت کی سرپرستی و نگرانی سے بے نیاز رہ کر اسلام کا نظام قانون مدون کیا۔ کئی بار حکومتِ دقت سے ٹکری ہوئی مگر یہ بزرگ نہ جھکے۔ امام مالکؒ کی فقہ مغربی ممالک — افریقہ و اندلس — کا قانون بنی تو امام ابو حنیفہؒ کی فقہ نے عباسی سلطنت کے نظام قانون اپنے زیر اثر لے لیا۔ دونوں بزرگوں نے شاگردوں کی عظیم جماعتیں قائم کیں جو زہد و تقویٰ، خدا ترسی، علم و عمل اور صفائے باطن کی سلطنت کی۔ امام بنیں۔ ان میں سے بالخصوص امام ابو حنیفہؒ سے حکومتِ وقت ہمیشہ لرزاں و ترساں رہی۔ امام صاحب کا جنازہ ابو جعفر منصورؒ کی جیل سے اٹھا۔ جب منصور کو معلوم ہوا کہ ابو حنیفہؒ نے وصیت کی تھی کہ انہیں ان کی زر خرید زمین میں دفن کیا جائے کیونکہ سرکاری قبرستان غصب کی زمین پر بنایا گیا تھا تو وہ چیخ اٹھا کہ اے کوئی جو مجھے ابو حنیفہؒ سے سچائے جس نے مجھے نہ زندگی میں چھوڑا نہ موت کے بعد! ان حضرات کے بعد امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کا نام فقہاء و علمائے امت کی فہرست میں تینا نہیں ہے۔ دونوں علم و عمل اور تقویٰ و خلوص کے پیکر تھے۔ امام شافعیؒ تو ایک مرتبہ قتل سے امام محمد بن الحسنؒ کی سفارش اور ذمہ داری پر بچے مگر بعد میں انہیں کھانے میں زہر دلوایا گیا جو ان کی موت کا سبب ہوا۔ احمد بن حنبلؒ کی ذات تو شہادت و شہادت کا پہاڑ تھی۔ تین حکمرانوں کا ظلم و تشدد انہیں کلمہ حق سے نہ روک سکا۔ آخر کار حکومت جھک گئی۔ مگر اس مردِ حق کا سر باطل کے سامنے نہ جھکا سکی۔ مسک خلقِ قرآن کے سلسلے میں احمد بن حنبلؒ کا کردار اسی نوعیت کا ثابت ہوا۔ جیسا کہ متذہبِ ابرک کا فتنہ انداز کے ضمن میں ہو چکا تھا۔ ان کا لغوہ حق ہمیشہ کے لئے انہیں امام اہل سنت کا خطاب دلوایا

گیا۔

تیسری صدی ہجری کی ایک اور عظیم شخصیت امام ابو الحسن اشعری تھے۔ انہوں نے مشہور مختصری امام ابو علی جبائی کی نگرانی اور سرپرستی میں پرورش پائی۔ انہی سے علم حاصل کیا اور مختصر کے مایہ ناز کیں اور مناظر بن گئے، چالیس برس مذہب الاعتزالی کی خدمت کے بعد اس سے برسر عام توبہ کی اور باقی زندگی سنت کی خدمت و اشاعت کے لئے وقف کر دی۔ انہوں نے اپنے زور استدلال، خدا داد زور بیان اور زور قلم سے اعتزالی اور مختصر کے پرچے اڑا دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کی خدمت کا بڑا عظیم کام لیا۔ آج بھی ان کی کتابیں اہل سنت و حدیث کے لئے مشعل راہ ہیں۔ وہ علوم شرعیہ کے علاوہ فلسفہ و منطق اور دوسرے رائج اوقات عقلی و مشاہداتی علوم کے ماہر تھے۔ انہوں نے "مشتی علم کلام" کی بنیاد رکھی۔ اشعری کے بعد معتزلہ کا چراغ نہیں جل سکا۔ بعد کے تمام مشکلات انہی کے خوشہ چین ہیں جو تیسری صدی ہجری کے امام ابو المنصور ماتریدی و ادواء النہر جینی ترکستان کے رہنے والے تھے۔ بہت بڑے محدث و فقیہ اور متکلم تھے۔ فقہ میں حنفی تھے اور صاحب قلم مصنف۔ انہوں نے اشعری علم کلام میں کچھ حکمت و اضافہ کیا اور اسے مزید متوازن بنایا۔ کتاب تاویلات القرآن کی عظیم تصنیف ہے۔ حنفی علماء بالعموم عقاید و کلام میں ماتریدی کے پیرو ہیں۔ پانچویں چھٹی صدی ہجری کے مشہور فلسفی، صوفی، متکلم اخلاق، فقیہ اور محدث امام ابو حامد غزالی کا نام مصلحین امت کی فہرست میں نہایت چمکدار ہے۔ ان کی شہرت مشرق و مغرب میں پھیلی۔ انہوں نے تصوف کی تجدید کا کارنامہ سرانجام دیا۔ بہت ذہین و فطین، ناپاد و عابد اور عظیم متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب دل بزرگ تھے۔ فلسفہ اخلاق ان کا خاص مضمون رہا ہے۔ وہ قلب و روح کی بیماریوں اور خطرات النفس کے ماہر و محقق تھے۔ ان کی تصنیفات پرچہ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی علم کلام اور صحیح تصوف کیا چیز ہے۔ فلسفہ یونان کا مطالعہ انہوں نے گہری نظر سے کیا اور اس کے رد میں تہافتہ الفلاسفہ نامی کتاب لکھی۔ وہ علم اصول فقہ کے بھی امام تھے۔ اور ان کی کتاب التفتیحی اس فن میں نہایت عظیم ہے۔ ان کے زمانے میں باطنیت نے تصوف کے بھیس میں اسلام پر حملہ کر رکھا تھا۔ امام غزالی نے اس فتنے کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور دلائل سے کتاب و سنت کی حقانیت اور اسلامی عقاید کی برتری ثابت کی۔ اپنے دور کے فتنوں کے رد میں اور نام نہاد علماء و شائخ کو جھجھکاتے ہیں ان کا رنگ، کچھ اس قسم کا نظر آتا ہے جو بعد کی صدیوں میں ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ نے اختیار کیا۔ وہ وقت کے حکام کے شاکی رہے اور ان پر زبان و قلم سے ہریلا

تنقید و احتساب کے کوڑے برساتے رہے۔ ایک دفعہ انہوں نے وقت کے عظیم فرمانروا ترک سلطان سنجر سے بھرے بازار میں کہا تھا: "افسوس تیرے گھوڑوں کی گز میں سنہری طوقوں سے ٹوٹ رہی ہیں۔ اور عوام کی گردنیں ٹیکسوں اور واجبات کے بوجھ سے ٹوٹ رہی ہیں۔" امام غزالی کا کارِ تجدید اسلامی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔

اسی دور کی ایک اور عظیم شخصیت جس نے اصلاح امت اور تہذیب و تمدن کا فریضہ بڑی تندہی اور بے باکی سے انجام دیا وہ سید محمد نقاد جیلانی کی ہستی تھی۔ ہمارے ہاں کے معروف سلاسل تصوف میں سے قادری سلسلہ انہی سے منسوب ہے۔ وہ ایک حنبلی المذہب محدث، فقیہ، واعظ، مدرس و معلم اور مصلح تھے۔ عوام میں ان کے کشف و کرامات کے حوالے سے بہت سی ہدایتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر وہ توحید و سنت کے علمبردار، حق گوئی میں شمشیر بر صند اور اصلاح نفس میں جلیقہ ثانی تھے۔ بڑے خادمِ خلق، منکسر المزاج اور عوام سے محبت کرنے والے تھے۔ حکام سے طبیعت، مکر و نفور رہتی اور ان کے سامنے کلمہ حق کہنے سے کبھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ پر بے شمار غیر مسلم مشرف باسلام ہوئے۔ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ و اختلافِ ائمہ کا درس اپنے مدرس میں خود دیتے تھے، عوام نے جتنا فیض ان سے پایا، بشکل کسی اور عالم و شریعہ سے اُس دور میں پایا ہوگا۔ صحیح اسلامی تصوف اور نبوی احسان کے علم بردار تھے اور الحاد و زندقہ اور غلط غیر شرعی تصوف و رسوم تصوف کا رد و کرنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ وعظ میں تاخیر مہبت تھی۔ کہتے ہیں کہ ان کے وعظ کی تاخیر سے بعض لوگ مر جاتے تھے۔ ان کے موعظ و خطبات فتوح الغیب کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ غنیۃ الطالبین نامی کتاب آپ کی تصنیف بتائی جاتی ہے مگر وہ تحریف و تغیر سے بچ نہیں سکی۔ بعض فرقوں نے اس میں کثرتِ توفیق کر ڈالی ہے۔

چھٹی صدی ہجری کی ہی ایک اور سیما با شخصیت علامہ عبدالرحمن ابن جوزی کی ہے۔ وہ مؤرخ، ناقد، محدث، فقیہ، واعظ، اصولی، مدرس اور دوسری کئی خصوصیات کے حامل تھے۔ وسعت مطالعہ اور کثرت تصانیف میں یگانہ روزگار تھے۔ انکارِ بدعت اور احقاقِ حق میں دود باری تلواریں تھیں۔ حدیث سے شغف زیادہ تھا۔ اور اس کی جانچ پرکھ میں کچھ متشدد بھی تھے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی مشہور کتاب "موضوعات" نے فنِ حدیث کے کئی جدید گوشے و اشکاف کھلے۔ بدعت اور اہل بدعت کے لئے رعد و برق کی دو گونہ صفات کے مالک تھے۔ انہوں نے تجرید و تقریر سے شغف کا اصلی چہرہ پیش کیا جو بدعت اور وہم و خرافات کی دھند میں او جھل ہوتا جا رہا تھا۔ کتاب "موضوعات"

کے علاوہ تلبیس ابلیس بھی ان کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے مکائد شیطان کو بیان کر کے اس وقت کے معاشرے کے خواص و عوام میں ان کی نشان دہی کی ہے۔ حکمرانوں، علمائے مشائخ اور زہود و ورع کے تدعیوں کو خاص طور پر نقد و تبصرہ کا نشانہ بنایا ہے۔ تاریخ میں ان کی کتاب الملتزم ابتدائے اسلام سے لے کر ان کے دور درجھی صدی ہجری تک کے واقعات و احوال و حوادث کے بیان پر مشتمل ہے اور نہایت قیمتی کتاب ہے۔ ان کے علاوہ بھی ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں علمائے آخرت میں سے تھے جو اپنی زندگی کو اسلام کے سلسلے میں ڈھال کر دوسروں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے اور وقت کے دھارے کو اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کی سعی کرتے ہیں۔

علماء و فقہاء کے ساتھ ارباب عزیمت کی صف میں کچھ ارباب سیف حاکم اور ورثہ صفت سلاطین کے نام بھی آتے ہیں جنہوں نے دور زوال میں زندگیاں اسلام کی خاطر وقف کیں اور میدان جہاد میں گزار دیں۔ جنہوں نے دنیا بھر کی تازہ دم عیسائی قوت کا بار بار مقابلہ کر کے اس کے دانت کھٹے کئے، اسلامی عدل و انصاف، امن و مساوات، عہد کی پابندی زہد و ریاضت، خدمتِ کتاب و سنت، ہم کو لوگ ہی ان کی نظیر ہو سکتے ہیں۔ یہ تین شخص ہیں اور یمینوں کا تعلق ترکوں سے ہے، عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی۔ بادشاہ ہونے کے باوجود انہوں نے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کی۔ قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت میں قن من دھن لگا دیا۔ یہ یمینوں صلیبی جنگوں کے ”مستلم ہیرو“ ہیں جنہوں نے اسلام کی شمشیر بے پناہ کی ضرب سے دشمنان اسلام کے سر قلم اور کفر کے علم سرنگوں کئے۔ یہ علم و عمل کے پیکر بھی تھے۔ مسلمان قوم ان کے وجود پر فخر کر سکتی ہے۔ ان کے یقین محکم اور ایمان کامل نے ابو بکر و عمرؓ کی یاد تازہ کر دی۔ ان کے سیر دروں اور شوقِ عبادت نے عثمانؓ عنی کی سجدہ ریزوں کو زندہ کر دیا۔ ان کی شمشیر خارا شاگاف نے علیؓ اور خالدؓ کے معرکے تازہ کئے۔ ”حمیم اللہ تعالیٰ ہم ان لوگوں کو بے شک ارباب عزیمت کی صف میں گھرا کر کے دورِ مسابغہ کی یاد تازہ کر سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا وجود ایک تحریک، تحریکِ انصاف سے مشرق و مغرب امتاثر ہوئے غیر مسلم مورخین نے ان پر جو کچھ لکھا ہے اسے بڑھتے سے آنکھیں اشک، بار بار رول پیٹوں اچھلنے لگتے ہیں۔ یہ سب چھٹی صدی کے مجاہدین تھے۔

علمائے عرب و اسلامی اسی چھٹی صدی ہجری کا ایک اور زندہ ستارہ ہے۔ یہ شخص علم و عمل کا پہاڑ، تقریبی و غلوں کا صحرائے ناپید کنار اور حق گوئی و بیباکی کا نادرہ روزگار تھا۔ ان کا شمار تصدقین ملت میں ہوتا ہے۔ زہد و ورع، مہر و شکر، خدمتِ دین و ملت،

و القاماد و بدعت میں ان کا وجود رہنے کو دور میں بے مثل و بے نظیر تھا۔ وہ ان علمائے حق اور اولیائے صادق میں سے تھے۔ جن کی صورت و یکجہ کمال اللہ یاد آتا ہے۔ بے مثال خطیب بے حد مؤثر و اغوا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں شگلی تلوار تھے۔ وقت کے حکام کو وعظ و پند سے موم کر دیتے اور بہت علم و عمل سے بڑے بڑے سرکش انسانوں کو آستانہ حق پر جھکا دیتے تھے تاہم یہی شخص کامقا بل کرنے کی تلقین میں ان کے نصائح اور خطبات آگ لگا دیتے تھے۔ وہ جرات و استقامت کا کوہ گراں تھے۔ انہیں دیکھ کر حسن بصری اور سید بن الحسب کی بات تازہ ہو جاتی تھی۔ شیخ عبداللہ صاحب النعانیف بزرگ تھے۔ القوادی الکبریٰ اور مجاہد القرآن ان کی علمی گہرائی اور محضدانہ بصیرت کی شاہد عدل ہیں۔

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں غدار ملت ابن علقمی (وزیر خلیفہ مستعصر باللہ) اور نصیر المشرکین نصیر الدین عوس کی ملی جھگڑا اور اہل اسلام کے خلاف سازش کے نتیجے میں ہلاک و خوار ہونے بعد کو تباہ کر ڈالا۔ صدیوں کی عظمت، سرنگوں ہو گئی۔ مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ چن چن کر اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک، ایک نشان مٹا دیا گیا۔ ملت اسلامیہ پر ایک مایوسی کا عالم طاری ہو گیا۔ بڑے نام خلافت، عباسیہ کا مرکز بغداد سے دمشق اور مصر میں منتقل ہو گیا۔ ادا بارو نکبت کی گھٹائیں چھا گئیں۔ نفاق باہمی، فرقہ بازی، دنیا پرستی ہمیشہ و عشرت خلفاء کی نااہلی، مسلمانوں کی کمزوری اور غفلت نے یہ بڑا دن دکھایا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا ہو گا؟ اسی زمانے میں اس دور کا مجدد امام ابن تیمیہ پیدا ہوا۔

ابن تیمیہ علم و فضل، زہد و ورع، تقویٰ و طہارت، حافظہ و ذہانت میں بے مثال شخصیت تھے۔ وہ ایک وقت منقرض حکم، فلسفی، صوفی، محدث، فقیہ و مجتہد، معنف و مدد رس، واعظ و خطیب، امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں شمشیر بے زہار، شرک و بدعت اور الحاد و زندقہ کے لئے پیام موت، تلوارِ بابتہ میں بے کفر فوجوں کی کمان کرنے والے مجاہد فی سبیل اللہ تھے۔ امام ابن تیمیہ کا زمانہ فتنوں سے چڑھا۔ اندرونی اور بیرونی حملہ آور اسلام کے حصار کو توڑنے کی جدوجہد میں معروف تھے۔ ابن تیمیہ نے ایک سیلاب بلا میں کس تمام فتنوں کا مقابلہ کیا، سیف و قلم سے حق کی خدمت کی۔ وہ بے تکان قلم برداشتہ لکھنے والے تھے ہر موضوع پر ان کا قلم فرار رواں ہو جاتا تھا۔ بے نظیر حافظے کی مدد سے عبارتوں کی عبارتیں نقل کرتے جاتے۔ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے علاوہ آثار صحابہؓ و تابعین اور اقوال فقہاء و مسرود قلم کرتے چلے جاتے تھے۔ یوں نظر آتا ہے کہ تمام شرعی، فلسفی، منطقی، تاریخی، عقلی و نقلی علوم ان کے سامنے ایک ترتیب سے بچے ہوئے ہیں، وہ جب چاہیں اور جہاں سے چاہیں اقتباسات

و دلائل کا انبار لگاتے چلے جانے۔ قرٹ استدلال کا یہ عالم تھا کہ تہ مقابل چٹ ہو جاتا اور وہ فاتحانہ انداز میں قلم کی رفتار کو مزید تیز کر کے دلائل و شواہد کا انبار لگا دیتے۔ انہوں نے بیک وقت فلاسفہ، محدثین، باطنیہ، روافض، نصاریٰ اور دیگر متبعین و اعداء اسلام کے خلاف جو کچھ لڑائی لڑی۔ حتیٰ کوئی اور بیباکی کا یہ عالم تھا کہ کوئی ہیبت، کوئی دبدبہ، کوئی حکومت اور جاہ و جلال اس سلطانِ علم و عمل کو زیر نہ کر سکا۔ بادشاہ مصائب کی آندھیاں آئیں۔ آئے دن انقلابِ حکومت کے باعث نئی النجمن کا سامنا رہا مگر وہ استقامت، اور صبر و وقار کا ایک کوہِ گراں ثابت ہوئے۔ انہوں نے تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا اتنا کام کیا کہ آج اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ خود ایک تحریک تھے۔ ان کی محبت و تربیت سے ابنِ القيمؒ اور ابنِ کثیرؒ جیسے لوگ اٹھے جنہوں نے علوم و فنون کے انبار لگا دیئے۔ ان لوگوں کے احسان سے مسلمانوں کی گردنیں تاقیامت بوجھل رہیں گی۔

حافظ ابنِ قیمؒ کی کتاب منہاج المسترفض و بدعت کے رد میں بے مثال ہے۔ اس میں بڑے دقیق کلامی اور فلسفی مسائل کا حل ملتا ہے۔ المجواب المصیح ردّ نصاریٰ میں بے نظیر ہے۔ ان کے ضخیم فتاویٰ بے شمار فرائد کے حامل ہیں۔ ان کے شاگرد اربعہ العقیم بھی میدانِ تصنیف میں اعلیٰ قسم کی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ فقہیں یہ دونوں حضرات، جنہلی تھے۔ تحریر میں کہیں کہیں شدت کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ ان کی جلالیتِ قدر اور عظمتِ شان پر ساری امت متفق رہی ہے۔ استلاویٰ نسبت شاگرد پر تصوف کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ ان دونوں حضرات کو اعتزال اور بدعت والہما کے مقابلے میں اہل سنت، کاترجمان اور وکیل تسلیم کیا جاتا ہے۔

دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں مجدد الف ثانی شیخ احمد رکن دہلی نے احیائے اسلام اور تجدیدِ ملت کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ مجدد الف ثانی (دوسرا ہزار سال) کا تصور شاید دہر بار اکبری کے خوشامد پرست درباریوں کی اس گمراہی کا جواب تھا۔ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا دور (ایک ہزار برس) معاذ اللہ گزر چکا ہے۔ اب ایک نئے دین کی ضرورت ہے۔ چنانچہ بعض شکم پرست مسلمان امرائے ہند، دول اور دیگر غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک نیا مذہب ایجاد کیا جس کی مرکزیت کا سہرا وقت کے جاہل بادشاہ اکبر کے سر باندھا گیا۔ اس نئے دین کا نام دینِ الہی اکبر شاہی رکھا گیا۔ اس میں شرک و کفر، جنت و جہنم، آفتاب پرستی، آتش پرستی، شاہ پرستی (اور خدا جانے کیا کیا پرستی) شامل کی گئی۔ اسلام کو چونکہ معاذ اللہ منسوخ کیا جا رہا تھا اس لئے اس کا کوئی حصہ شامل نہیں کیا۔ اس دین کو ترغیب و ترہیب کے ذریعے سے پھیلایا گیا۔ اور کچھ عرصے کے لئے اسلام کو عملاً اس سرزمین

سے رخصت کر دیا گیا۔ اسی الحاد و بدعات کے پلندے کو دیر یا برد کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد رکن الدین کو توفیق بخشی اور انہوں نے اسے واقعی ختم کر ڈالا۔ اس بناء پر ان کا لقب مہتر الف ثانی ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ برصغیر ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کا سہرا چند قدسی نفس صوفیوں کے سر ہے۔ حکومتیں بالعموم اس سے لافلق اور غیر جانبدار رہی ہیں چند ایک چھوڑ کر اکثر حکمران محض دنیا دار بادشاہ تھے۔ وہ صرف اپنی ذاتی اغراض اور شاہی مصالح کی خاطر بعض اوقات دین کی سرپرستی کا جامہ اوڑھ لیتے تھے۔ حقیقت میں انہوں نے خدمت دین کا فریضہ ادا نہیں کیا۔ مغلیہ سلطنت کا مشہور بادشاہ ہمایوں جب شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر مہاراجا کوئی سال ایران میں پناہ گزین رہا اور وہاں کی مشہور متعصب صغریٰ حکومت سے امداد طلب کرتا رہا۔ آخر کار اسے یہ امداد مہیا ہو گئی۔ وہ صرف فوجی اور مادی امداد کا تحفہ لے کر ہی واپس نہ لوٹا بلکہ اس مدد و نصرت کے جلو میں ایک سنہ مذہب کا تحفہ بھی لایا۔ اس کے بعد بڑے بڑے فوجی اور سولہ عہدے ایرانی اہلکاروں کو ملنے لگے اور یہ ملک نئی نئی آوازوں سے آشنا ہوا۔ یاد رہے کہ آگے چل کر جب مغلیہ سلطنت پر زوال آیا تو یہاں کے بڑے بڑے رؤساء و امراء، گورنر، فوجی حکام، نواب اور بادشاہ اکثر ایسی ایرانی تحفے کی یاد گاریں مٹیں۔ انہی کے ہاتھوں زوال سلطنت و حکومت کا کام انجام کو پہنچا۔

اکبر شاہی دور میں جن طبقوں کے ہاتھوں اسلام اور اہل اسلام کو شدید دھچکا لگا وہ علماء و صوفیاء، امراء و رؤساء، شاہی و درباری، حکومت کے بڑے بڑے اہل کار اور فوجی عہدیدار تھے۔ حضرت شیخ رکن الدین نے اپنے دل ہلا دینے والے مکاتیب کے ذریعے سے ان سب طبقوں کو خبردار کیا، مہتمم اور ان کے فرائض کی یاد دلانی کرائی۔ ان کتبوبات میں انہوں نے تفسیر قرآن، شرح حدیث، فقہ و اصول اور صحیح اسلامی تصوف کے وہ موتی بکھیرے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان وجد میں آجاتا ہے۔ حضرت شیخ بدعت والحد کے خلاف ایک قہر الہی کی بجلی تھی۔ ان کے مکاتیب میں رمح کی گرج، بجلی کی چمک، سیلاب کی تیزی، سمندر کی گہرائی اور پہاڑوں کا وقار پایا جاتا ہے۔ انہوں نے علمائے سوء اور شکم پرست مشائخ کو سورہ اسرافیل پھونک کر جگایا۔ غیر اسلامی تصوف کو دلائل شرع سے زد کیا اور صحیح اسلامی تصوف اور نبوی احسان کو لاز سر نو زندہ کیا۔ اس ملک میں بدعت والحد کے دھارے کے سامنے سنت و شریعت کا بند باندھنے میں جو کردار انہوں نے ادا کیا تھا اس کے اثرات انشاء اللہ تا قیامت باقی رہیں گے۔ ان کے بعد احیائے اسلام کی تحریکیں انہی سے متاخر نظر آتی ہیں۔ انہوں نے جہانگیر

جیسے عظیم شہنشاہ کو خدا اور رسول کی شریعت کی چوکھٹ پر جھکا دیا۔ دین الہی اکبر شاہی صرف اور اپنی تاریخ کی دینیت ہی کر رہ گیا۔ انہی کا اثر تھا کہ اس دنیا دار شاہی گھرانے سے اور ملک ذریعہ عالمگیر جیسا پابند شریعت اور خادم دین بادشاہ اعظم۔ اگر عالمگیر کے جانشین نااہل ثابت نہ ہوتے تو آج ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ دونوں مختلف ہوتے۔

حضرت مجددی اصلاحی و تجدیدی تحریک نے برصغیر کے ہر کونے اور ہر گوشے میں ایسے درویشان اسلام کا ایک جال بچھا دیا تھا جنہوں نے اسلامی علوم اور کتاب و سنت کی اشاعت میں اپنی جائیں کھپا دیں۔ بدعت والحاد اور باطنیت کو نول کھدروں میں منہ چھپانے پر مجبور ہو گئی۔ یہ تحریک آگے چل کر کئی تحریکوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور دین کا کام کرنے والوں نے اس سے رہنمائی حاصل کی۔

بارہویں صدی ہجری میں عالم اسلام کا ایک عظیم مفکر، علوم عقلیہ و نقلیہ کا جامع، وسیع النظر عالم دین، فقیہ، محدث، صوفی، معتدل دل و دماغ رکھنے والا حیرت انگیز مصنف، اسلام کے لئے دل دردمند رکھنے والا ایک ہمہ گیر دانش ور ہیں ملت اسلامیہ میں کا نام نہ تجدید و اصلاح انجام دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بے مثال شخصیت کا نام شاہ ولی اللہ ہے۔ ان کے زمانے میں سلطنت مغلیہ زوال کا شکار ہو چکی تھی۔ مرہٹے اور سکھ ملک میں اڈھم مچا رہے تھے۔ ہر طرف افروغی کا عالم تھا۔ نااہل حکمران نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ طوائف الملوک کا دور دورہ تھا۔ مایوسیوں نے ملت اسلامیہ کو گھیر لیا تھا۔ مغربی اقوام تاجروں کے ہمیں میں متحدہ ہندوستان میں اگر اب یہاں کی حاکم بن رہی تھیں۔ کئی علاقے عمل ان کے زیر تسلط تھے۔ شاہی دربار مسخروں، بھانڈوں، نقالوں اور ڈوم ڈھاریوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ لوگ گھن کی طرح سلطنت کو آہستہ آہستہ کھاتے جا رہے تھے۔ بدیہ علاقے مرکزی حکومت سے آزاد ہو چکے تھے۔ نواب اور ان کے درباری بیہ بازی میں مصروف تھے۔ چھاپہ مار مرہٹے لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کئے ہوئے تھے۔ محلاتی سازشیں زوروں پر تھیں اور شاہی گھرانوں میں سازشوں اور اکھاڑ پھاڑ کا نہ ختم ہونے والا چکر چل رہا تھا۔ خاص ایک مرتبہ پھر اپنے فرائض سے نا آشنا ہو گئے تھے اور عوام میں بے اعتمادی اور بے چینی کی لہر اٹھ رہی تھیں۔ ہر طرف جیاشی، بے راہ روی، قتل و غارت، بدامنی اور جبر و تشدد کا بازار گرم تھا۔ بدعت والحاد پھر اپنی دکانیں سبھاچکا تھا۔ تصوف اور فقر و درویشی کا چشمہ صافی پھر مکدر ہو چکا تھا۔ علم و فضیلت درباروں تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ بن چکے تھے۔

میشخت کے گدھی نشینی نفس پرور اور دنیا پرست بن گئے تھے۔ فخر پرستی و باہی شکل اختیار

کر گئی تھی۔ توحید پرست ایک خدا کے سوا باقی ہر ایک کے پجاری ہو گئے تھے۔ سنت کے چراغ ماند پڑ گئے تھے اور شرک و بدعت کی شمعیں روشن تھیں۔ غرض ایک طوفان بلا محتاج میں اس ملک کی ملت اسلامیہ گھری ہوئی تھی۔

ایسے خوفناک حالات میں دہلی شہر کے ایک کونے میں بیٹھ کر شاہ ولی اللہ حالات کو اچھی طرح سمجھنا پڑا۔ اس بیمار قوم کا علاج دریا یافت کرنے اور پھر اس کو ایک نئے شفا کے طور پر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی صورت میں پیش کرنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اتنا وسیع کام کیا ہے جو عام حالات میں شاید ایک بڑی جماعت بھی نہ کر سکے۔ کوئی سیاسی، معاشی، معاشرتی، عمرانی، تہذیبی، اخلاقی موضوع ایسا نہیں جس پر انہوں نے مدلل بحث و تحقیق کر کے پیش کردہ مسائل کا حل پیش نہ کیا ہو۔ حکمت دین میں ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغاب تک بے مثال ہے۔ دنیا بھر کے مسلم اور غیر مسلم عقلاء اس کے مندرجات کی داد دے چکے ہیں۔ انہوں نے ترجمہ و تفسیر قرآن، شرح حدیث، فقہ و اصول، غرض ہر شرعی علم و فن کی بے نظیر خدمت کی۔ وہ اس ملک میں حدیث کی باقاعدہ تدریس جاری کرنے والے پہلے محدث ہیں۔ ان کے بعد بس انہی کی سند اور انہی کا سلسلہ چلا۔ پہلے بزرگوں نے جو کام کیا تھا وہ جزوی و ناقص ہی ہو کر رہ گیا۔ قرآن پاک کی تفسیر و تعلیم کے لئے انہوں نے ایک آسان اور عام فہم طریقہ نکالا۔ اس کی خاطر انہوں نے فارسی زبان میں — جو اس وقت علمی و دینی زبان تھی — ایک ترجمہ اور تفسیر لکھی۔ اصول تفسیر پر ایک الونکے طرز کا رسالہ لکھا جو آج کل درس گاہوں میں داخل مضامین ہے۔ مفتی فقہ کے مکاتیب چہار گانہ کو ایک دوسرے سے ملانے اور قریب تر کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ حدیث کی عام فہم اور جامع شرح لکھی۔ ان کے خاندان کو اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کی شمع روشن رکھنے اور دور و دور تک اس کی روشنی پہنچانے کی توفیق بخشی۔ ان کے لائق صاحبزادوں اور جانشینوں نے اردو زبان کو تفسیر و اشاعت قرآن کا ذریعہ بنا کر ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ ان کے تراجم آج تک بے نظیر شمار ہوتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے خود کو سیاست میں عملی حصہ نہیں لیا مگر وقت کے ارباب حکومت و سیاست کو بار بار بوجھنھوڑا اور خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کی۔ وہ مرہٹہ گردی اور ہر طرف کفار کی یلغار پر تاملاتے رہے اور غازیان اسلام کو میدان مبارزت میں نکلنے کی کھلی دعوت دیتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی انہی کی دعوت اور پکار سے متاثر ہو کر مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے برصغیر پہ حملہ آور ہوا تھا۔

تصرف کونج بدعات اور غیر اسلامی اعمال و رسوم اور وہم و خرافات سے مروت کر دیا گیا تھا، شاہ صاحب نے اس سارے جھار جھٹکاڑ کو اس سے الگ کر کے نبوی احسان اور قرون اولیٰ کے اسلامی تصوف کو از سر نو زندہ کیا۔ وہ خود ایک بہت بڑے صاحب نسبت اور صاحب اجازت صوفی تھے۔ ان کے والد بھی عظیم عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے صوفی تھے۔ شاہ صاحب نے تصوف پر بھی بہت سی کتابیں اور رسائل چھوڑے ہیں۔

آج ہندو پاکستان میں سنی مکاتب فکر میں کوئی طبقہ ایسا نہیں جو اپنی نسبت شاہ ولی اللہ کی طرف نہ کرنا اور اپنی سند حدیث ان کے ساتھ نہ ملانا ہو۔ ان کی ذات، اور ان کے بعد ان کے اخلاف اس ملک میں شرعی علوم کے لئے مرکزیت کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تصانیف بالخصوص **حجۃ اللہ الباقی** ہندو پاکستان کے علاوہ عرب ممالک میں بھی مسند کا درجہ رکھتی ہیں۔ انہوں نے احیائے دین اور اصلاح ملت کا جو کام شروع کیا تھا اس کے نتیجے میں انہی کے فیض یافتہ اور ان کے اخلاف نے ہندو پاکستان میں ایک عظیم تحریک جہاد شروع کی جو دینی طور پر گونا گونا کام ہو گئی مگر دنیا کے ان اطراف میں دیر پا اثرات چھوڑ گئی۔ اس کی صدائے بازگشت اب بھی سنائی دے رہی ہے۔

یہ تحریک جہاد سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک تھی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کی بیداری میں بڑا کام کیا ہے۔ ہم آزاد می ہند اور قیام پاکستان کی ہر تحریک میں اس کا اثر بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اس تحریک کا اگر نفور مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہو گا کہ اس کا مقصد احیائے دین کے سوا کچھ نہ تھا۔ ناموافق حالات میں بعض لوگوں کی غذاری سے یہ حضرات شہادت پا گئے۔ لیکن ان کا نعرہ جہاد اور احیائے اسلام کی پکار اب بھی زندہ و پابند ہے۔ یہ تیرھویں صدی ہجری کی تحریک تھی۔

سید احمد شہید اور ان کے سامعینوں کی تحریک جہاد تو بظاہر نا کام ہو گئی مگر احیائے دین کے سلسلے میں اس تحریک کے اثرات بہت دیر پا ثابت ہوئے۔ **مفتاح** کی جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر اور ان کے حامی شکست کھا گئے تو انگریزوں نے اہل ہند پر — بالخصوص مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ بے شمار لوگوں کو چھائی دی گئی۔ علماء کو حنیفہ وار پرکھنی لگا۔ کہتے ہیں کہ دہلی کے خونی دروازے کے باہر دو رنگ پھانسیاں لٹکی تھیں، فاتح قوم گئے غلط یا صحیح شکایت پر اندھا دھند باشندگان دہلی کو برسہا برس عام ان پر لٹکایا۔ حاکم قوم کی پالیسی اب یہ تھی کہ مسلمانوں کو ہر میدان میں نیچا دکھایا جائے۔ اور ہندو کو آگے بڑھایا جائے۔ بہت سے علماء و صلحا ملک چھوڑ گئے۔ خاندانہ ولی اللہی پر بھی مصائب کے پہاڑ ٹوٹے۔

مولانا رحمت اللہ، مولانا شاہ محمد اسحاق ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔ مولانا رشید احمد لکھنوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی پر ہجرات کے مقدمے چلے۔

علمائے حق کی جماعت نے مسلمانوں کو مایوسی سے بچانے اور اسلام کو غیر قوم کی زد سے نکالنے کے لئے غور و فکر کے بعد مدارس اسلامیہ کا سلسلہ شروع کیا۔ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں اور انہوں نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی خاطر مخالف حالات میں دین کا جھنڈا بلند رکھا۔ شیخ الہند مولانا محمد وحسن کو ترکوں کی انداد کے جرم میں جزیہ مال لگانے میں نظر بند رکھا گیا۔ آگے چل کر اسی جماعت کے لوگ آزادی ہند اور مسلم لیگ کی تحریکوں میں پیش پیش رہے۔

سید جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی نے بھی مسلمانوں کی بیداری اور اتحاد میں بڑا کام کیا۔ افغانی کے بعد ان کے شاگرد مفتی محمد عابدی نے ان کا کام سنبھالا۔ سید رشید رضا مصری نے اسلامیان مصر کی بیداری اور مسلمانان عالم کی دینی رہنمائی میں بہت بڑی خدمات انجام دیں۔ مامی قریب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک جماعت اسلامی کی خدمات کو نظر انداز کرنا دیاقت والہانہ خلاف ہو گا۔ سید مرحوم نے وقت کے تمام اہم مسائل پر خلم فرسائی کی ہے اور اسلام کی حقانیت کے اثبات میں وسیع ذخیرہ کتب چھوڑا ہے۔ مصر کی تحریک اخوان اور سوڈان کی تحریک مہمدی سوڈانی کے علاوہ سو سی تحریک نے بھی اسلام کی خدمات اور دفاع میں عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہ سب تحریکات ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک بھی اصلاحی مٹی گوا سے بدنام بہت کیا گیا ہے۔

اسلامی اقدار کے احیاء اور تبلیغ دین میں تبلیغی جماعت کا کام ناقابل فراموش ہے تعظیم ہند سے قبل جب ہندوؤں نے شتر تھی کا فتہ اٹھایا اور بہت سے مسلمانوں کو مرتد بنا دیا تو مسلمانوں نے انفرادی و اجتماعی طور پر اس کا مقابلہ کرنے کی کوششیں کیں۔ ان سب کوششوں میں مولانا محمد آلیاس گاندھیلوی کی جدوجہد بے مثال تھی۔ انہوں نے دہلی — ہندوستان کی بستی نظام الدین میں ڈیرہ جمایا اور ملحقہ وسیع علاقہ میوات جو شتر تھی کی شدید زد میں تھا، اسے اپنے کام کا مرکز منتخب کیا۔ ان کی کوششوں سے یہ علاقہ کفر کی گود میں جانے سے بچ گیا اور مولانا مرحوم کی اس تحریک نے ایک مستقل شکل اختیار کر لی۔ اس جماعت کا نہ کوئی دفتر ہے نہ عمبر شپ، نہ چندہ نہ کوئی اور مصنوعی اور تلکھاتی رسم۔ اللہ کے چند بند سے اپنا خرچ اور بستر سناھ لے کر چلتے ہیں، کسی سے کچھ طلب نہیں کرتے بلکہ

بلا چند شرطوں کے کسی کی دعوت بھی قبول نہیں کرتے۔ یعنی بستی گھومتے پھرتے ہیں۔ مسجدوں میں ڈیرہ لگاتے ہیں۔ اور نمازوں کے اوقات میں مقامی لوگوں کو ان کے دینی فرائض کی طرف متوجہ کر کے ساتھ لے لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو لوگ ساتھ ہو جائیں انہیں دینی احکام کی تعلیم بھی دیتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ بستی بستی کیسے کیسے جاری رہتا ہے۔ نماز عصر کے بعد مسجد کے طبقہ صلاتی میں گشت کر کے عوام کا کلمہ صبح کراتے اور نماز کی تلقین کرتے ہیں۔

یہ جماعت خاموشی سے ہندو پاکستان کے علاوہ مغربی ممالک — فرانس، جرمنی، بلیکٹ اور انتہائی مشرقی ملک جاپان کے علاوہ امریکہ میں بھی برسرِ کار ہے۔ ان کے کام کے نتائج رونما ہو رہے ہیں۔ اور ان ممالک میں اسلام کی خاموش تبلیغ کے علاوہ وہاں رہنے والے یا ملازمت کرنے والے مسلمانوں کی اصلاح کا کام بھی جاری ہے۔ جاپان میں یہ کام خاصہ تیز اور وسیع ہے۔ یہ اصلاح و تجدید کا ایک خاموش اور سادہ کام ہے مگر اپنے نتائج کے لحاظ سے بڑا اہم اور نتیجہ خیز ہے۔

اسلام اور عصر حاضر | عصر حاضر میں اسلام بے شمار مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے خلاف دنیا کے دو دھڑے یعنی مغربی عیسائیت اور مشرقی

اشتراکیت ہر وقت سازشوں میں مصروف ہیں۔ اسلام کے مقابلے میں یہودیت و عیسائیت — جن کا جنم جنم کا بیرمقا — متحد ہو چکی ہیں۔ ہندو ازم نے ایک مرتبہ پھر ہندوستان میں اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ اور وہ اسلام کے خلاف ہر قسم کے اسلحہ سے لیس ہو کر لے ڈک پہنچانے — بلکہ اپنی مروجہ سرزمین سے اس کو مٹانے پر تیل گیا ہے۔ مسلمانوں کے بہت سے علاقے افریقہ میں مغربی عیسائیوں کی سازشوں سے عیسائی اقلیت کے ہاتھوں میں آ چکے ہیں۔ سپین سے مسلمانوں کا نام و نشان بہت پہلے سے مٹایا جا چکا ہے۔ اشتراکیت مسلمانوں کی کم از کم ایک درجن ریاستوں پر قابض ہے۔ اور وہاں سے اسلامی تہذیب و ثقافت کی ہر علامت کو مٹایا جا چکا ہے۔ چینی ترکستان — موجودہ سنکیانگ کا عظیم علاقہ — چین کی جدید اشتراکیت کے قبضے میں ہے اور خدا معلوم وہاں مسلمانوں کی حالت کیا ہے۔ مسلمان سلفتیں تنزل اور زوال کا شکار ہیں۔ ان میں اتحاد نام کی کوئی چیز عملاً کم ہی نظر آتی ہے۔ معاشی طور پر مسلمان ہر ملک میں پسماندہ ہیں۔ عربوں نے اسرائیل سے بار بار شکست کھانے کے بعد بھی ہوش نہیں سنبھالا۔ اور وہ دھڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں روس کا ریچھ افغانستان کی مسلم سلطنت پر قبضہ جما چکا ہے اور اپنی پوزیشن روز بروز مستحکم کرنے کی فکر میں ہے۔

خالص مذہبی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اب ہم ہیں وہ دم ختم باقی نہیں رہا کہ وقت کے فتوں کا علمی تجزیہ کر کے کسی غزالی یا ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا پارٹ ادا کر سکیں۔ روح اجتہاد مردہ ہو چکی ہے۔ فکر و نظر رنگ آلود ہو گئے ہیں۔ ہمارے علماء تعقل و جود کا شکار ہیں۔ سا اہل سال پہلے کا بنا ہوا نصاب تعلیم ہماری مذہبی درسگاہوں میں رائج ہے اور ہم اس سے ایک انج ہٹنا بھی کفر و الحاد کا ہم پلہ سمجھتے ہیں۔ ساری طاقت فردی اختلافات کو ہوا دینے اور فرقہ بندی پر صرف ہو رہی ہے۔ ہمارے مشائخ جاہل اور رجعت پسند ہیں۔ کتاب و سنت اور نبوی احسان سے بے بہرہ ہیں۔ شکم پر درسی اور حکام کی سی ان کا منتخب مقرر ہے۔ سب سے بڑی خطرناک بیماری جس نے ہمیں نیم جان کر دیا ہے۔ وہ فرقہ پرستی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اسلام کو اپنی خاص رنگین عینک سے دیکھنے کا عادی ہو گیا ہے۔ ہماری مسجدیں فرومی خانہ جنگی کا اکھاڑ بن چکی ہیں۔ ایک فرقہ کے لوگ دوسروں کی مسجد میں نماز ادا کرنے کو تیار نہیں۔ بعض مسجدوں کے دروازے دوسرے خیال کے لوگوں پر بند ہیں۔ تکفیر و کفریت کا شغل مذموم جاری ہے۔ واعظوں کے ہر وعظ اور خطبہ کے ہر خطبے میں ملت کی بیماریوں کا علاج نہیں بلکہ ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کی پیش کش کی جاتی ہے۔ اس صورت احوال سے مغربی تعلیم سے مزین دل و دماغ — جو پہلے ہی اسلام سے بیگانہ ہیں — متنفر ہوتے جا رہے ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ ہماری آبادی کا ایک دو فیصد حصہ بھی نمازی نہیں رہا۔ حالانکہ یہ اسلام کا اولین فریضہ ہے جسے اسلام اور کفر کے درمیان علامت امتیاز قرار دیا گیا ہے۔ اللہ کے کچھ بندے صحیح لائٹوں پر کام کرتے بھی ہیں تو عوام و خواص انہیں تھیک کا نشانہ بناتے اور عجیب و غریب فتوؤں اور انقاب سے ان کی تواضع کرتے ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور ہے اس میں مشکل ہی بعض ایسے افراد مل سکیں گے جو اسلام کے بارے میں غلطیوں سے - ورنہ بعض تو علمی ریشوٹ یا لادین ہیں، بعض غیر جانبدار ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بعض بیرونی طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ ایسے لوگ ہر شے کے اور ہر دفتر میں موجود ہیں۔ حال ہی میں پی۔ آئی۔ اے میں جو قہر کا عمل ہوا ہے۔ تو اس سے کئی حیرت انگیز انکشافات منظر عام پر آئے ہیں۔ بعض انکشافات ایسے بھی ہوں گے جنہیں مصلحت ظاہر نہ کیا جاسکتا ہوگا۔ ملک میں آئے دن جو تحریکیں کار و اداریاں، قتل و غارت، اغواء اور ڈاکوئی، بموں کے دھماکے ہوتے رہتے ہیں ان کے پیچھے یقیناً کوئی خفیہ ہاتھ کار فرما ہے۔ تعلیمی اداروں میں ملحدوں،

سوشلسٹوں اور ممالک غیر کے جاسوسوں کے متعلق اعلانات اور بیانات ذمہ دار لوگوں کی طرف سے اکثر اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بعض خاص فرقے یہودیوں کی مانند ذرائع ابلاغ پر مکمل قبضہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ قومی اور ملکی ذرائع کو اپنے فرقہ وارانہ مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ انتشار و اضطراب کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا۔ یہ لوگ اندرونی سازشوں کے بل پر بیٹے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں اور ملت کا کام کرنے کی بجائے اپنے خاص طبقے یا فرقے کا کام کرتے ہیں۔

معاشی نقطہ نظر سے مسلم ممالک پس ماندہ اور مغربی ممالک کے محتاج ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے فقدان کے باعث وہ اپنے آپ کو اس پر مجبور پاتے ہیں کہ سوشلسٹ بلاک یا مغربی سرمایہ دار بلاک سے ملنسک ہوں۔ بڑے ملکوں کی امداد و مفت نہیں ملتی۔ اس کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس امداد کی شرائط بعض دفعہ رسوا کن ہوتی ہیں۔ اس امداد کے سہارے وہ ممالک اپنے دانشور، مشیر، سائنسدان، ماہرین اقتصادیات اور بعض دفعہ فوجی ماہرین بھی ان مسلم ممالک میں داخل کر دیتے ہیں۔ مسلم ممالک کا ہر راز ان لوگوں کی معرفت افشاء ہوتا رہتا ہے۔ یہ ماہرین کام میں مخلص نہیں ہوتے۔ ان کے پیش نظر محض اپنے ممالک کے خاص مفاد ہوتے ہیں۔ پس ماندہ ملکوں کو بعض دفعہ بڑی طاقتوں کے سامنے مجبور ہو کر اپنے ملک میں فوجی اڈے، ہوائی اڈے اور بحری اڈے بنانے کی اجازت دینی پڑتی ہے۔ یہ ماہرین مسلم ممالک میں فحاشی اور بے راہ روی پھیلانے اور اضطراب پیدا کرتے ہیں۔ افغانستان کی موجودہ صورت حال اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ یہاں ایک عرصے سے روسی ماہرین نقب لگا رہے تھے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کسی ملک کی میراث نہیں بلکہ یہ ساری انسانیت کی مشترک میراث ہے۔ ہر نئی ایجاد عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔ علم و فن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ جو شخص باقوم بھی اسے اپنالے وہ اسی کا ہو جاتا ہے۔ اس میدان میں ہم مغرب اور سوشلسٹ ممالک سے بہت پیچھے ہیں۔ اب تو ہندو اور یہودی بھی اس میدان میں مسلم ممالک پر بازی لے جانے کی شدید جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس علمی بے ماگی اور ذہنی پس ماندگی کا نتیجہ ہے کہ ہم غیروں کے محتاج بن کر رہ گئے ہیں۔ باہر سے پڑھ کر آنے والے ان ممالک سے متاثر ہوتے ہیں جہاں انہوں نے تعلیم پائی۔ وہ غیر شعوری طور پر بعض دفعہ شعوری طور پر بھی اپنے ملک میں دوسروں کے سفیر بن کر رہ جاتے ہیں۔

معاشرتی نقطہ نگاہ سے ہماری سوسائٹی بے شمار رسوم اور وہم و خرافات کا

شکار ہے۔ ہم طبقات میں بٹ کر رہ گئے ہیں توڑموں اور زاتوں کا تعصب بے شمار اختلافات کا باعث ہے۔ علاقائی تعصب کی بیماری ہم میں گھر گھر چلی ہے۔ مسلم ہونے کے باوجود ہم اپنے ہی ملک کے ان لوگوں کو جن کی زبان یا بعض ثقافتی رسوم ہم سے مختلف ہوں، برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ یہ مرض پڑھے لکھے لوگوں اور سیاست دانوں میں سب سے زیادہ ہے۔ شیخ پر ہم جس تہذیب اور زبان کو بدیہ عقیدت پیش کرتے ہیں، بیشعہ اتر کر اسی سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ہماری سرحدوں پر ہمارے ہمسایہ ملک میں جو قتل و غارت اور خاک و خون کا ہنگامہ بپا ہے ہم اس سے بھی سبق لینے کو تیار نہیں ہیں۔

ہمارے سیاستدانوں کی عقل و فکر کو گھٹن لگ چکا ہے۔ وہ کبھی کسی قومی مسئلے پر بھی متحدہ قوت کا مظاہرہ کرنے کو آمادہ نہیں۔ اتفاقات زمانہ سے جن لوگوں کو لیڈری کا مقام مل چکا ہے وہ اپنے تخت و عونت سے نیچے اترنے کو تیار نہیں۔ ہمارے ملک کی بے شمار مصیبتوں کا باعث یہی طبقہ ہے۔ اس طبقے کے ہاتھوں یہاں محلاتی سازشوں کا دور شروع ہوا جس نے کئی دفعہ ملک کو خطرناک حالات سے دوچار کیا ہے۔

یہ حالات کا ایک بے لاگ تجزیہ ہے۔ کم و بیش تمام اسلامی ممالک اپنی احوال سے دوچار ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی عظیم ترقی کے اس دور میں بڑے ملک چھوٹے ممالک کو فوجی طاقت سے کم فتح کرتے ہیں اور نظریاتی، معاشی اور علمی ذرائع و وسائل سے زیادہ تر فتوحات حاصل کرتے ہیں۔

یہ تصویر کا ایک رخ ہے جو بظاہر بھیاںک نظر آتا ہے۔ اب ہمیں دوسرا رخ بھی وسیع النظری سے — خوش فہمی سے نہیں! — دیکھنا ہے۔ گزشتہ تیس پتیس سال کے عرصے میں اکثر اسلامی ممالک غیروں کی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں گو ان ممالک میں اسلامیت و غیر اسلامیت میں شدید کشمکش برپا ہے مگر حالات مایوس کن نہیں ہیں۔ پچھلے چھٹھکوں ۱۱ چھٹھکروں نے مسلمانوں میں اتحاد کا شعور پیدا کیا ہے۔ اور اب وہ اپنی مصفوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ موقر عالم اسلامی اور ابطل عالم اسلامی جیسی عالمی اسلامی تحریکیں برسرِ کار ہیں۔ نگہبست و ادب امر کے خلاف تقریباً ہر مسلم ملک میں ایک بے چینی کی کیفیت موجود ہے۔ مسلم ممالک کے ثقافتی تجارتی سیاسی اور خالص دینی روابط مضبوط ہو رہے ہیں فلسطین اور افغانستان کے مسائل بین الاقوامی مسائل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں مسلم ممالک پہلے کی نسبت زیادہ

جذبہ خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو رہے ہیں۔ فرقہ کے خلاف اب ہر جگہ ایک جذبہ تنقید پیدا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ مسلم عوام دین کی طرف از سر نو متوجہ ہو رہے ہیں۔ اکثر مسلم ممالک میں انفرادی اور اجتماعی آوازیں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اٹھ رہی ہیں۔ اب مغربی تہمت اتنی شدت اور بے باکی کے ساتھ اسلام کے خلاف پروپیگنڈا نہیں کر سکتی جس طرح وہ تیس چالیس سال قبل کرتی رہی ہے۔ آخر کار بھی اب کافی حد تک نشگی ہو چکی ہے۔ دنیا میں اب اسے سامراجیت کا دوسرا بھیس قرار دیا جا رہا ہے جس نے عدل و مساوات کا نعرو لگا کر کرد ممالک کو جکڑنے کا وعدہ اختیار کر رکھا ہے۔

مسلم ممالک کے اندر سے اسلام کی طرف لوٹنے کی طاقتور آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ غیر اسلامی نظریات سے ایک عام بیزاری کا دور شروع ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی رفتار بھی نسبتاً تیز ہو رہی ہے۔ رضا کار جماعتیں جاپان، ہندوستان، امریکہ، جرمنی، فرانس، کینیڈا اور بعض دوسرے مغربی و مشرقی ممالک میں خاموشی سے تبلیغ اسلام کا کام کر رہی ہیں اور اس کے نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔

پاکستان میں اسلامی نظام کو عملاً نافذ کرنے کی طرف بعض ناموافق حالات کے باوجود مسلسل پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس کا اثر دوسرے مسلم ممالک پر بھی مثبت انداز میں پڑنا دکھائی دیتا ہے۔ اسلامی قانون اور حدود و تعزیرات کے خلاف اندرون ملک جو مسلسل پروپیگنڈا ہوتا رہا ہے اب وہ بند ہے۔ مغربی ممالک میں بھی اب غالباً دوسرے انداز میں سوچا جا رہا ہے۔

مسلم ممالک کی سربراہی کا نفرنس کے اجلاس وقفہ وقفہ سے ہوتے ہیں اور ان کا اثر بہت خوش گوار نظر آتا ہے۔ اب انجمن اقوام متحدہ میں مسلم ممالک کی آواز کو اہمیت حاصل ہے۔ دنیا کے دو دھڑوں کے عین وسط میں ایک تیز اور مضبوط منظم ہوتا نظر آتا ہے اور اس دھڑے کی آوازیں اب جان ہے۔ اگر مسلم ممالک کے سربراہ خلوص کے ساتھ اپنے فرائض کو پہچانیں تو مستقبل میں اسلام کے لئے کامیابی کے مواقع ہیں۔ وصال اللہ علی اللہ بعزیز۔



